بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ
مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ
وَمُهَیۡمِنًا عَلَیۡهِ فَاحۡكُمۡ بَیۡنَهُمۡ بِمَاۤ
اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ عَمَّا
جَآءَكَ مِنَ الۡحَقِّ ؕ

صدق اللہ العظیم

اور ہم نے تمہاری طرف کتاب، حق کے ساتھ نازل کی جو اُس کتاب کی تصدیق میں ہے جو اِس سے پیشتر کی ہے، اور اُسے اپنے میں سمو کر اسے اپنی حفاظت میں لئے ہوئے ہے۔ پس لوگوں کے درمیان تم اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے، اور جو حق تمہارے پاس آ چکا ہے اسے چھوڑ کر اُن کی خواہشات کی پیروی نہ کرنا۔

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: مائدہ: ۴۸)

فہرستِ مضامین

باب	صفحہ
آیتِ افتتاح	۱
مقدمہ	۷
تمہید	۹
اسلامی حکومت	۱۱
اسلامی ریاست	۱۵
اسلام میں حکومت کی شکل	۲۵
اسلام میں حکومت کی شکل ملوکیت نہیں ہے	۲۵
اسلام میں حکومت کی شکل جمہوری نہیں ہے	۲۶
اسلام میں حکومت کی شکل شہنشاہیت نہیں ہے	۲۷
اسلام میں حکومت کی شکل وفاقی نہیں ہے	۲۷
خلافت: اسلام کا نظامِ حکومت	۲۹
اصولِ حکومت	۳۵
سیادت شریعت کو حاصل ہے نہ کہ امت کو	۳۵
اقتدار امت کیلئے ہے	۳۶
ایک ہی خلیفہ کا تعین فرض ہے	۳۸
صرف خلیفہ کو احکامِ شرع تبنی کرنے کا اختیار ہوتا ہے	۳۹
ریاست کا ہیکل	۴۰
خلیفہ	۴۳
خلیفہ کیلئے شرائط	۴۴
شروطِ انعقاد	۴۴
ترجیحی شرائط	۴۷

انعقاد	۴۹
خلافت پر غاصب کا حکم	۵۰
وہ افراد جن سے خلافت کا انعقاد عمل میں آتا ہے	۵۰
خلیفہ کون مقرر کرتا ہے	۵۳
بیعت	۵۶
خلافت کی طلب	۵۹
خلیفہ کی تقرری کا طریقہ	۶۰
نامزد کرنا یا ولیعہد مقرر کرنا	۷۶
ولیعہد بنایا جانا	۷۷
خلیفہ کی میعاد	۷۹
مسلمانوں کو خلیفہ مقرر کرنے کیلئے دی گئی مدت	۸۰
خلافت کا ایک ہی ہونا	۸۱
خلیفہ کے اختیارات	۸۳
رعایا کے معاملات کے اہتمام کی کیفیت	۹۰
خلیفہ احکام شرع تبنی کرنے کا پابند ہے	۹۲
خلیفہ کی معزولی	۹۵
خلیفہ کو معزول کرنے کا اختیار امت کو نہیں ہوتا	۹۹
محکمہ مَظالم ہی خلیفہ کو برطرف کر سکتا ہے	۱۰۱
ریاستِ خلافت ایک بشری ریاست ہے نہ کہ روحانی ریاست	۱۰۳
اسلام میں قیادت فرد کی ہے نہ کہ اجتماعی	۱۱۲
معاونین خلیفہ	۱۱۵
معاون تفویض	۱۱۵
معاون تفویض کیلئے شرائط	۱۱۷
معاون تفویض کی تقرری کی شرائط	۱۱۸
معاون تفویض کے فرائض	۱۱۹

معاون تنفیذ ۱۲۲
امیر جہاد ۱۲۵
دفتر امورِ خارجہ ۱۲۶
دفترِ حرب ۱۲۷
محکمۂ امن داخلی ۱۲۸
محکمۂ صنعت ۱۳۰
فوج ۱۳۳
فوج کی اقسام ۱۳۴
فوج کے پرچم اور نشان ۱۳۸
خلیفہ ہی فوج کا قائد اعلیٰ ہے ۱۴۱
فوج کی تربیت عسکری اور اسلامی ہوتی ہے ۱۴۳
ریاستِ اسلامی دائمی طور پر جہاد کیلئے مستعد رہتی ہے ۱۴۵
والی ۱۵۱
والیوں کا تعین اور برطرفی ۱۵۲
والیوں کے اختیارات ۱۵۵
والیوں کے کام کی خبر گیری کرنا خلیفہ کی ذمہ داری ہے ۱۵۸
القضاء ۱۶۱
قضاء کی اقسام ۱۶۴
قاضیوں کیلئے شرائط ۱۶۶
قاضیوں کی تقرری ۱۶۶
عدالتوں کی تشکیل ۱۶۷
محتسب (قاضیٔ حسبہ) ۱۷۳
قاضیٔ حسبہ کے اختیارات ۱۷۳
قاضیٔ مظالم ۱۷۵
قاضیٔ مظالم کا تقرر اور معزولی ۱۷۶

قاضیٔ مظالم کے اختیارات ۱۷۷
انتظامی ادارے ۱۸۱
انتظامی ادارے اسلوب کے ذیل میں آتے ہیں، حاکم نہیں ہوتے ۱۸۱
معاملات کو انجام دینا حکومت کے کام کا حصہ ہے ۱۸۳
انتظامیہ کی تفصیلات ۱۸۳
انتظامی معاملات کی پالیسی ۱۸۵
ریاست کے انتظامیہ میں تقرری کے مستحق کون ہیں ۱۸۶
ریاست کے ملازمین تنخواہ دار ہوتے ہیں ۱۸۷
مجلس امت (شوریٰ) ۱۸۸
شوریٰ کا حق ۱۸۸
شوریٰ کا حکم ۱۹۰
مجلس امت کے ارکان کا انتخاب ۱۹۴
مجلس امت کی رکنیت کی میعاد ۱۹۵
مجلس امت کی رکنیت ۱۹۵
مجلس امت کے اختیارات ۱۹۸
اظہارِ رائے اور گفتار کا حق ۲۰۷
اسلام کی تنفیذ بیکوقت ہوگی، اس میں تدرّج حرام ہے ۲۱۰
اسلام میں جبری حکومت حرام ہے ۲۱۴
اسلام میں مسلمانوں کی ایذاء رسانی اور اُن کی جاسوسی حرام ہے ۲۱۴
اسلام کے مطابق حکومت کرنے والے مسلم حاکم کی اطاعت فرض ہے ۲۲۰
معصیت میں اطاعت نہیں ۲۲۳
حکام کا محاسبہ مسلمانوں پر فرض ہے ۲۲۵
اگر حاکم کھلے ہوئے کفر کا مرتکب ہو تو اُس سے قتال واجب ہے ۲۲۹
سیاسی جماعتوں کی تشکیل فرضِ کفایہ ہے ۲۳۳
اسلام کے نفاذ کی ضمانت ۲۳۵

مُقدّمۃ

کتاب 'نظام الحکم فی الاِ سلام' کی پہلی اشاعت پچاس کی دہائی کی ابتداء میں ہوئی تھی' جبکہ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ مغربی تہذیب سے بہت زیادہ متاثر تھا۔اس مغربی تہذیب کے اثر کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ یہ طبقہ اسلام کو محض ایک روحانی مذہب کی نظر سے دیکھتا تھا جس میں موجودہ زمانے میں زندگی کے مسائل کو حل کرنے کا کوئی نظام نہیں' اور نہ ہی اس میں حکومتی نظام ہے۔اُنکی دانست میں ریاست کے نام پر اسلام میں صرف ایک روحانی اور مذہبی ڈھانچہ ہے۔

دوسری جانب جو لوگ اسلام کیلئے کام کر رہے تھے' وہ بھی اسلام کی دعوت عام مفہوم میں دیتے جن کی کوئی قطعی اور متعین شکل نہیں تھی۔یہ طبقہ بھی اسلام کو زندگی' معاشرے' اور حکومت کیلئے ایک کامل نظام کی شکل میں پیش نہیں کر پایا۔اسلام کی یہ دعوت بہت ہی عام معنوں میں تھی' اور اُن کے ذہنوں میں اسلام کے نظام کا کوئی واضح اور غیر مبہم تصور نہیں تھا اور نا ہی اسلامی طرزِ حکومت کی واپسی کا کوئی معین خاکہ ذہنوں میں تھا۔اُس دعوتِ اسلامی میں سرے سے یہ خیال اور تصور مفقود تھا کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کی بالادستی کیلئے ایک ریاستِ خلافت ناگزیر ہے۔یہی وجہ تھی کہ اُن کے لائحہ عمل میں خلافت کے قیام اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق حکومت دونوں کا کوئی حصہ نہیں تھا۔

ایسے وقت میں (علمائے اسلام کی) ایک جماعت نے امت کے موجودہ حالات کی تحقیق و مطالعہ کیا' اور یہ بھی کہ یہ امت اس حالت پر کیسے پہنچی۔اس مطالعے میں امت کی تاریخ' طاقت' اقتدار اور ریاست زیرِ غور تھے' وہ ریاست جس کی اپنی اہمیت تھی' وہ ریاست جو اسلامی عقیدے اور اس سے ماخوذ احکام شرع پر مبنی تھی' جنہیں وہ نافذ کرتی تھی اور سارے عالم میں اُن کی دعوت پہنچاتی تھی۔اس جماعتِ علماء نے پھر دینِ اسلام کے اصل ماخذ' یعنی قرآن اور سنت کا مطالعہ کیا جس کے نتیجے میں یہ بات واضح ہوئی کہ اسلام ایک جامع اور کامل نظام ہے جو زندگی کے ہر مسئلے کو حل کرتا ہے۔اس مطالعے کے نتیجے میں چند کتب کی تالیف ہوئی جو اس ان تمام مطالعوں کو ایک مجموعی شکل میں بنا کسی غیر ضروری تفصیل کے واضح کرتی ہیں۔چنانچہ اس سلسلے میں کتاب نظام الاِسلام' نظام الحکم' نظام الاِقتصادي اور نظام الاِجتماعی کی تالیف عمل میں آئی جو اپنے اپنے موضوعات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ان کتابوں میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ مسلمان اسلام کو ایک عملی مبداء کی حیثیت سے ادراک کر پائیں' ایسا نظام جو زندگی کے معاملات پر تطبیق کیلئے موزوں ہے' اسلام کے طریقوں کو اپنائیں' اور اس عمل کیلئے اُٹھیں کہ اسے زندگی کی حقیقتوں پر ریاستِ خلافت کے ذریعے نافذ کریں' کیونکہ خلافت ہی ایک واحد ذریعہ ہے جس سے اسلام کے نظام ہائے زندگی کی تنفیذ ہو سکتی ہے۔

اگلے مرحلے میں اِن افکار اور نظاموں کو عام کیا گیا تا کہ مسلمان ان کو سمجھیں' اِن پر گفتگو ہو' اُن کے ماخذ اور مصادر سے رجوع کیا جائے جس سے یہ ذہنوں میں واضح شکل اختیار کر سکیں۔اب یہ کتب پہلے کی طرح محض ایک عمومی نوعیت کی نہیں

رہیں' کیونکہ اب عوام کو اسلام سے یہ امید بندھ گئی تھی کہ یہ امت کو اِس حالت سے نجات دلائے جس سے یہ امت دوچار ہے۔اب لوگ یہ ادراک کر چکے تھے کہ اسلام ایک کامل و جامع نظام ہے جو زندگی کے ہر شعبہ سے وابستہ مسائل کو حل کرتا ہے۔اب مسلمانوں کیلئے یہ سودمند ہو گیا کہ وہ اس ریاستِ خلافت کی زیادہ معلومات حاصل کریں جسے قائم کرنے کیلئے وہ کوشاں ہیں' اور اُس نظامِ اسلامی کی بھی جسے یہ ریاستِ خلافت اُن پر نافذ کریگی۔یہی امر ہمارے لئے بھی محرک بنا کہ اِن کتب کو زیادہ مفصّل کیا جائے اور اُن میں وہ تفصیلات شامل کی جائیں جو پہلی اشاعت میں نہیں تھیں۔

کتاب نظام الحکم کے تیسرے ایڈیشن کو وسیع کیا گیا تا کہ خلافت کی ریاست' اسکے محکمہ جات' اور اسکے سپردِ امور کی تفصیل کو شامل کیا جا سکے۔اس میں اسلامی طرزِ حکومت کو ایک منفرد اور متمیز نظام ثابت کیا گیا ہے' جو دنیا بھر میں موجود دیگر نظاموں سے مختلف اور جدا ہے۔اس میں اسلامی حکومت کے اصول اور خلافت کے مختلف شعبوں کو، نیز خلیفہ کے طریقۂ تقرر کو واضح کیا گیا ہے۔اس میں اس امر پر بھی بحث شامل ہے کہ ریاستِ خلافت ایک انسانی ریاست ہے نا کہ کوئی روحانی۔خلیفہ کے معاونین اور اُن کے اقتدار نیز شوریٰ اور اسکے اقتدار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس حقیقت کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے کہ اسلام کے احکام پورے کے پورے بیک وقت ہی نافذ ہونگے نہ کہ حصوں میں یا بتدریج جو کہ اصلاً حرام ہے۔ریاستِ خلافت کے ایک پولیس ریاست ہونے کی حرمت بھی واضح کی گئی ہے۔یہ بحثیں بھی شامل ہیں کہ کن امور میں خلیفہ کی اطاعت واجب ہے اور کن حالات میں اسکی اطاعت حرام ہو جاتی ہے' کب بزورِ تلوار اس سے مقابلہ کیا جائے اور یہ کہ ہر آن اسکا محاسبہ واجب ہے۔

تیسرے ایڈیشن میں احادیث کے حوالے شامل نہیں تھے اور نہ ہی اُن کی نص جیسی کتبِ احادیث میں وارد ہے۔اکتفاء اس بات پر کیا گیا تھا کہ یہ احادیث معتبر کتبِ فقہ سے تھیں۔لیکن کتبِ فقہ میں واقعہ یہ ہے کہ حدیث کا متن صرف اتنا ہی ہوتا ہے جو وہاں زیرِ بحث موضوع کیلئے بطورِ استدلال کافی ہو۔لہٰذا اب اس ایڈیشن میں ان امور کی رعایت رکھی گئی ہے۔اس ایڈیشن میں ہر حدیث کا حوالہ اور ماخذ شامل ہے۔اس بات کی بھی پابندی کی گئی ہے کہ حدیث کا متن کتبِ احادیث کے بعینہٖ ہو۔نیز ان احادیث کو حذف کر دیا گیا ہے جن کی صحت یا ان سے استدلال ثابت نہ ہو۔اسی طرح تمام بیانات اور دراسات کو اُن کے مصادر سے جانچ لیا گیا ہے اور جو بیان اس معیار پر ضعیف پایا گیا' وہ حذف کر دیا گیا ہے۔اس دوران ہوئے مباحثوں کی روشنی میں بعض مفاہیم اور احکام کی تصحیح کر دی گئی ہے اور اب یہ کتاب اپنی نئی شکل میں مسلمانوں کیلئے پیش ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کاوش کو خیر سے بھر دے اور مسلمانوں کو ریاستِ خلافت سے جلد نوازے تا کہ اس کتاب میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اسکی تطبیق اور نفاذ ہو سکے۔اور یہ سب اللہ تعالیٰ کیلئے کوئی مشکل کام نہیں۔

۱۵ محرم الحرام ۱۴۱۷ھ یکم جون ۱۹۹۶ء عبدالقدیم زلّوم

تمہید

اللہ تعالیٰ نے اسلام کو نازل فرمایا اور اسکی بنیاد عقیدۂ توحید پر رکھی، یعنی لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الہ نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

اسلام ایک کامل اور جامع پیغام ہے جو تمام بنی نوع انسان کیلئے عام ہے، اسلام انسانی زندگی کے تمام امور کو منظّم کرتا ہے اور اسکا تعلق اس سے قبل اور بعد والی زندگیوں سے جوڑتا ہے۔ یہ انسانی زندگی میں آنے والے ہر مسئلے کا حل پیش کرتا ہے، انسان کا اپنے خالق سے، خود اپنے آپ سے اور تمام انسانوں سے، تعلق کو منظّم کرتا ہے، خواہ وہ کسی جگہ اور زمانے میں ہو۔

اسلام نے اللہ تعالیٰ کے، کائنات، انسان اور حیات سے بحیثیتِ مجموعی، تعلق کو پیش کیا ہے، جس میں معاملات تخلیق و تدبیر؛ موت و حیات؛ ہدایت و گمراہی؛ رزق و فتحیابی؛ اور اللہ تعالیٰ کی دیگر صفات، جیسے قادرِ مطلق ہونا، ہر شئے کے علم پر محیط ہونا وغیرہ شامل ہیں۔

اسی طرح اسلام نے انسان اور اسکی زندگی کے اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے تعلق کو واضح کیا ہے، کہ جس طرح عبادت صرف اللہ کیلئے خاص ہے، اسی طرح قانون سازی (تشریع) بھی صرف اسی کے لئے خاص ہے، کسی اور کو جس طرح اسکی عبادت میں شریک نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح صرف اسی کے اوامر و قوانین کی پابندی، اور اس کی نواہی سے اجتناب لازم ہے، اتباع صرف حضرت محمد ﷺ کا کیا جا سکتا ہے، انہی کی سنّت قابلِ اتباع ہے کسی اور بشر کی نہیں۔

اسلام کے اپنے معین افکار و تصورات ہیں، جن سے ایک متمیز تہذیب بنی ہے جس میں زندگی سے متعلق مفاہیم ہیں۔ یہ مجموعۂ افکار و مفاہیم ایک خاص نظریۂ زندگی میں ڈھلتے ہیں، یعنی حلال و حرام، اور زندگی کا ایک متعین اور طے شدہ نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں۔ ان تصورات سے ایک معاشرہ وجود میں آتا ہے جو اپنے افکار، احساسات، نظام اور اپنے افراد کی شخصیات کے لحاظ سے متمیز ہے۔

اس پیغام میں وہ قانون سازی ہے جو ریاست اور معاشرے کے تعلق کو منظّم کرتی ہے خواہ وہ امور حکومت ہوں، اقتصادی معاملات ہوں، معاشرتی یا تعلیمی مسائل ہوں، داخلی اور خارجی سیاست کے رابطے ہوں، یا ریاست کے اپنی رعایا سے رشتے ہوں اور چاہے دوسرے ممالک سے تعلقات، خواہ وہ حالتِ امن میں ہوں یا حالتِ جنگ میں، یا معاشرے کے ایک فرد سے دوسرے افراد کے تعلقات، یہ سب امور اسلام کی تشریع میں شامل ہیں۔

اس لحاظ سے اسلام ایک مکمل اور جامع نظام ہے جو انسان کی پوری زندگی پر محیط ہے اور مسلمان پر یہ فرض ہے کہ وہ اس نظام کی پابندی کریں، اسکی تطبیق کیلئے ریاست کی جو خاص اور متعین شکل یعنی ریاستِ خلافت ہے اس کے ذریعہ اس نظام کا نفاذ کریں۔

اسلامی حکومت

حکم، ملک اور سلطان ہم معنی کلمات ہیں، اور ان سے مراد وہ اقتدار ہے جو احکام کو نافذ کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ امارت کا وہ عمل ہے جو شریعت نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے۔ اس کے ذریعے مظالم کا تدارک اور تنازعات کا تسویہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے یہی مراد ہے:

﴿اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُولَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ﴾

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اُن کی جو تم میں صاحب امر ہیں۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: نساء:۵۹)

اور یہی مراد اللہ تعالیٰ کے اس قول کی ہے:

﴿وَلَوْ رَدُّوہُ إِلَی الرَّسُولِ وَ إِلَیٰٓ أُوْلِی الأَمْرِ مِنْہُمْ﴾

اگر وہ اسے رسول اور اپنے ذمے داروں تک پہنچاتے (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: نساء:۸۳)

واضح ہوا کہ یہاں اِن آیات میں حکومت سے مراد عوامی امور کی نگہداشت ہے۔

کیونکہ اسلام ایک ایسا مبداء ہے جو ریاست، معاشرے اور حیات سے متعلق ہے، اس لئے ریاست اور حکومت اس مبداء کے ناقابل تقسیم اجزاء ہیں۔ اسلام نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ ایک ریاست اور حکومت بنائیں اور اسلام کے احکام نافذ کریں۔ قرآن حکیم میں متعدد آیات ہیں جن میں مسلمانوں پر یہ لازم کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کے نازل کردہ احکام سے حکومت کریں:

﴿فَاحکم بینَہم بمآ انزل اللہُ وَلا تتبع اہواھم عما جاءَ کَ مِنَ الحَقِّ﴾

پس جو حق تمہارے پاس آ چکا ہے، اسے چھوڑ کر اُن کی خواہشات کی پیروی نا کرنا۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: مائدہ:۴۸)

﴿وَاَنِ احکُم بینھم بمآ انزل اللہُ وَلا تتبع اھواءَ ھم وَاحذرھم اَن یفتِنُوکَ عن بعضِ ما انزل اللہُ الیک﴾

اور یہ کہ تم اُن کے درمیان وہی فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے، اور اُن کی خواہشات کی پیروی نا کرنا، اور اُن سے بچتے رہو کہ مبادہ تمہیں فریب میں ڈال کر اس کے کسی حصے سے منحرف کر دیں جو خدا نے تمہاری طرف نازل کیا ہے۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: مائدہ:۴۹)

﴿وَ مَن لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ انزلَ اللہُ فاُولئکَ ھُم الکَافِرُون﴾

اور جو شخص اللہ تعالےٰ کے نازل کئے ہوئے کے موافق حکم نا کرے تو ایسے لوگ بالکل کافر ہیں۔

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: مائدہ:۴۴)

﴿وَ مَن لَمْ يَّحْكُمْ بِمَآ انزلَ اللهُ فأُولٰئكَ هُم الظَالِمُونَ﴾

اور جو شخص اللہ تعالےٰ کے نازل کئے ہوئے کے موافق حکم نا کرے تو ایسے لوگ بالکل ظالم ہیں۔

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: مائدہ:۴۵)

﴿وَ مَن لَمْ يَّحْكُمْ بِمَآ انزلَ اللهُ فأُولٰئكَ هُم الفَاسِقُونَ﴾

اور جو شخص اللہ تعالےٰ کے نازل کئے ہوئے کے موافق حکم نا کرے تو ایسے لوگ بالکل فاسق ہیں۔

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: مائدہ:۴۷)

﴿فَلاَ وَ رَبِّكَ لَا يُـؤمِـنُـونَ حَتّى يُـحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَينَهُم ثُمّ لَا يَجِدُوا فىٓ انفُسِهِم حَرَجاً مِمّا قَضَيتَ وَيُسَلِّمُوا تَسلِيماً﴾

پس تمہیں تمہارے ربّ کی قسم! یہ مومن نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اُن کے درمیان جو نزاع ہو، اُس میں یہ تم سے فیصلہ نہ کرائیں، پھر تم جو فیصلہ کر دو اس پر یہ اپنے دل میں کوئی تنگی بھی نہ پائیں، اور پوری طرح تسلیم کرلیں۔

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: نساء:۶۵)

﴿يَاايُّهَا الذِينَ آمَنُواأَطِيْعُواْ اللهَ وَ أَطِيعُواْ الرَّسُولَ وَ أُوْلِى الأَمْرِ مِنْكُمْ﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اُن کی جو تم میں صاحبِ امر ہیں۔

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: نساء:۵۹)

﴿وَاِذَا حَكَمتُم بَينَ النَّاسِ اَن تَحكُمُوا بالعَدلِ﴾

اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو فیصلہ انصاف کے ساتھ کرو۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: نساء:۵۸)

اِن آیات کے علاوہ اور کئی آیات حکومت بمعنی اقتدار کے قرآن حکیم میں ہیں۔ اسی طرح حکومت کے مخصوص شعبوں سے متعلق آحکام کی آیات ہیں جیسے: جنگی قوانین، سیاسی قوانین، فوجداری قوانین، معاشرتی قوانین، تجارت و لین دین کے معاملات کے قوانین وغیرہ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَاايُّها الذينَ آمَنوا قٰتِلُوا الذينَ يَلُونَكُم مِنَ الكُفَّارِ وَاليَجِدُوا فِيكُم غِلظة﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اُن کافروں سے لڑو جو تمہارے قریب ہیں، اور چاہئے کہ وہ تم میں سختی پائیں۔

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: توبہ:۱۲۳)

اور فرمایا:

﴿فَاَمَّا تَثقَفَنَّهُم فِى الحَربِ فَشَرِّد بِهِم مَّن خَلفَهُم لَعَلَّهُم يَذَّكَّرُونَ

﴿وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَومٍ خِيَانَةً فَانبِذ إِلَيهِم عَلٰى سَوَآءٍ﴾

پس اگر جنگ میں تم اُن پر قابو پاؤ، تو ان کے ساتھ ایسا پیش آؤ کہ اُن کے پیچھے والے بھی بھاگ کھڑے ہوں، تاکہ اُنہیں سبق حاصل ہو۔ اور اگر کسی قوم سے تمہیں خیانت کا اندیشہ ہو، تو تم بھی اُسی طرح ایسے لوگوں کے معاہدے کو اعلانیہ اُن کے آگے پھینک دو، یقیناً اللہ اُن کو پسند نہیں کرتا جو خیانت کرتے ہیں۔

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: انفال: ۵۷، ۵۸)

﴿وَإِنْ جَنَحُواْ لِلسَّلْمِ فاجنَحْ لَهَا وَتَوَكَّل عَلَى اللهِ﴾

اور اگر وہ صلح اور سلامتی کی طرف جھکیں، تو تم بھی اس کی طرف جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو بے شک وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے (ترجمہ معانیٔ ق قرآن کریم: انفال: ۶۱)

﴿يَاأَيُّهاالذِينَ آمَنُواْ أَوفُواْ بِالعُقُودِ﴾

اے لوگو جو ایمان لائے، معاہدوں کی پوری پابندی کرو۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: مائدہ: ۱)

﴿وَلَاتَأْكُلُواْأَمْوَالَكُمْ بَينَكُمْ بِالبَاطِلِ وَتُدْلُواْبِهَآ إِلَى الحُكَّام لِتَأْكُلُواْ فَرِيقًا مِنْ أَموَالِ النَّاسِ بِالإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾

اور اپنے مال آپس میں غلط طریقے سے نہ کھاؤ، اور نا اُنہیں حاکموں کے آگے لے جاؤ کہ حق مارتے ہوئے لوگوں کے کچھ مال حق تلفی کر کے جانتے بوجھتے کھا سکو۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: بقرہ: ۱۸۸)

﴿وَلَكُمْ فِي القِصَاصِ حَيَوةٌ يَأُولِي الأَلبٰبِ﴾

اے عقل وفہم والو، تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: بقرہ: ۱۷۹)

﴿وَالسَارِقُ وَالسَارِقَةُ فَاقْطَعُواْ أَيْدِيَهُمَا جَزَآء بِمَا كَسَبَا نَكَلاً مِنَ اللهِ﴾

اور چور مرد اور چور عورت جو بھی ہو، اُنکی کمائی کے بدلے میں اللہ کی طرف سے ایک عبرت ناک سزا کے طور پر اِن دونوں ہی کے ہاتھ کاٹو۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: مائدہ: ۳۸)

﴿فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَأَتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ﴾

پھر اگر وہ تمہاری خاطر دودھ پلائیں، تو تم اُنہیں اُن کے معاوضے دو۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: طلاق: ۶)

﴿لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّآ آتَاهُ اللهُ﴾

چاہئے کہ وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور جسے اسکا رزق نپا تُلا ہی ملا ہو، تو اسے چاہئے کہ اللہ نے اسے جو کچھ بھی دیا ہے اسی میں سے وہ خرچ کرے۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: طلاق: ۷)

مزید ارشاد ہے:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ﴾

تم اُن کے مال میں سے صدقہ لے کر اُن کو پاک کرو۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: توبہ: ۱۰۳)

اس طرح تشریعی امور کے مختلف شعبوں سے متعلق معاملات کیلئے جیسے، عسکری، فوجداری اور سیاسی شعبوں کی سینکڑوں آیات اور کثیر تعداد میں صحیح احادیث ملتی ہیں جو اسلئے نازل ہوئیں کہ اُن کے ذریعے حکومت کی جائے، انکی عمل پیرائی ہو اور اُن کا نفاذ کیا جائے۔ اِن آیات واحادیث سے ماخوذ احکام عملی طور پر آنحضرتؐ، خلفائے راشدین اور اُن کے بعد آنے والے مسلمان حاکموں کے زمانے میں نافذ رہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دین اسلام؛ حکومت، ریاست، معاشرے، تمام زندگی، امت اور اسکے افراد کیلئے ایک نظام ہے۔ اسی طرح اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ ریاست کو حکومت کرنے کا حق صرف اسی وقت تک ہے جب تک وہ اسلامی نظام نافذ کرے۔ فی الحقیقت اسلام کا وجود ہی اُس وقت تک ہے جب تک وہ ایک ایسی ریاست میں ہے جو اِسکے احکام کو جاری و نافذ کر رہی ہو۔ اس طرح اسلام ایک دین ہے؛ اور مبادی، حکومت اور ریاست اِسکے اجزاء ہیں۔ یہاں ریاست دراصل وہ واحد اور تنہا شرعی طریقہ ہے جسے اسلام نے اسلئے وضع کیا کہ اِسکے ذریعے اسلامی احکام کو معاشرے اور اسکے افراد پر جاری و نافذ کیا جائے۔ یعنی اسلام کا وجود ہی اس وقت تک ہے کہ اسکی اپنی ایک ریاست ہو جو اِسکے احکام کو ہر وقت اور ہر حال میں نافذ کر رہی ہو۔ مزید یہ کہ یہ ریاست ایک سیاسی اور انسانی ہیکل ہے نا کہ کوئی روحانی ہیئت اور نا اسکے سربراہ کی حیثیت از روئے قیاس کوئی معصوم یا پارسا صفت ہے۔

اسلام کا حکومتی نظام اس ریاست کی کیفیت، بنیاد، ارکان، اسکے محکمے اور اجزاء کی شکل طے کرتا ہے۔ اسی طرح وہ اس بنیاد کو بھی طے کرتا ہے جس پر اس کی تعمیر ہوئی ہے یعنی بنیادی افکار و مفاہیم اور وہ معیار و پیمانے جن سے یہ ریاست اپنے امور کو چلاتی ہے، اور وہ دستور و قانون جنہیں یہ نافذ کرتی ہے۔

یہ ایک متمیز اور یگانہ نظام ہے اور یہ ریاست اپنے آپ میں دوسری تمام ریاستوں سے مختلف ہے۔ دنیا کے کسی بھی دوسرے نظام سے یہ کلی طور پر جدا ہے، چاہے اُن بنیادوں کے لحاظ سے جن پر یہ کھڑا ہے، یا اپنے افکار، مفاہیم اور معیار کے اعتبار سے جن سے امور کا اہتمام کیا جاتا ہے، یا اپنی شکل کے حوالے سے اور یا اپنے منفرد دستور اور قانون کی بناء پر جنہیں یہ نظام نافذ کرتا ہے۔

ریاستِ اسلامی

اسلامی ریاست ایک خلافت ہے۔ یہ ایک سیاسی اور تنفیذی ہئیت ہے جس کا مقصد اسلامی احکام کو جاری کرنا اور ان کا نفاذ کرنا ہے اور اسلام کے پیغام کو سارے عالم میں دعوت اور جہاد کے ذریعے پہنچانا ہے۔ یہ واحد طریقہ ہے جو اسلام نے اپنے نظاموں اور احکام کو معاشرے اور زندگی میں جاری و نافذ کرنے کیلئے وضع کیا ہے۔ یہ ریاست ہی وہ رکن ہے جس سے اسلام میں زندگی کا وجود ہے۔ اس کے بغیر اسلام ایک دین اور مبداء نہ ہو کر محض روحانی رسومات کا ایک ہیکل اور اخلاقی اقدار کا پیکر بن کر رہ جائیگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس ریاست کی نوعیت وقتی نہیں بلکہ دائمی ہے۔

اسلامی ریاست کی بنیاد اسلامی عقیدے پر قائم ہے اور یہ کسی بھی حال میں جائز نہیں کہ ریاست کو عقیدے سے علیحدہ کیا جائے۔ جب حضورؐ نے مدینے تشریف لا کر ریاست قائم کی اور اقتدار سنبھالا تو پہلے دن سے ریاست کی بنیاد اسلامی عقیدے پر ہی رکھی۔ اس وقت تک تشریعی آیات نازل نہیں ہوئیں تھیں۔ آپ ﷺ نے کلمہ طیبہ کی شہادت یعنی لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کو مسلمانوں کی زندگی اور اُن کے آپسی رشتوں کی بنیاد بنایا، مظالم کے تدارک کرنے اور معاملات کے تنازعات کو رفع کرنے کی بنیاد بنایا، گویا کہ تمام زندگی کی اور حکومت و اقتدار کی بنیاد بنایا۔ پھر اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ جہاد کو، اسلام کی دعوت لوگوں تک پہنچانے کیلئے قانونی شکل دی اور مسلمانوں پر فرض قرار دیا۔ بخاری اور مسلم میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا:

((أمرت أن أقاتل الناس حتى يشهدوا أن لا إله إلا الله و أن محمداً رسول الله، و يقيموا الصلاة، و يؤتوا الزكٰوة، فإذا فعلو عصموا مني دماء هم و أموالهم إلا بحقها و حسابهم على الله۔))

مجھے حکم ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑوں جب تک کہ وہ اس بات کی شہادت نہ دے دیں کہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی الہ نہیں ہے اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، اگر وہ ایسا کریں تو ان کا خون اور اُن کا مال میرے لئے حرام ہوگا، سوائے اس کے کہ بحق ہو، اور اُن کا حساب اللہ پر ہوگا۔

پھر آپ ﷺ نے یہ فرض قرار دیا کہ اسلامی ریاست کے لئے ہمیشہ عقیدۂ اسلامی ہی اسکی بنیاد رہے اور مسلمان اس امر کے پابند رہیں اور اگر اس ریاست اور اسکے احکام کی بنیاد اسلامی عقیدہ نہ رہے یا کھلا کفر ہو تو وہ مقابلے کیلئے اپنی تلوار سے تیار رہیں۔ جب آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا ہم ظالم حاکموں کا تلوار سے مقابلہ نہ کریں؟ تو فرمایا:

﴿لا، ما أقَامُواْ فِيكُم ألصلاة﴾

نہیں! جب تک وہ تم میں نماز قائم کروائیں۔

آپ ﷺ نے اس بات کی بیعت لی کہ اولی الأمر (خلیفہ) سے اس وقت تک تنازعہ نہ کیا جائے جب تک کہ اُن میں کھلا ہوا کفر نہ دیکھ لو۔ بدکار اماموں کے بارے میں مسلم شریف میں عوف ابن مالکؓ کی روایت ہے:

((قيل يا رسول الله أفلا ننابذهم بالسيف؟ فقال:لا،ما أقاموا فيكم الصلاة.....))

آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا ہم اُن کا تلوار سے مقابلہ نہ کریں؟ فرمایا کہ نہیں جب تک کہ وہ تم میں نماز قائم کریں۔

اسی طرح بخاری شریف میں عبادہ ابن صامتؓ کی بیعت کی روایت ہے:

((وَأن لا ننازع الأمر اهله۔ قال: إلا أن تروا كفراً بواحاً عندكم من الله فيه برهان))

اور اولی الامر (خلیفہ) سے جدال نا کرو جب تک کہ تم (اُن کے عمل میں) کھلا ہوا کفر نا دیکھو جس کے بارے میں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے کوئی دلیل ہو۔

ایسی ہی ایک حدیث طبرانی نے بھی نقل کی ہے، جس کے آخر میں **كفراً بواحاً** کی جگہ **كفراً صريحاً** آیا ہے ،یعنی واضح کفر۔ یہ سب اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اسلامی ریاست کی بنیاد عقیدۂ اسلامی ہی ہے، جس کی بنیاد پر آپ ﷺ نے اقتدار قائم کیا اور اسکی بقاء ودوام کیلئے تلوار اُٹھانے اور اسکی دعوت کیلئے جہاد کا حکم دیا ہے۔

لہٰذا اسلامی ریاست کیلئے یہ جائز نہیں کہ اس کی کوئی فکر، کوئی مفہوم، کوئی حکم اور کوئی پیمانہ ومعیار عقیدۂ اسلامی کے علاوہ کہیں اور سے ماخوذ ہو۔ یہ کافی نہیں کہ عقیدہ ریاست کی بنیاد محض نام کی حد تک ہو، بلکہ یہ تو رائیگاں ہوگا، ضروری یہ ہے کہ ریاست کی یہ بنیاد اس سے متعلق ہر امر میں ہو چاہے وہ کوئی دقیق اور باریک نکتہ ہو یا واضح اور مبین امر۔ یہ جائز نہیں کہ اس ریاست کا زندگی سے متعلق کوئی مفہوم وتصور یا کوئی حکم اس عقیدے سے ہٹ کر ہو۔ نتیجتاً ریاست کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ مثلاً جمہوریت کے تصور کو اپنائے جو کہ فی الحقیقت اسلامی فکر کے مخالف ہے، اور اسی طرح وطنیت یا قومیت کے تصور کو اپنائے یا اہمیت دے، کیونکہ یہ بھی اسلامی عقیدے کے مخالف ہیں۔ بلکہ اسلامی عقیدے کا تصور اِن تصورات (جمہوریت اور قومیت یا وطنیت) کے خلاف ہے، اِن سے کراہت کرتا ہے، اِنہیں حرام قرار دیتا ہے، اور اِن کے خطرات سے آگاہ بھی کرتا ہے اور اسکے وجود کو ہی غلط قرار دیتا ہے۔ اسی طرح اسلامی ریاست کے ڈھانچے میں جمہوریت کی طرح وزارات نہیں ہوتیں اور نا ہی کسی قسم کی بادشاہت، شہنشاہی یا جمہوریت کا کوئی تصور اس میں شامل ہے کیونکہ یہ تصورات اسلامی عقیدے سے نہیں لئے گئے بلکہ یہ تو اسکے مخالف ہیں۔ ریاست کا محاسبہ خواہ وہ افراد کی طرف سے ہو، یا جماعتوں کی طرف سے، اسلامی عقیدے ہی کی بنیاد پر کیا جا سکتا ہے اور یہ قطعاً جائز نہیں کہ یہ محاسبہ کسی اور بنیاد پر ہو۔ نیز کسی جماعت یا حزب کا قیام بھی صرف اسی عقیدے کی بنیاد پر جائز ہوگا اسکے علاوہ کسی دوسرے عقیدے کی بنیاد پر جماعت سازی کی اجازت نہیں ہو سکتی، کیونکہ ریاست کی بنیاد ہی یہ عقیدہ ہے۔ اس حقیقت کی رو سے ریاست پر ایسے احکام کی بجا آوری واجب ہے اور یہی حکم رعایا اور حاکم دونوں پر لازم ہوگا۔

ریاست کیلئے اسلامی عقیدے کی بنیاد کو فرض و لازم قرار دینے سے یہ بات ملزوم ٹھہری کہ ریاست کا دستور و قوانین قرآن اور حضور اکرمؐ کی سنت پر ہی مبنی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے حاکم پر یہ فرض قرار دیا ہے کہ وہ حکومت اُنہیں احکام کے ذریعے کرے جو اللہ نے حضور اکرم ﷺ پر نازل کئے ہیں، اور جو اِن احکام کے علاوہ دوسرے قوانین سے حکومت کرے تو اسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے کافر قرار دیا ہے بشرطیکہ وہ اُن احکام پر ایمان بھی رکھتا ہو یا اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کو غیر عملی مانتا ہو۔ نیز اگر وہ اُن غیر اسلامی احکام جن کو وہ نافذ تو کرتا ہے، لیکن اُن احکام پر اس کا عقیدہ نہیں ہے تو بھی وہ گنہگار، فاسق اور ظالم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا حاکم و سلطان کو صرف اور صرف اللہ کے نازل کردہ احکام ہی سے حکومت کرنے کی دلیل قرآن اور سنت سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿فَلاَ وَ رَبِّكَ لَا يُؤمِنُونَ حَتّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَينَهُم ثُمّ لَا يَجِدُوا فِيّ انفُسِهِم حَرَجاً مِمّا قَضَيتَ وَيُسَلِّمُوا تَسلِيماً﴾

پس تمہیں تمہارے ربّ کی قسم! یہ مومن نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اُن کے درمیان جو نزاع ہو، اُس میں یہ تم سے فیصلہ نہ کرائیں، پھر تم جو فیصلہ کر دو اس پر یہ اپنے دل میں کوئی تنگی بھی نہ پائیں، اور پوری طرح تسلیم کر لیں۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: سورۂ نساء آیت: ۶۵)

اور فرمایا:

﴿وَاَن احكُم بينهم بمآ انزل اللهُ﴾

اور یہ کہ تم اُن کے درمیان وہی فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے۔

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: مائدہ: ۴۹)

ریاستِ اسلامی کی تمام تشریع اور قانون سازی کو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے دائرے میں پابند کیا اور اس کی مخالفت سے خبردار کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ مَن لَمْ يَّحْكُمْ بِمَآ انزلَ اللهُ فأُولئكَ هُم الكَافِرُون﴾

اور جو شخص اللہ تعالےٰ کے نازل کئے ہوئے کے موافق حکم نا کرے تو ایسے لوگ بالکل کافر ہیں۔

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: مائدہ: ۴۴)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((كل عمل ليس عليه أمرنا فهو ردّ))

ہر وہ عمل جس پر ہمارا حکم نہ ہو وہ ردّ ہے۔

ان سب سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی کہ ریاست کی مکمل تشریع وقانون سازی اسکے دستور وقوانین، اسلامی شریعت وعقیدے کے دائرے میں ہی ہو سکتے ہیں، بالفاظِ دیگر جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر نازل فرمایا یعنی کتاب اللہ، سنت رسولؐ، اُن کی نسبت قیاس اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع۔

پھر شارع کا خطاب انسانی اعمال متعلق ہے اور یہ خطاب انسان کیلئے واجب ٹھہراتا ہے کہ اس کا ہر عمل اس کے دائرے میں ہو، یعنی انسانی اعمال کو اللہ تعالیٰ کے احکام منظّم کرتے ہیں اور شریعتِ اسلامی تمام انسانی افعال وتعلقات کا احاطہ کرتی ہے، خواہ یہ اعمال وتعلق انسان کا اپنے خالق سے ہو، اپنے آپ سے ہو یا یہ افعال دوسرے انسانوں سے متعلق ہوں۔ چنانچہ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں کہ افراد اپنے تعلقات کو منظّم کرنے کیلئے خود قوانین وضع کریں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَآ ءَاتَىٰكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَىٰكُمْ عَنْهُ فَٱنتَهُوا۟﴾

رسول جو کچھ تمہیں دے اُسے لے لو؛ اور جس چیز سے وہ تمہیں روک دے، اُس سے رک جاؤ۔

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: حشر: ۷)

اور فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَّكُونَ لَهُمُ الخِيْرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾

نہ کسی مومن مرد کو یہ حق ہے، نہ کسی مومن عورت کو کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں، تو پھر اُنہیں اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی رہے۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: احزاب: ۳۶)

آپ ﷺ کا فرمان ہے:

((إن اللـه فـرض فـرائض فلا تِضِيعوها، وحدّ حدوداً فلا تعتدوها و نهى عن أشياء فلا تنتهكوها، و سكت عن أشياء رخصة ليس بنسيان فلا تبحثوا عنها۔))

بے شک اللہ تعالیٰ نے بعض فرائض عائد کئے ہیں، سو اُنہیں پورا کرو؛ بعض حدیں مقرر فرمائی ہیں، سو اُن سے تجاوز نہ کرو؛ بعض چیزوں سے منع فرمایا ہے، سو اُنہیں نا کرو؛ اور بعض چیزوں میں جان بوجھ کر خاموشی رکھی ہے تا کہ وہ مباح رہیں، سو اُن کی بحث میں نہ پڑو۔ (المستدرک، بیہقی)

مسلم شریف میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

((وَمَنْ أَحْدَثَ في أمرِنَاهٰذا ما ليس منهُ فهو رَدّ۔))

جو کوئی ہمارے امور میں ایسی بات داخل کرے جو اس میں نا ہو، تو وہ رد ہے۔

لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے احکام بنائے نا کہ کسی حاکم نے؛ اور یہ اللہ تعالیٰ کی ہی ذات ہے جو عوام اور حاکم دونوں کو اپنے اعمال اور تعلقات میں اِن احکام کا پابند کرتی ہے، اور انہیں چھوڑ کر کسی اور کی پابندی اور اتباع سے منع کرتی ہے۔

چنانچہ اسلامی حکومت میں انسان کیلئے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ اپنے معاملات اور تعلقات کو منظّم کرنے کیلئے قوانین و دستور از خود مرتب کرے۔ نا ہی اس میں اس کی گنجائش ہے کہ حاکم عوام کو کسی بشر کے بنائے ہوئے قانون کے اتباع کیلئے مجبور کرے۔

حضور ﷺ نے مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست قائم کی، اُن اساس و بنیاد کو قائم کیا جن پر یہ ریاست منحصر ہے، اسکے مختلف ارکان تیار کئے، کئی شعبے اور ادارے وضع کئے، فوج کو تیار کیا اور داخلی اور خارجی تعلقات وضع کئے۔ مدینے پہنچتے ہی وہاں حکومت کی، لوگوں کے معاملات کا اہتمام کیا، ان کے مسائل کی نگہداشت کی اور اسلامی معاشرے کی بناء رکھی۔ آپ ﷺ نے یہودیوں سے، پھر بنی ضمرۃ اور بنی مدلج سے معاہدے کئے، پھر قریش، ایلۃ، البحرباء اور اذرح سے معاہدے کئے۔ لوگوں کو یہ عہد دیا کہ حج بیت اللہ سے کسی کو روکا نہ جائیگا اور حرام مہینہ میں کسی کو خوف نہیں ہوگا۔ آپ ﷺ نے اپنے صحابہؓ کو جنگی مہمات پر روانہ کیا اور خود بھی خوں ریز غزوات میں شریک ہوئے۔ مثلاً حضرت حمزہ ابن عبدالمطلبؓ، حضرت عبیدہ بن حارثہؓ اور حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کو قریش سے معرکے کی مہم پر بھیجا، حضرت زید ابن حارثہؓ، حضرت جعفر ابن ابی طالبؓ اور حضرت عبداللہ ابن رواحہؓ کو رومی حکومت سے معرکہ کی مہم سونپی اور حضرت خالد ابن ولیدؓ کو الجندل کی ذمہ داری دی، اور خود متعدد غزوات میں قیادت فرمائی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے والی اور عامل مختلف علاقوں پر تعینات کئے؛ فتح مکہ کے بعد وہاں عتاب ابن اسیدؓ کو متعین کیا، اسلم باذان بن ساسان کو مسلمان ہونے کے بعد یمن کا والی مقرر کیا، حضرت معاذ ابن جبلؓ الخزرجی کو الجند کی ولایت کا ذمہ سونپا، خالد ابن سعید بن العاصؓ کو صنعاء کی ولایت پر مامور کیا، زیاد ابن لبید بن ثعلبہ الانصاریؓ حضرموت کے والی مقرر ہوئے، ابوموسیٰ الأشعریؓ زبید و عدن پر، اور عمرو بن العاصؓ عمان کے والی بنائے گئے۔ حضرت ابو دجانہؓ مدینے کے عامل متعین کئے گئے۔ آپ ﷺ جب کسی کو والی مقرر فرماتے تو اسے اپنی آنے والی ذمہ داریوں کے نباہنے کی صلاحیت پر جانچتے، اور جن پر اُنہیں ذمہ دار بنایا جارہا ہوتا، یہ والی اُن کے دلوں کو ایمانی نور سے پُر کرتے۔ آپ ﷺ ان والیوں سے دریافت فرماتے کہ وہ کس طرح حکومت کرینگے؟ چنانچہ بیہقی، مسندِ احمد اور ابوداود میں حضرت معاذؓ سے روایت ہے:

((أن رسول الله ﷺ لما بعث معاذاً إلى اليمن،قال له:كيف تقضي إذا عرض لك قضاء،قال:أقضي بكتاب الله،قال: فإن لم تجده في كتاب الله، قال:أقضي بسنة رسول الله،قال:فإن لم تجده في سنة رسول الله، قال:أجتهد برأيي،لا آلو،قال:فضرب بيده فى صدري و قال: الحمد لله الذي وفق رسول الله لما يرضي رسول الله۔))

جب اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت معاذؓ کو یمن کا والی بنا کر بھیجا تو اُن سے دریافت کیا: اگر تمہارے سامنے کوئی معاملہ آئے تو تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ حضرت معاذؓ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی کتاب سے، فرمایا کہ اگر اُس میں نہ ملا تو؟ معاذؓ نے کہا: اللہ کے رسولؐ کی سنت سے، پھر آپ ﷺ نے پوچھا کہ اگر اس میں بھی نہ ملا تو؟ حضرت معاذؓ نے جواب دیا کہ پھر میں خود اپنی رائے سے اجتہاد کرونگا اور اس میں کوئی کوشش نہ اُٹھا رکھوں گا۔ حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ اس پر آپ ﷺ نے اُنکے (حضرت معاذؓ کے) سینے پر اپنا دست مبارک رکھا اور فرمایا: الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی مدد کی اس بات پر جس سے اللہ کا رسول ﷺ خوش ہو۔

اسی طرح عمرو ابن سعدؓ کی عمرو بن عوفؓ سے روایت ہے کہ جب آپ ﷺ نے ابان بن سعید بن العاصؓ کو بحرین کا والی بنایا تو اُن سے فرمایا:

((استوص بعبد القيس خيراً و أكرم سراتهم۔))

عبد قیس کا خیال رکھنا اور اُن کے امیروں کا اکرام کرنا۔

آپ ﷺ اسلام لانے والوں میں بہتر شخص کو والی مقرر فرماتے اور اُنہیں حکم دیتے کہ وہ لوگوں کو جو اسلام میں آئیں، دین کی تلقین کریں اور اُن سے صدقات لیں۔ کئی موقعوں پر آپ ﷺ نے والیوں کو یہ اختیار دیا کہ وہ لوگوں پر ضرائب (Taxes) عائد کریں، خیر کی طرف راغب کریں اور قرآن سکھائیں، دین کی تعلیم دیں، لوگوں پر حق کے معاملات میں نرم رہیں اور جہاں ظلم ہو تو سختی اختیار کریں۔ والیوں کو آپ ﷺ حکم دیتے کہ لوگوں کو اس بات سے منع کریں کہ وہ لوگوں کے درمیان لڑائی جھگڑے کی شکل میں اپنے قبیلے اور خاندان کی بیجا طرفداری نا کریں، اُن کی دعائیں اور توقعات صرف اللہ تعالیٰ سے، بغیر کسی کی شرکت کے ہوں۔ آپ ﷺ نے والیوں کو یہ حکم دیا کہ وہ لوگوں سے اُن کے اموال کا پانچواں حصہ اور جو کچھ صدقات ہوں، وصول کریں۔ نیز یہ کہ جو کوئی یہودی یا عیسائی اپنی مرضی سے دینِ اسلام میں داخل ہو، تو اسکے فرائض اور حقوق بالکل ویسے ہی ہوں جیسے دوسرے مومنوں کے، اور جو کوئی اپنے دین پر قائم رہنا چاہے تو اس پر زبردستی نا کی جائے۔

بخاری اور مسلم شریف میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ:

((أن رسول الله ﷺ لما بعث معاذاً الى اليمن قال إنك تقدم على قوم أهل كتاب فليكن أول ما تدعوهم إليه عبادة الله عزّ و جلّ فإذا عرفوا الله فأخبرهم أن الله فرض عليهم خمس صلوات في يومهم و ليلتهم فإذا فعلوا فأخبرهم أن الله قد فرض عليهم زكاة تؤخذ من أغنيائهم فترد على فقرائهم فإذا أطاعوا فخذ منهم و توقَّ كرائم أموالهم۔))

جب آپ ﷺ نے حضرت معاذؓ کو یمن کا والی مقرر کیا تو فرمایا کہ تم اہلِ کتاب متعین کئے جا رہے ہو، سو سب سے پہلے اُنہیں اللہ ﷻ کی عبادت کیلئے بلاؤ، پھر اُنہیں بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض کیں ہیں، جب وہ یہ کر لیں تو اُنہیں بتاؤ کہ اللہ نے اُن پر زکوٰۃ فرض کی ہے کہ اُن کے امیروں سے وصول کی جائے اور اُن کے غرباء میں بانٹی جائے، اگر وہ مان لیں تو اُن سے (زکوٰۃ) لے لو اور اُن کے مال کے بہتر حصہ کو چھوڑ دو۔

بخاری اور مسلم شریف کی ایک دوسری روایت میں اِن الفاظ کا اضافہ ہے:

((و اتَّقِ دعوة المظلوم فإنه ليس بينها و بين الله حجاب۔))

اور خود کو مظلوم کی بددعا سے محفوظ رکھو کہ اسکی دعا اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے۔

بعض موقعوں پر آپ ﷺ خاص طور سے مالی معاملات کیلئے کسی کو بھیجا کرتے، مثلاً حضرت عبداللہ ابن رواحہؓ کو خیبر کے یہود کے پاس اُن کے پھلوں کے تخمینہ کیلئے ہر سال بھیجا کرتے۔ مؤطا امام مالک میں روایت ہے:

((أنه عليه السلام كان يبعث عبدالله بن رواحة فيخرص بينه و بينهم، ثم يقول: إن شئتم فلكم، و إن شئتم فلي، فكانوا يأخذونه))۔

رسول اللہ ﷺ حضرت عبداللہ ابن رواحہ کو بھیجا کرتے جو اُن کے مال کا تخمینہ لگاتے پھر کہتے:
اگر تم چاہو تو یہ تمہارا ہے اور اگر تم چاہو تو یہ میرا، تو وہ لوگ اسے لے لیا کرتے تھے۔

سلمان ابن یسار سے روایت ہے کہ اُن لوگوں (یہودِ خیبر) نے اپنی عورتوں کے زیورات اِکٹھے کئے اور کہا کہ یہ تمہارے لئے ہیں، تم ہمارے ساتھ رعایت کرو اور حساب میں درگزر کرو۔ حضرت عبداللہ ابن رواحہؓ نے جواب دیا: اے اہلِ یہود! اللہ کی مخلوق میں تم لوگوں سے مجھے سب سے زیادہ بغض ہے لیکن میں اسے تمہارے معاملے پر اثر انداز نہیں ہونے دونگا، اور یہ جو تم نے رشوت کی پیشکش کی ہے تو ہم یہ نہیں کھاتے۔ اُن لوگوں نے جواب دیا کہ تمہارے اس انصاف سے زمین و آسمان قائم ہیں۔ حضور ﷺ اپنے مقرر کئے ہوئے والیوں اور عاملوں کے احوال سے باخبر رہتے اور اِن کی جو خبریں آتیں اُنہیں بغور سنتے تھے۔ آپ ﷺ نے بحرین کے عامل العلاء ابن الحضرمیؓ کو برطرف کر دیا تھا کیونکہ اُن کے خلاف عبدقیس کے وفد کی شکایت آئی تھی۔ ابن سعدؒ محمد ابن عمرؓ سے، اور وہ عمرو بن عوف (بنی عامر ابن لؤی کے حلیف) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے لعلاء ابن الحضرمیؓ کو بحرین کا عامل مقرر کیا، پھر اُنہیں برخواست کر کے ابان بن سعید کو اُن کی جگہ بھیجا۔ محمد ابن عمر کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے العلاء بن الحضرمی کو لکھا کہ وہ عبدقیس کے بیس اشخاص کو لے کر آپ ﷺ کے پاس پہنچیں، العلاء عبدقیس کے بیس آدمیوں کو عبداللہ ابن عوف الأشج کی قیادت میں لے کر، اور بحرین پر المنذر ابن ساوی کو مقرر کر کے آپ ﷺ کے پاس

پہنچے، وفد نے حضور ﷺ سے العلاء کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے العلاء کو برطرف کر کے اُن کی جگہ ابان ابن سعید بن العاص کو بحرین کا عامل مقرر کیا اور اُن سے فرمایا:

((استوص بعبد القيس خيراً و أكرم سراتهم۔))

عبدقیس کا خیال رکھنا اور اُن کے امیروں کا اکرام کرنا۔

آپ ﷺ اپنے عاملوں سے مکمل حساب لیا کرتے تھے اور آمدنی و مصارف کی پوچھ تاچھ کرتے تھے۔ بخاری شریف اور مسلم شریف میں ابوحمید السعدیؓ سے روایت ہے:

((أن النبي ﷺ استعمل ابن اللُّتبيَّة على صدقات بني سليم فلما جاء و حاسبه قال هذا الذي لكم و هذه هدية أهديت لي،فقال رسول اللهؐ فهلّا جلستَ في بيت أبيك و بيت أمك حتى تأتيك هديتك إن كنت صادقاً،ثم قام رسول الله ﷺ فخطب الناس و حمد الله و أثنى عليه فقال:أما بعد فإني أستعمل رجلاً منكم على أمورٍ مما ولاني الله فيأتي أحدكم فيقول هذا لكم و هذه هدية أهديت لي فهلاً جلس في بيت أبيه و بيت أمه حتى تأتيه هديته إن كان صادقاً،فوالله لايأخذ أحدكم منها شيئاً بغير حق إلا جاء الله يحمله يوم القيامة،ألا فلأعرفنّ ما جاء الله رجلٌ ببعير له رغاء أو ببقرة لها خوار أو شاةٍ تيعر، ثم رفع يده حتى رأيت بياض إبطيه ألا هل بلغت۔))

آپ ﷺ نے بنی سلیم کے صدقات پر ابن اللتبیہ کو مامور فرمایا، جب وہ حضور ﷺ کے پاس آئے اور اُن سے حساب لیا گیا تو کہا کہ یہ آپ ﷺ کیلئے ہے اور یہ (حصہ) مجھے بطورِ ہدیہ ملا ہے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو اپنے باپ اور اپنی ماں کے گھر بیٹھتے تا کہ تمہیں ہدیہ ملتا، پھر آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کی اور لوگوں سے مخاطب ہوئے، فرمایا: میں نے تم لوگوں میں سے ایک شخص کو ایک کام سونپا جو مجھے اللہ نے سونپا تھا، تو وہ شخص آ کر کہتا ہے کہ یہ آپ ﷺ کیلئے ہے اور یہ میرے لئے ہدیہ ہے۔ تو وہ اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھے حتی کہ اسے اسکے ہدیے ملیں اگر وہ سچا ہے۔ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی کہ تم میں سے کوئی بغیر حق کے کچھ نالیگا (اگر ایسا کیا تو) سوائے اس کے کہ قیامت کے دن وہ اُسے اُٹھائے ہوئے ہوگا۔ مجھے وہ شخص اپنے لائے ہوئے اونٹ کی آواز سے، اپنی لائی ہوئی گائے کے رمبھانے سے اور اپنی لائی ہوئی بکری کے ممیانے سے پہچانا جائیگا۔ پھر آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ اتنا اوپر اُٹھایا کہ میں نے آپ ﷺ کے بغل کی سفیدی دیکھ لی، پھر فرمایا: کیا میں نے (پیغام) پہنچا نہ دیا؟

ابوداود میں بریدہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَن أسْتَعْمَلْنَاهُ عَلَى عَمَلٍ فَرَزَقْنَاهُ رِزْقاً فَمَا أخَذَ بَعْدَ ذلِكَ فَهُو غُلُوْل۔))

جس کسی کو ہم نے کسی کام پر رکھا اور اسے کچھ اجرت دی، پھر اس نے اس کے بعد جو کچھ (اضافی) لیا وہ غبن ہے۔

اہل یمن نے جب حضرت معاذؓ کے بارے میں شکایت کی کہ وہ نماز لمبی پڑھاتے ہیں تو آپ ﷺ نے معاذؓ کو منع کر کے اس سے باز رکھا، بخاری و مسلم شریف میں ابی مسعودؓ الانصاری سے روایت ہے:

((قال رجلٌ يا رسول الله لا أكاد أدرك الصلاة مما يطول بنا فلان، فما رأيت النبى ﷺ في موعظة أشد غضباً من يومئذٍ فقال:يا ايها الناس إنكم منفرون،فمن صلى بالناس فليخفف فإن فيهم المريض و الضعيف و ذا الحاجة))

ایک شخص نے (آپ ﷺ سے) کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ میں جماعت سے نماز نہیں پڑھ پاتا کیونکہ فلاں بہت لمبی نماز پڑھاتے ہیں، (ابو مسعودؓ فرماتے ہیں کہ) میں نے آپ ﷺ کو اس سے پہلے کبھی کسی وعظ میں اتنے غصہ میں نہیں دیکھا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! تم لوگوں کو بدظن کرتے ہو، تم میں جو نماز پڑھائے، سو اسے چاہئے کہ وہ اختصار کرے کیونکہ جماعت میں مریض بھی ہوتے ہیں، ضعیف بھی ہوتے ہیں اور وہ بھی جسے کوئی حاجت ہو۔

مسلم شریف میں یہی حدیث حضرت جابرؓ سے بھی مروی ہے اور اس میں یہ لفظ ہے:

((.....يا معاذ أفتّان أنت.....))

اے معاذ تم فتّان ہو (لوگوں کیلئے مشکل کرتے ہو)۔

آپ ﷺ قاضیوں کو مقرر فرماتے تھے، حضرت علیؓ کو یمن کا قاضی مقرر کیا اور حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ و معاذ ابن جبلؓ کو یمن کے قاضی بنا کر بھیجا اور اُن سے پوچھا:

((بِمَا تحكمان، فقالا:إنْ لَّمْ نجد الحكم في الكتاب ولا في السنة،قسنا الأمر بالامر،فما كان أقرب إلى الحق عملنا به))

تم کس (چیز سے) فیصلے کرو گے، تو (اُن لوگوں نے) کہا کہ ہم کو اگر قرآن اور سنت میں حکم نہ ملا تو ہم ایک معاملے کو دوسرے معاملے پر قیاس کرینگے اور جو حق کے قریب تر ہوگا، اُس پر عمل (فیصلے) کرینگے۔

آپ ﷺ اس بات پر اُن سے متفق ہوئے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ ﷺ قاضیوں کا تقرر بھی فرماتے اور اُن سے اُن کے طریقہ عمل کی جانچ بھی فرماتے تھے۔

آپ ﷺ لوگوں کے امور کا بھی اہتمام فرماتے، آپ ﷺ نے اس کام کیلئے کاتب مقرر کئے تھے جو اِن امور کو تحریر کیا کرتے تھے، اور اپنے اپنے محکمات کے ذمہ دار تھے: جب کوئی عہد لکھے جاتے یا کوئی صلح لکھی جاتی تو اس کام کیلئے حضرت علیؓ

مقرر تھے، حضرت معیقیب ابن ابی فاطمہؓ کو مہر نبوت کی ذمہ داری دی گئی تھی اور وہؓ مال غنیمت کا بھی حساب رکھتے تھے، حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کے ذمہ علاقہ حجاز کے پھلوں کی پیداوار کا حساب تھا، حضرت زبیر بن العوامؓ صدقات کے مال کے محاسب تھے، مغیرہ ابن شعبہؓ کے ذمہ قرضہ اور دیگر لین دین کے معاملات کی تحریر تھی، شرحبیل بن حسنہؓ، بادشاہوں کو خطوط لکھتے تھے۔ اس طرح ہر ایک کام کیلئے، ایک شخص متعین کیا گیا تھا، چاہے ایسے کتنے ہی امور ہوتے آپ ﷺ نے ہر ایک کی ذمہ داری علیحدہ علیحدہ اشخاص کو سونپی۔ آپ ﷺ اپنے صحابہؓ سے بہت کثرت سے مشورے کیا کرتے تھے، جس کسی صحابی میں آپ ﷺ تدبر، بصیرت، پاتے یا جس کسی کو جانکار اور سوجھ بوجھ والا پاتے، ایمان اور اسلام کی دعوت میں افضل نظر آتا، اس سے ضرور کسی معاملہ میں مشورہ فرماتے۔ حضورؐ نے چودہ اشخاص کو خاص کر دیا تھا کہ جب کسی معاملہ میں مشورے کی ضرورت ہوتی تو آپ ﷺ انہیں سے رجوع فرماتے، یہ لوگ اپنے قبیلہ یا کنبہ کے امیر تھے جن میں سات مہاجرین اور سات انصار تھے۔ ان میں حضرت ابو بکر، حضرت حمزہ، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت جعفر، حضرت بلال، حضرت ابن مسعود، حضرت سلمان، حضرت عمار اور حضرت ابوذر رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھی آپ ﷺ دوسروں سے مشورے کرتے البتہ ان سے زیادہ مشورے کیا کرتے تھے۔ یہ حضراتؓ دراصل مجلس شوریٰ کے قائم مقام تھے۔ آپ ﷺ مسلمان اور غیر مسلموں سے اُن کی زمین، پھلوں کی پیداوار اور مویشیوں کا محصول وصول کرتے جیسے زکوٰۃ، عُشر، فے، خراج، اور جزیہ۔ مال غنیمت بیت المال کیلئے تھا، زکوٰۃ اُن آٹھ قسم کے لوگوں کیلئے مخصوص تھی جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، اور ان کے علاوہ کسی اور پر صرف نہ ہوتی اور نہ ہی یہ رقم ریاست کے اخراجات و مصارف کیلئے خرچ کی جاتی تھی۔ ریاست کے اخراجات و مصارف کیلئے فے، خراج، جزیہ اور مال غنیمت کی رقم استعمال کی جاتی تھی جو تمام عوامی امور کے اہتمام و نگہداشت کیلئے کافی تھی، اسی رقم سے فوج بھی تیار کرائی جاتی اور ریاست کو کبھی اِن امور کیلئے ان مَدوں کے ذریعہ آنے والے سے زیادہ پیسے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس طرح آپ ﷺ نے ریاست کا ہیکل (ڈھانچہ) خود تیار کیا اور اسکی اپنی زندگی ہی میں تکمیل بھی فرمائی۔ آپ ﷺ اس ریاست کے سربراہ تھے، آپ ﷺ نے معاونین، والی، قاضی، اور محکموں کے ذمہ دار مقرر فرمائے تھے، فوج کی تشکیل کی تھی، اور مشوروں کیلئے مجلس شوریٰ قائم کی تھی جس سے مشورے کیلئے رجوع کیا جا سکے۔ یہ ڈھانچہ یا ہیکل مع اپنی شکل اور اسکی ذمہ داریاں اور ان کی حدیں، تمام شریعت کی نص میں وارد ہیں۔ آپ ﷺ نے ہجرت کے بعد سے اپنی وفات تک بحیثیت ایک سربراہِ ریاست تمام افعال انجام دئے اور حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرؓ آپ ﷺ کے معاونین تھے۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ نے اجماع اور اتفاق کیا کہ ریاست کیلئے رئیس مقرر کیا جائے جو آپ ﷺ کا صرف بحیثیت سربراہِ ریاست خلیفہ ہو، نا کہ نبوت اور رسالت میں، کیونکہ آپ ﷺ پر نبوت اور رسالت کا خاتمہ ہو چکا۔ اس طرح اپنی حیاتِ طیبہ میں آپ ﷺ نے حکومت کی شکل اور ریاست کا ڈھانچہ دونوں کی تکمیل فرمائی جو معروف اور بالکل واضح ہیں۔

اسلام میں حکومت کی شکل

اسلام کا نظامِ حکومت ایک بے نظیر نظام ہے جو دنیا کے ہر نظام سے مختلف اور نمایاں ہے، چاہے یہ فرق اس کی بنیاد کے اعتبار سے ہو جس پر یہ قائم ہے، یا اپنے افکار، مفاہیم اور پیمانوں اور احکام کے لحاظ سے، جن سے معاملات و امور کا اہتمام کیا جاتا ہے، یا دستور و قوانین کے حوالے سے جنہیں یہ نافذ کرتا ہے، یا ریاست کی شکل کے اعتبار سے، یہ نظام تمام عالم کے کسی بھی دیگر نظام سے جداگانہ اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

اسلام میں حکومت کی شکل ملوکیت نہیں ہے۔

اسلام کا حکومتی نظام بادشاہت کا نہیں ہے، نا تو اسلام اس کی اجازت دیتا ہے اور نا ہی بادشاہت سے اسکی کوئی مشابہت ہی ہے۔

بادشاہت کا نظام موروثی نظام ہے جس میں باپ کے بعد اسکے بیٹے کو اقتدار ملتا ہے جس طرح اور چیزوں کا وہ وارث ہوتا ہے، جبکہ اسلام کے حکومتی نظام میں وراثت نہیں ہے۔ یہاں تو اختیار وہ سنبھالتا ہے جسے امت اپنی مرضی سے منتخب کرے۔

ملوکیت کے نظام میں بادشاہ کیلئے خاص حقوق اور مقام ہے جو رعایا میں کسی اور کو حاصل نہیں ہوتا، یہ مقام بادشاہ کو قانون سے بالاتر رکھتا ہے اور وہ کسی اور کو جوابدہ بھی نہیں ہوتا اور اسی کے نام سے ملک پہچانا جاتا ہے۔ یہ ملک اس کی ملکیت ہوتا ہے۔ یوروپی بادشاہت میں بادشاہ ہر چیز کا مالک ہوتا ہے لیکن وہ حکومت نہیں کرتا یا سعودی عرب، مراکش اور اردن کی طرح، کہ وہ مالک بھی ہوتا ہے اور طاقت و حکومت کا مصدر و منبع بھی نیز یہ کہ وہ حکومت بھی چلاتا ہے اور ملک و عوام پر اپنی خواہش کے مطابق تصرف رکھتا ہے۔

اس کے برخلاف اسلامی نظام خلیفہ کو کوئی امتیازی حیثیت یا مخصوص اختیارات نہیں دیتا، بلکہ خلیفہ کے حقوق امت کے ایک عام آدمی جیسے ہی ہوتے ہیں۔ خلیفہ سے امت کی پہچان نہیں ہوتی، نا وہ امت کا مالک ہوتا ہے، بلکہ وہ صرف حکومت کرتا ہے اور حکومت بھی وہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق نہیں کرتا نہیں کرتا، بلکہ وہ اقتدار میں امت کا نائب و نمائندہ ہوتا ہے جسے امت نے اپنی مرضی اور خوشی سے بیعت دی ہو کہ وہ اُن پر اللہ تعالیٰ کی شریعت نافذ کرے۔ خلیفہ اپنے ہر عمل، ہر تصرف اور ہر حکم جاری کرنے میں جو امت کی بہتری کیلئے ہو، حکم شرعی کا پابند ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ اسلامی نظام حکومت میں ولیعہدی کا تصور نہیں ہوتا، بلکہ اس کی ممانعت ہے اور اس کی بھی کہ حکومت بذریعۂ وراثت حاصل کی جائے۔ اس نظام میں اقتدار صرف ایک ہی طریقہ سے حاصل ہوتا ہے کہ امت اپنی رضا و خوشی سے خلیفہ یا امام منتخب کرے۔

اسلام میں حکومت کی شکل جمہوری نہیں ہے۔

اسی طرح اسلامی نظامِ حکومت جمہوری نظام بھی نہیں ہے کیونکہ جمہوریت کی بنیاد یہ ہے کہ اصل فرما روائی اور برتری (Sovereignty) عوام کو حاصل ہوتی ہے۔اس نظامِ جمہوری میں عوام ہی کے پاس حکومت اور قانون سازی کا حق ہوتا ہے۔عوام ہی حاکم کو اقتدار دیتے ہیں اور برطرف کرتے ہیں، نیز عوام ہی دستور اور قانون سازی کا حق رکھتے ہیں کہ وہ کوئی نیا دستور یا قانون بنائیں، پرانے میں ترمیم کریں یا اسکو تبدیل کردیں۔

برخلاف اس کے اسلام کا نظامِ حکومت عقیدۂ اسلام اور احکام اسلامی پر مبنی ہے جس میں سیادت اور برتری شریعت کو حاصل ہوتی ہے نہ کہ عوام کو۔اس میں قانون سازی کا اختیار نا تو امت کو حاصل ہے اور نا ہی خلیفہ کو، کیونکہ شارع تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات ہے، خلیفہ کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور سنتِ رسول ﷺ میں سے ریاست کے دستور و قانون کیلئے احکام کو اپنائے یعنی احکام کی تبنّی کرے۔اسی طرح امت کو بھی یہ اختیار نہیں کہ وہ خلیفہ کو برطرف یا معزول کرے، اسے تو شریعت کے طے شدہ طریقہ سے ہی معزول کیا جاسکتا ہے، امت صرف خلیفہ کو مقرر کرسکتی ہے کیونکہ اسلام نے امت کو یہ حق دیا ہے کہ وہ جسے پسند کرے اسے بیعت دے۔

جمہوری نظام کی ایک شکل صدارتی حکومت کی ہوتی ہے جس میں صدرِ مملکت ہی ریاست کا سربراہ بھی ہوتا ہے اور وزیراعظم بھی، اس کا کوئی اور مستقل وزیراعظم نہیں ہوتا بلکہ وزراء ہوتے ہیں، جیسے امریکہ۔جمہوریت کی دوسری شکل پارلیمانی نظام کی ہوتی ہے جس میں صدر کی حیثیت سربراہِ مملکت کی ہوتی ہے اور اس کا ایک وزیراعظم ہوتا ہے۔یہاں اقتدار وزراء کی کابینہ کے پاس ہوتا ہے، صدرِ مملکت کے پاس نہیں، جرمنی اس طرز کی مثال ہے۔

اسکے علاوہ جمہوری نظام کی دونوں طرزوں میں یعنی صدارتی اور پارلیمانی میں، صدر عوام اور اُن کے نمائندوں (یعنی پارلیمان) کو جوابدہ ہوتا ہے جنہیں یہ حق ہے کہ وہ صدر کو معزول کردیں، کیونکہ بہرحال سیادت (Sovereignty) عوام کو حاصل ہوتی ہے۔

برخلاف اسکے، اسلامی ریاست مومنین کی امارت ہوتی ہے جہاں خلیفہ امیر المومنین ہوتا ہے اور عوام اور اُن کے نمائندوں کے آگے جوابدہ ہوتا ہے۔البتہ عوام یا اُن کے نمائندے خلیفہ کو برطرف کرنے کا اختیار نہیں رکھتے۔خلیفہ کی معزولی اسی شکل میں ہوسکتی ہے جب وہ شریعت کی ایسی خلاف ورزی کرے جس سے اسکی معزولی واجب ہوجائے۔ایسے معاملے طے کرنا عدالتِ مظالم ہی کے دائرے میں آتا ہے۔

صدارتی اور پارلیمانی، دونوں قسم کی جمہوریت میں صدر کا تقرر ایک معینہ مدت کیلئے ہوتا ہے جسے بڑھایا نہیں جاسکتا، جبکہ خلافت میں خلیفہ کے تقرر کی میعاد نہیں ہوتی، بلکہ یہ اس وقت تک کیلئے ہے جب تک کہ وہ شریعت نافذ کرتا

رہے، احکام اسلام کی تطبیق کرتا رہے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور سنتِ رسولؐ سے ماخوذ ہیں، تو وہ خلیفہ بنا رہیگا، اس کی مدت خواہ کتنی ہی ہو۔ البتہ جب وہ شریعت سے انحراف کرے، اور احکام شرع نافذ کرنے میں کوتاہی کا مرتکب ہو تو اسکی میعاد ختم ہو جاتی ہے چاہے وہ ایک دن ہو یا ایک ماہ، اب اسکی معزولی واجب ہو جائیگی۔

مذکورہ بحث سے نظام خلافت اور نظام جمہوریت کے مابین نیز اسلامی خلیفہ اور جمہوری صدر کے درمیان فرق واضح ہو گیا کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسلامی نظام جمہوریت کا نظام ہے؛ یا جمہوریت اسلامی تصور ہے کیونکہ دونوں میں فرق نا صرف اُن کی بنیادوں میں ہے جن پر یہ قائم ہیں بلکہ اُن کی شکل اور تفصیل دونوں سراسر متضاد ہیں۔

حکومتِ اسلامی کی شکل شہنشاہیت کی نہیں ہے۔

نظامِ شہنشاہیت بھی، اسلامی نظامِ حکومت سے بالکل مختلف ہے۔ وہ علاقے جو اسلامی حکومت کے ماتحت ہوتے ہیں، گو کہ مختلف قوموں پر مشتمل ہوں لیکن ایک مرکز سے جڑے رہتے ہیں کیونکہ وہ شہنشاہیت کے نظام میں نہیں ہیں بلکہ اسکے بالکل مخالف نظام میں ہیں۔ نظام شہنشاہیت تمام قوموں کو برابری اور مساوات سے نہیں دیکھتا، بلکہ مرکز کو ہر معاملہ میں یعنی حکومت میں، اقتصاد میں اور مالیاتی امور میں بہر حال فوقیت حاصل ہوتی ہے۔

جبکہ اسلامی طریقہ حکومت میں تمام علاقوں اور قوموں کو برابری حاصل ہوتی ہے اور قوموں کے اختلاف کی بنیاد پر فرق کرنا یا امتیازی سلوک کرنے کی ممانعت ہے۔ اس نظام میں وہ غیر مسلم جو اس ریاست کے شہری ہوں، اُن کے حقوق اور فرائض بالکل مسلمانوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔ علاوہ ازایں ہر شہری، خواہ وہ کسی مذہب کا پیرو ہو، اسکے لئے ایسے حقوق ہیں جو کسی ایسے مسلمان کو بھی حاصل نہیں جو بیرون ملک میں رہتا ہو اور اس ریاست کا شہری نا ہو۔ اس مساوات سے اس ریاست کے علاقے شہنشاہیت کے تحت علاقوں سے مختلف ہوئے کیونکہ شہنشاہیت میں ہر علاقہ ایک نو آبادی کی حیثیت رکھتا ہے جسے مرکز کے استحصال کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور اسکی دولت مرکز ہڑپ کر لیتا ہے۔ اسلامی ریاست میں دو علاقے خواہ وہ باہم کتنے ہی دور ہوں اور قومیت یا نسل کے اعتبار سے مختلف ہوں، اُن سے معاملات میں مساوات ہوتی ہے۔ اسلامی ریاست میں ہر شہری، ریاست کا جزو لاینفک ہوتا ہے اور اسکے حقوق وہی ہوتے ہیں جو ریاست کے مرکزی علاقے کے شہریوں کے ہوں۔ اس ریاست کے احکام، نظام اور قانون سازی کا تمام علاقوں پر مساوی طور سے بلا امتیاز اطلاق ہوتا ہے۔

اسلامی حکومت کی شکل وفاقی (Federal) نہیں ہوتی۔

اسلامی نظام وفاقی (Federal) نظام نہیں ہوتا، جہاں کے مختلف علاقہ اپنی ذات میں خود مختار و آزاد ہوں، بلکہ پوری ریاست پر قانون یکساں نافذ ہوتا ہے۔ یہ ایک متحد نظام ہے جس میں مثلاً مغرب میں مراکش اسی حیثیت سے ہے جیسے

خراسان جو کہ مشرق میں ہے۔اسی طرح مثلاً علاقۂ الفیوم (مصر) ایسا ہی ہے جیسا کہ قاہرہ، جو کہ باالفرض پایہ تخت ہے۔تمام علاقوں یا صوبوں کی مالیات ایک ہی مانی جائیگی اور ایک ہی میزانیہ (Budget) تمام علاقوں کیلئے ہوگا جو وہاں کے عوام کی ضروریات کے اعتبار سے خرچ کیا جائیگا، قطع نظر اس بات سے کہ وہ کون سا علاقہ ہے۔نتیجتاً مثلاً اگر ایک علاقہ کی آمدنی اپنی ضروریات سے دوگنی ہے تو وہاں اس علاقہ کی ضرورت کے لحاظ سے خرچ ہوگا نا کہ اس کی آمدنی کے اعتبار سے؛ اسی طرح اگر ایک علاقہ کی آمدنی قلیل ہے اور اس سے اس علاقہ کی ضروریات کی تکمیل نہیں ہوتی تو اسکا بھی لحاظ رکھا جائیگا، یعنی وہاں میزانیۂ عام سے اس علاقہ کی ضروریات پوری کی جائینگی، خواہ وہاں کی آمدنی اُن ضروریات کی تکمیل کیلئے ناکافی ہو۔

اس طرح یہ نظام حکومت مکمل طور پر متحد (Unified) ہوتا ہے نا کہ اتحادی یا وفاقی اور ان امتیازات کے باعث اسلامی نظام حکومت، کسی بھی نظام حکومت سے جو آج دنیا میں رواں ہیں، اپنی بنیاد اور اپنے اصولوں کی بناء پر متمیز اور جداگانہ ہے، خواہ اپنی کسی شکل میں، اِن میں کوئی مشابہت ہی ہو۔علاوہ ازایں، اسلامی نظام، ایک مرکزی نظام ہے جہاں اقتدار مرکز میں ہوتا ہے، اور یہ مرکز اپنے اقتدار اور طاقت سے تمام علاقوں اور صوبوں کو باندھے رکھتا ہے چاہے وہ بڑے صوبے ہوں یا چھوٹے علاقے۔کسی صوبے یا علاقے کو اس ریاست سے علیحدہ ہونے کی اجازت نہیں ہوتی مبادا ریاست کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نا بکھرے۔خلیفہ ہی خود فوج کے سالاروں (Commanders) کو تعینات کرتا ہے، وہی صوبوں کیلئے والی مقرر کرتا ہے اور اقتصاد اور مالیاتی ذمہ داریوں کیلئے افسران کا تقرر بھی خلیفہ ہی کرتا ہے۔ہر علاقے کیلئے قاضیوں کا تقرر بھی خلیفہ ہی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔اسی طرح ہر اُس شخص کا تقرر بھی خلیفہ ہی کرتا ہے جس کے ذمہ احکام جاری کرنا ہو، غرضیکہ خلیفہ ریاست کے ہر علاقے پر حکومت کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

حاصلِ بحث یہ کہ خلافت ہی اسلام کا نظام حکومت ہے۔اس بات پر اجماع ہے اور تمام ائمہ، مجتہدین اور فقہا متفق ہیں کہ ریاستِ خلافت ایک ہی ہوسکتی ہے اور اس بات پر کہ بیعت ایک ہی خلیفہ کو دی جاسکتی ہے۔اور اگر ایک خلیفہ کے ہوتے دوسرے کو بیعت دی جاتی ہے، یا ایک بیعت کے ہوتے دوسری بیعت دی جاتی ہے تو اُس دوسرے سے لڑا جائے کہ وہ پہلے خلیفہ سے بیعت کرے یا قتل کر دیا جائے، کیونکہ شرعاً وہی بیعت صحیح بیعت ہے جو پہلے دی گئی۔

خلافت: اسلام کا نظامِ حکومت

خلافت تمام عالم کے مسلمانوں کی عام قیادت کا نام ہے، جسکے ذمہ اسلامی احکام کو نافذ کرنا اور اسلام کی دعوت کو سارے عالم میں پہنچانا ہے۔ اسی کو امامت بھی کہا گیا ہے، خلافت اور امامت دونوں ہم معنی ہیں، اسلامی ریاست کی شکل تو اسکے احکامِ شرعیہ سے ہے۔ احادیثِ صحیحہ میں یہ دونوں لفظ ایک ہی معنی میں وارد ہوئے ہیں، اور نصِ شرعی یعنی کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ میں یہ دونوں الفاظ ایک ہی مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ یہ لازم نہیں ہے کہ اِن میں سے کسی ایک لفظ کو ہی دوسرے کے مقابلہ میں صحیح قرار دیا جائے، التزام تو اِن کے مفہوم کا کیا جانا ہے۔

خلیفہ کا تقرر تمام عالم کے مسلمانوں پر فرض ہے، اور اسکو پورا کرنا، ہر دوسرے فرض ہی کی طرح لازمی ہے جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر عائد کئے ہیں۔ یہ کوئی پسند یا ناپسند کا معاملہ نہیں ہے اور نا ہی اس میں کسی سُستی کی گنجائش ہے، اس میں غفلت برتنا سخت گناہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے شدید عذاب کا موجب ہوگا۔

خلیفہ کے تقرر کے تمام مسلمانوں پر فرض ہونے کی دلیل اور ثبوت سنتِ رسولؐ اور صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے۔ جہاں تک سنتِ رسول ﷺ کا تعلق ہے تو نافعؒ کی روایت ہے کہ اُن سے عبداللہ ابنِ عمرؓ نے فرمایا کہ اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا:

((مَنْ خَلَعَ يَدَاً مِنْ طَاعَةٍ لَقِي اللهَ يَومَ القِيَامَة لا حُجَّةَ لَهُ، وَ مَنْ مَّاتَ وَ لَيْسَ فِي عُنُقِهٖ بَيْعَة' مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّة۔))

جو کوئی اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے دستبردار ہوا، تو وہ اللہ تعالیٰ سے قیامت کے دن یوں ملیگا کہ کوئی اس کیلئے کوئی حجت نہیں ہوگی اور جو کوئی اس حال میں مرا کہ اس کی گردن پر خلیفہ کی بیعت کا طوق نہ ہو سو وہ جاہلیت کی موت مرا۔ (بروایت مسلم شریف)

یعنی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں پر یہ فرض قرار دیا کہ ہر ایک کی گردن پر بیعت ہو، اور جو کوئی بغیر اپنے اوپر بیعت کے مرا، آپ ﷺ نے اسکی تعبیر جاہلیت سے کی۔ بیعت صرف خلیفہ کیلئے ہوسکتی ہے کسی اور کیلئے بیعت نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں پر یہ فرض قرار دیا کہ اُنکی گردن پر خلیفہ کی بیعت ہو، یہ فرض قرار نہیں دیا کہ ہر مسلم خلیفہ کی بیعت کرے۔ یعنی فرض یہ ہے کہ ہر مسلم کی گردن پر خلیفہ کی بیعت ہو، بالفاظِ دیگر، ایک خلیفہ کا وجود اس بات کی تکمیل کرتا ہے کہ ہر مسلمان کی گردن پر بیعت ہو، خواہ وہ بیعت براہِ راست بیعت ہو یا کسی نمائندے کے توسط سے۔ اس طرح یہ حدیث خلافت کے قیام کی فرضیت کی دلیل ٹھہری۔ یہ بیعت کے واجب ہونے کی دلیل نہیں ہے کیونکہ رسول اللہؐ نے ملامت اس بات پر کی ہے کہ کوئی شخص ایسی حالت میں مرے کہ اس کی گردن پر بیعت کا طوق نہ ہو، نا کہ اس بات پر کہ اُس نے بیعت نہیں دی ہو۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کو مسلم شریف نے بذریعہ الأعرجؒ نقل کیا ہے کہ نبیؐ نے فرمایا:

((إنما الإمام جنة يُقاتَلُ مِنْ وَرَائِهٖ وَ يُتَّقى به))

بے شک امام ایک ڈھال ہے جس کے پیچھے لڑا جاتا ہے اور جس کے ذریعے خود کی حفاظت کیجاتی ہے۔

مسلم شریف میں ابی حازمؒ کی روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں پانچ سال حضرت ابو ہریرہؓ کے ساتھ رہا اور اُن سے حضور ﷺ کے بارے میں سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((كانت بنو إسرائيل تسوسهم الأنبياء‘كلما هلك نبيٌ خلفه نبي‘ و إنه لا نبي بعدي‘و ستكون خلفاء فتكثر‘قالوا فما تأمرنا؟قال: فوا ببيعة الأول فالأول‘و أعطوهم حقهم‘فإن الله سائلهم عما استرعاهم۔))

بنی اسرائیل پر انبیاء علیہم السلام حکومت کیا کرتے تھے، جب ایک نبی کا انتقال ہوجاتا تو دوسرا اسکی جگہ لے لیتا تھا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، خلفاء ہونگے اور بہت سے ہونگے۔ پوچھا گیا کہ ہمارے لئے تب کیا حکم ہے؟ فرمایا: اُن سے اپنی بیعت پوری کرو اور اُن کو اُن کا حق دو، اللہ (خود) اُن سے اس بارے میں محاسبہ کریگا جو اُن کے ذمہ کیا تھا۔

مسلم شریف میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ كَرِهَ مِنْ أَمِيْرِهٖ شَيئاً فَلْيَصْبِرْ عَلَيه‘ فَإنه ليسَ أَحَدٌ مِن الناس خرج مِن السلطان شِبْراً فمات عليه إلا مات ميتة جاهلية))

جو کوئی اپنے امیر میں کوئی ایسی چیز پائے جو اسے ناگوار ہو، تو وہ اس پر صبر کرے، (کیونکہ) جو کوئی (اسلام کے) اقتدار سے بالشت بھر بھی باہر گیا اور (اس حالت میں) مرا، سو وہ جاہلیت کے دور کی موت مرا۔

((و مَن بايع إماماً فأعطاه صفقة يده،و ثمرة قلبه فليطعه إن استطاع ۔فإن جاء آخر ينازعه،فاضربوه عنق الآخر))

جو کوئی ایک امام کے ہاتھ پر، دل سے بیعت دے، پھر وہ اسکی اطاعت حتی الامکان کرے، اور اگر کوئی دوسرا آ کر خلیفہ سے تنازعہ کرے، تو اسکی گردن اُڑا دو۔

یہاں حکم یہ ہے کہ امام (یا خلیفہ) کو مقرر کر کے اسکی اطاعت کی جائے، اور خلیفہ سے تنازعہ کرنے والے سے لڑنے کا مطلب یہ حتمی امر ہے کہ خلافت کا قیام دائمی ہو اور ایک وقت میں ایک ہی خلیفہ ہو۔

دوسری دلیل اجماعِ صحابہؓ سے متعلق ہے کہ آپ ﷺ کے وصال کے بعد تمام صحابہ کرام ؓ اس ضرورت پر متفق ہوئے کہ حضور ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی خلافت قائم کی جائے، پھر اس بات پر اجماع ہوا کہ حضرت ابو بکر صدیق ؓ کا خلیفہ مقرر کیا جائے، پھر حضرت عمرؓ کے بعد اجماع ہوا کہ اُن کا خلیفہ مقرر کیا جائے، پھر حضرت عثمانؓ کے بعد بھی یہی اجماع ہوا۔ نیز

اس بات سے اِس اجماع میں اور تاکید آگئی کہ صحابہؓ نے آپ ﷺ کے وصال کے بعد تدفین میں تاخیر پر اتفاق کیا اور پہلے اس کام میں لگے کہ آپ ﷺ کا خلیفہ نصب کر دیا جائے، جب کہ معلوم ہے کہ موت کے بعد تدفین کرنا فرض ہے، یہاں تک کہ جن لوگوں پر تدفین کی ذمہ داری ہو اُن کیلئے تجہیز و تدفین چھوڑ کر کسی اور کام میں لگنا حرام ہے تاوقتیکہ تدفین انجام نا پا جائے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ صحابہؓ میں سے ایک جماعت نے اپنی اس ذمہ داری سے ہٹ کر خلیفہ کی تنصیب کے عمل کو ہاتھ میں لیا اور دوسرے صحابہؓ اس کام پر خاموش رہے یعنی مخالفت نہیں کی اور اس تاخیر میں دو راتوں کے انتظار میں شریک رہے حالانکہ وہ اس بات کی طاقت رکھتے تھے کہ اس سے انکار کر دیں اور خود آپ ﷺ کی تدفین کر دیں۔ اس طرح یہ خلیفہ کی تقرری کے کام کی، تدفین پر اولیت کا اجماع ٹھہرا، اور یہ ہو نہیں سکتا تھا اگر خلیفہ کی تقرری کا کام تدفین سے زیادہ ضروری نا ہوتا۔ مزید یہ کہ تمام صحابہؓ ہمیشہ اس بات پر متفق رہے کہ خلیفہ کا قائم کرنا فرض ہے۔ باوجود اپنے اس ممکنہ اختلاف کے کہ کس شخص کو خلیفہ بنایا جائے، صحابہؓ نے کبھی بھی خلیفہ کے قیام پر اختلاف نہیں کیا، نا آپ ﷺ کے وصال کے بعد، نا کسی اور خلیفہ کی وفات کے بعد۔ سو صحابہؓ کا یہ اجماع، خلیفہ کی تقرری کیلئے مضبوط اور صریح دلیل ہوئی۔

مزید یہ کہ اقامتِ دین اور دنیوی زندگی کے ہر شعبے میں شریعت کے احکام کا نفاذ، ایسے دلائل سے ثابت ہے جو قطعی الثبوت بھی ہیں اور قطعی الدلالہ بھی۔ ظاہر ہے کہ احکامِ شریعت کا نفاذ ایک حاکمِ با اقتدار ہی کر سکتا ہے۔ شریعت کا ایک قاعدہ ہے: **مَا لا يَتِمّ الواجب إلَّا به، فهو واجب**؛ یعنی جس چیز کے بغیر ایک واجب پورا نہیں ہوتا ہو، تو وہ چیز (یعنی جس کے بغیر واجب پورا نہیں ہوتا) بھی واجب ہو جاتی ہے۔ اس زاویہ سے بھی خلیفہ کا قیام لازم ٹھہرتا ہے۔

اس سب سے اوپر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ وہ مسلمانوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے (حکومت) کریں۔ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا یہ حکم، قطعی اور حتمی نوعیت کا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

﴿فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللهُ، وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَ هُمْ عَمَّا جَآءَ كَ مِنَ الحَقِّ﴾

پس لوگوں کے درمیان تم اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے اور جو حق تمہارے پاس آ چکا ہے، اسے چھوڑ کر اُن کی خواہشات کی پیروی نا کرنا۔ (ترجمہ معانیٔ قرآنِ کریم: مائدہ: ۴۸)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَ هُمْ وَ احْذَرْهُمْ أَنْ يَّفْتِنُوك عن بَعضِ مَا أَنْزَلَ اللهُ إِلَيْكَ﴾

اور یہ کہ تم ان کے درمیان وہی فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے، اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرنا، اور ان سے بچتے رہو

کہ مبادہ تمہیں فریب میں ڈال کر اس کے کسی حصہ سے منحرف کر دیں جو خدا نے تمہاری طرف نازل کیا ہے۔
(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم؛ سورۂ مائدہ: آیت:۴۸)

اللہ تعالیٰ کا اپنے رسول ﷺ سے خطاب امت کیلئے بھی ہے جب تک کہ اسکی صرف نبی ﷺ کیلئے ہونے کی تخصیص نہ ہو، یہاں ایسی کوئی تخصیص نہیں ہے چنانچہ یہ خطاب تمام امت کیلئے حکم ہوا۔ خلیفہ کے قیام سے مراد اللہ تعالیٰ کے حکم کو قائم کرنا اور اسلام کے اقتدار کو بنانے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اولی الامر کی اطاعت فرض کی ہے، یعنی خلیفہ کی اطاعت، اور یہ خود دلیل ہوئی اس بات کی کہ مسلمانوں کا کوئی حاکم ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَطِيعُواْ ٱللَّهَ وَ أَطِيعُواْ ٱلرَّسُولَ وَ أُوْلِى ٱلأَمْرِ مِنكُمْ﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اُن کی جو تم میں صاحب امر ہیں۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: نساء:۵۹)

اور اللہ تعالیٰ کسی ایسی چیز کی اطاعت کا حکم نہیں دیتا جس کا کوئی وجود نہ ہو۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حاکم کی تقرری فرض ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق ہی حکومت کرنا فرض ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا یہ حکم کہ اولی الامر کی اطاعت کرو، اس کے مترادف ہوا کہ اُس کو قائم کرو، اور یہ کہ ولی الامر کے وجود پر شریعت کے حکم کی تعمیل منحصر ہے اور اثر انداز ہوتی ہے؛ اسکے برخلاف اس حکم کا ترک کرنا شریعت کے حکم کے عدم نفاذ پر منتج ہوتا ہے۔ لہٰذا خلیفہ کا وجود لازم ہوا کیونکہ اسکے بغیر شرعی احکام کا نفاذ ممکن نہیں ہے۔

لہٰذا مسلمانوں پر اسکے قیام کی فرضیت کے دلائل صریح ہیں۔ خلیفہ اقتدار اور حکم سنبھالتا ہے اس مقصد کے تحت کہ شریعت کے احکام نافذ ہوں اور اُن کی بجا آوری ہونا کہ محض اقتدار بھر کیلئے۔ حضور ﷺ کا یہ فرمان ملاحظہ ہو:

((خيار أيمتكم الذين تحبونهم و يحبونكم،و تصلّون عليهم و يصلون عليكم،و شرار أيمتكم الذين تبغضونهم و يبغضونكم،و تلعنونهم و يلعنونكم،قيل يا رسول الله أفلا ننابذهم باسيف فقال:لا،ما أقاموا فيكم الصلاة))

تمہارے بہترین امام وہ ہیں جو تم سے محبت کریں اور تم اُن سے محبت کرو، تم اُن کیلئے دعا کرو وہ تمہارے لئے دعا کریں، اور تمہارے بدترین امام وہ ہیں جو تم سے نفرت کریں اور تم اُن سے نفرت کرو، اور وہ تمہارے لئے بددعا کریں اور تم اُن کیلئے، (آپ ﷺ سے) پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ کیا ہم اُن سے جنگ نا کریں؟ فرمایا: نہیں، جب تک کہ وہ تم میں صلاۃ قائم کرتے رہیں۔ (مسلم شریف؛ بروایت عوف ابن مالکؓ)

یہ حدیث اس بات کی صراحت کرتی ہے کہ امام اور خلیفہ اچھے اور برے دونوں طرح کے ہونگے اور یہ کہ اُس برے سے بھی نبرد آزما ہونے کی ممانعت فرمائی ہے تاوقتیکہ وہ صلاۃ قائم کرتے رہیں۔ یہاں صلاۃ قائم کرنا، دین قائم کرنے اور اسی کے حکم کے نفاذ کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو نافذ کرنے اور اسکی دعوت کو پھیلانے کیلئے، جہاں تک نصوص شرعیہ کا معاملہ ہے تو خلیفہ کی تقرری کی فرضیت بالائے شبہ ہے۔ مزید یہ کہ مسلمانوں پر اسکے قیام کا ذمہ اسلئے فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکمِ اسلام کی بالادستی اور مسلمانوں کی وحدت کا حکم دیا ہے۔ البتہ یہ فرض اجتماعی فرض یا فرض علی الکفایہ ہے یعنی اگر کچھ لوگ اس فرض کو انجام دے دیتے ہیں تو اس کی تکمیل ہوگئی، اور باقی لوگوں کے ذمہ سے یہ فرض ساقط ہوگیا ور اگر وہ کچھ لوگ اس کی انجام دہی میں کوشش کے باوجود کامیاب نہیں ہوتے ہیں تو یہ فرض ہر مسلمانوں پر اس وقت تک باقی رہیگا جب تک کہ مسلمانانِ عالم بغیر خلیفہ کے رہیں۔

خلیفہ کے قائم ہونے کے کام سے غافل ہوکر بیٹھ جانا بڑے گناہوں میں سے ہے، یہ اسلام کے فرائض میں سے ایک اہم فریضے سے فراموشی اور غفلت ہے، کیونکہ اسلام کے احکام کا نفاذ اور اسلام کا عملی زندگی کے ہر شعبہ میں زندہ اور کارفرما رہنا اسی بات پر منحصر ہے، لہٰذا تمام مسلمان، اگر اس حکم سے غفلت کرتے ہیں تو وہ بڑے گناہگار ہونگے۔ اگر مسلمان اس حکم سے غفلت میں اتفاق کر لیتے ہیں تو ہر ایک شخص اس گناہ کا انفرادی طور پر مرتکب ہوگا۔ اور اگر بعض مسلمان اس کام کیلئے کھڑے ہوجاتے ہیں اور باقی کھڑے نہیں ہوتے تو یہ گناہ اُن کے سر سے اُٹھ گیا جو اس کیلئے کھڑے ہوئے ہوں اور تمام باقی مسلمانوں پر یہ فرض ویسا ہی قائم رہیگا جب تک کہ خلیفہ کا تقرر نا ہوجائے۔ اس فرض کی اقامت کے کام میں شرکت سے اس کام کے ہونے میں تاخیر کا گناہ اور نہ کرنے کا گناہ ساقط اس وجہ سے ہوجائیگا کیونکہ ایک طرف تو خلیفہ کے نہ ہونے کی صورت سے ناپسندیدگی کا احساس اور دوسرے یہ کہ فرض کی ادائیگی میں شرکت کی گئی۔ رہے وہ لوگ جو اس فریضہ سے غفلت برتیں، سو ایک خلیفہ کے بعد تیسرے دن سے وہ اس وقت تک گناہگار ہونگے جب تک کہ نیا خلیفہ مقرر نا ہوجائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک چیز اُن پر فرض کی اور وہ اس فرض کو ادا کرنے کیلئے نہیں اُٹھے اور نا ہی اُس میں شرکت کی، اسلئے وہ گناہ کے مرتکب ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب اور ذلت کے اس دنیا میں اور آخرت میں سزاوار ٹھہرے۔ اُن کا اس عذاب کا مستحق ہونا اسلئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرض کئے ہوئے کام کیلئے، وہ بھی ایسا اہم فریضہ جس پر دوسرے تمام احکام اور فرائض کا دارومدار ہے، جس سے اسلام کا نام بلند ہوتا ہے اور اللہ کا کلمہ سربلند ہوتا ہے، نا تو وہ خود اُٹھے اور نا اُس کی انجام دہی میں شریک ہوئے۔ لہٰذا کسی مسلمان کیلئے کوئی عذر نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرض کئے ہوئے کام سے غافل ہوکر بیٹھ جائے اور خود کو سبکدوش کر لے۔ یہ کام ایک ایسے وقت میں خلافت کا قیام ہے جبکہ زمین پر خلیفہ نہیں ہے جو اللہ کی نازل کردہ حدود کو قائم کرے، اس کے محرمات کی پابندی کرے، اس کے احکام کو قائم کرے اور

مسلمانوں کو کلمۂ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے جھنڈے تلے متحد کرے، اسلام میں ایسے فریضہ سے فراموشی کا کوئی جواز نہیں ہے تاوقتیکہ یہ قائم نا ہو جائے۔

اصولِ حکومت

اسلام کا نظامِ حکومت چار بنیادی اصولوں پر مبنی ہے:

۱ سیادت (Sovereignty) شریعت کو حاصل ہے نا کہ امت کو۔

۲ اقتدار امت کیلئے ہے۔

۳ مسلمانوں پر ایک خلیفہ کا تعین کرنا فرض ہے۔

۴ صرف خلیفہ کو یہ اختیار ہے کہ وہ شرعی احکام کو اپنائے اور دستور و قوانین مرتب کرے۔

اسلام میں حکومت کے یہ چار قواعد ہیں جن کے بغیر حکومت نہیں کی جاسکتی اور اگر اِن میں سے ایک بھی چیز کم ہوئی تو وہ حکومت محض ایک عام حکومت ہوگی نا کہ اسلامی حکومت۔ یہ اصول شریعتِ اسلامی سے ماخوذ اور ادلۂ شرعیہ سے ثابت ہیں۔

۱ سیادت (Sovereignty) شریعت کو حاصل ہے۔

پہلا اصول کہ سیادت و بالادستی (Sovereignty) شریعت کو حاصل ہے، تو اسکی ایک حقیقت ہے، جو لفظ سیادت (Sovereignty) کی ہے۔ امر یہ ہے کہ یہ ایک مغربی اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں کہ وہ جو اپنے ارادے اور مرضی کا خود مالک ہو۔ اگر ایک شخص اپنے ارادے اور رضا کا مالک ہے اور بااختیار بھی ہے تو وہ اپنی ذات پر بالادست (Sovereign) کہلائیگا اور اگر اس کے ارادے اور مرضی پر کسی اور کا تصرف ہو تو وہ غلام ہوگا۔ یہی بات امت پر صادق آتی ہے، اگر امت اپنے ارادے اور رضا یعنی امت کے افراد کے ارادے اور مرضی خود اُنہیں کے ذریعے نامزد کئے ہوئے لوگ کنٹرول کر رہے ہوں، تو وہ امت اپنی خود کی مقتدرِ اعلیٰ (Sovereign) کہلائیگی۔ جبکہ اگر امت کی مرضی اور ارادے کا تصرف دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں ہو اور وہ امت کی مرضی کے خلاف تصرف کرتے ہوں تو یہ امت غلام کہلائیگی۔ اسی لئے جمہوری نظام کا یہ منشور ہے کہ "بالادستی عوام کیلئے ہے"، یعنی عوام خود اپنے ارادے اور رضا کے مالک ہیں، وہ جسے چاہتے ہیں اپنا نمائندہ بنا سکتے ہیں، اور اُنہیں اپنے اوپر فرمانروائی کا اختیار دے سکتے ہیں۔ سیادت اور بالادستی کے اسی معنی کو یہاں لیا گیا ہے، جس کے بارے میں پہلا اصول یہ ہے کہ بالادستی شریعت کو حاصل ہے نا کہ امت کو۔ ایک مسلمان اپنی مرضی اور ارادے کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کا پابند ہوتا ہے۔ اسی طرح امت اپنے ارادے اور رضا پر خود مختار نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کی پابند ہوتی ہے۔ دلیل اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ملتی ہے:

﴿فَلا وَ رَبِّكَ لاَ يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾

پس تمہیں تمہارے ربّ کی قسم! یہ مومن نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اُن کے درمیان جو نزاع ہو، اُس میں یہ تم سے

فیصلہ نہ کرائیں.....(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: النساء:۶۵)

﴿یَاأَیُّهَاالَّذِینَ ءَ مَنوا أَطِیعوا اللهَ وَ أَطِیعُوا الرَّسُولَ وَأُولی الأَمْرِ مِنکم فَإِنْ تَنَازَعْتُم فِی شَئیٍ فَرُدُّوهُ إِلی اللهِ وَ الرَّسولِ إِن کنتم تُؤمِنونَ بِاللهِ وَألیومِ الآخرِ﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اُن کی بھی جو تم میں صاحبِ امر ہیں۔ پھر اگر کسی چیز میں تم اختلاف کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو، اگر تم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: النساء:۵۹)

یہاں ''اللہ اور رسول کی طرف لوٹانے'' سے مراد حکم شرعی سے رجوع کرنا ہے۔ سو جو اللہ کے رسولؐ لے کر آئے، امت اور اس کا ہر فرد، اُن کے ارادے اور مرضی، سب اس کی تابع ہیں۔ اور امت اور فرد دونوں شریعت کے پابند ہیں لہٰذا بالادستی یا سیادت (Sovereignty) شریعت کی ہوئی۔ یہاں خلیفہ پر بیعت اس بات کی نہیں ہوتی کہ خلیفہ امت پر جو امت چاہے وہ نافذ و جاری کرے، جیسا کہ فی الواقع جمہوریت میں ہے؛ بلکہ خلیفہ پر بیعت قرآن و سنت کی ہوتی ہے کہ وہ امت پر احکام شریعت جاری و نافذ کرے نا کہ وہ جو امت کے افراد چاہیں، اور اگر وہ لوگ شریعت سے انحراف کریں تو خلیفہ اُن سے قتال کرے یہاں تک کہ وہ شریعت کی طرف لوٹ آئیں۔

۲.....اقتدار امت کیلئے ہے۔

اقتدار کا امت کیلئے ہونا شریعت کے اس اصول سے ماخوذ ہے کہ خلیفہ کی تقرری امت کا حق اور اختیار ہے اور خلیفہ کو اسی بیعت کے توسط سے اختیار حاصل ہوتا ہے۔ خلیفہ کے امت کی بیعت سے مقرر ہونے کیلئے متعدد احادیث ہیں۔ حضرت عبادہ ابن صامتؓ سے مسلم شریف میں روایت نقل کی ہے:

((بایعنا رسول اللہؐ علی السمع و الطاعة في العسر والیسر والمنشط والمکره))

ہم نے رسول اللہؐ پر اس بات کی بیعت کی کہ ہم مشکلات میں اور آسانیوں میں، اور خوشحالی میں اور سخت حالات میں سنیں گے اور اطاعت کرینگے۔

مسلم شریف ہی میں حضرت جریر ابن عبداللہؓ سے روایت ہے:

((بایعت رسول اللہؐ علی السمع و الطاعة و أن أنصح لکل مسلم))

میں نے رسول اللہؐ پر اس بات کی بیعت کی کہ میں سنونگا اور اطاعت کرونگا اور ہر مسلمان کو اچھی نصیحت کرونگا۔

حضرت ابی ہریرہؓ سے روایت ہے:

((ثلاثة لا یکلمهم الله یوم القیامة ولا یزکیهم ولهم عذاب ألیم: رجلٌ علی فضل ماء

بالطريق يمنع منه ابنِ السبيل؛و رجلٌ بايع اماماًلا يبايعه إلا لدنياه،إن أعطاه ما يريد وفىَ لهُ،وإلا لم يفِ لهُ؛ و رجلٌ يبايع رجلاً بسلعة بعد عصر فحلف باللهِ لقد أُعْطي بها كذا و كذا فصدقه فأخذها ولم يعط بها۔))

تین قسم کے لوگ ایسے ہونگے جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نا توبات کریگا اور نا اُن کی تعریف کریگا اور اُن کیلئے شدید عذاب ہوگا: ایک وہ شخص جس کے پاس ضرورت سے زیادہ پانی ہو اور وہ کسی راہگیر کو پانی سے روکے؛ دوسرا وہ شخص جو امام کو بیعت صرف اپنی دنیا (کے مفاد) کیلئے دے، کہ اگر اسے جو چاہئے وہ امام دے تو وہ (بیعت کو) پورا کرے اور اگر نا دے تو (بیعت) پوری نا کرے؛ تیسرا وہ شخص جو کسی (خریدار کو) عصر کے بعد کوئی چیز بیچنے کیلئے یہ کہے کہ میں نے یہ چیز اتنے میں خرید کی تھی، اور خریدار اس پر اعتبار کرلے، جبکہ اُس نے "اتنے" میں نہیں لی تھی۔ (بخاری و مسلم)

لہٰذا بیعت امت کی طرف سے خلیفہ کیلئے ہوتی ہے نا کہ خلیفہ کی طرف سے امت کیلئے، مسلمان ہی بیعت کرتے ہیں، یعنی خلیفہ کو اپنے اوپر حاکم مقرر کرتے ہیں یہی خلفاء راشدین نے کیا کہ مسلمانوں سے بیعت لی اور اسی بیعت کے توسط سے وہ خلیفہ بنے۔ خلیفہ کا اس بیعت کے توسط سے اقتدار حاصل کرنا، اطاعت کی احادیث اور خلیفہ کے ایک ہونے کی احادیث سے ثابت ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاصؓ سے مسلم شریف میں روایت نقل ہے:

((.....ومن بايع اماماً فأعطاه صفقة يدهٖ و ثمرة قلبهٖ فليطعه إن إستطاع، فإن جاء آخر ينازعه فاضربوه عنق الآخر۔))

جو کوئی ایک امام کے ہاتھ پر، دل سے بیعت دے، سو وہ اسکی اطاعت حسبِ استطاعت کرے، اور اگر کوئی دوسرا آکر خلیفہ سے تنازعہ کرے، تو اسکی گردن اُڑادو۔

نافعؒ سے روایت ہے:

((مَنْ خَلَعَ يَدَاً مِنْ طَاعَةٍ لَقِي اللهَ يَومَ القِيَامَة لا حُجَّةَ لَهُ وَ مَنْ مَّاتَ وَ لَيْسَ فِي عُنُقِهٖ بَيْعَة' مَاتَ مِيْتَةٌ جَاهِلِيَّة۔))

جو کوئی خلیفہ کی اطاعت سے دستبردار ہوا، تو وہ اللہ تعالیٰ سے قیامت کے دن یوں ملیگا کہ اس کیلئے کوئی حجت نہیں ہوگی اور جو کوئی اس حال میں مرا کہ اس کی گردن پر خلیفہ کی بیعت کا طوق نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔ (روایت مسلم)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے:

((مَنْ كَرِهُ مِنْ أَمِيْرِهٖ شَيئاً فَلْيَصْبِرْ عَلَيه' فَإنه ليسَ أَحَدٌ مِن الناس خرج مِن السلطان

شِبْراً فمات عليه إلا مات ميتة جاهلية))

جوکوئی اپنے امیر میں کوئی ایسی چیز پائے جو اسے ناگوار ہو، تو وہ اس پر صبر کرے، (کیونکہ) جوکوئی (اسلام کے) اقتدار سے بالشت بھر بھی باہر گیا اور (اس حالت میں) مرا، تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے:

((كانت بنو إسرائيل تسوسهم الأنبياء‘كلما هلك نبيٌ خلفه نبي‘ و إنه لا نبي بعدي‘و ستكون خلفاء فتكثر‘قالوا فما تأمرنا؟قال: فوا ببيعة الأول فالأول‘و أعطوهم حقهم‘فإن الله سائلهم عما استرعاهم۔))

بنی اسرائیل پر انبیاء علیہم السلام حکومت کیا کرتے تھے، جب ایک نبی کا انتقال ہوجاتا تو دوسرا اسکی جگہ لے لیتا تھا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، خلفاء ہونگے اور کثرت سے ہونگے۔ پوچھا گیا کہ ہمارے لئے تب کیا حکم ہے؟ فرمایا: اُن سے اپنی بیعت پوری کرو اور اُن کو اُن کا حق دو، اللہ (خود) اُن سے اس بارے میں محاسبہ کریگا جو اُن کے ذمے کیا تھا۔ (مسلم شریف)

یہ تمام احادیثِ شریفہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ خلیفہ اسی بیعت کے ذریعہ اقتدار حاصل کرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خلیفہ کی اطاعت کا حکم دیا ہے: **من بايع اماماً.....فليطعه** یعنی جوکوئی امام کو بیعت کرے.....سو وہ اس کی اطاعت (بھی) کرے۔ یعنی خلیفہ کو اقتدار بیعت سے ملتا ہے اور بیعت کرنے والے پر خلیفہ کی اطاعت لازم ٹھہرتی ہے کیونکہ اسکی گردن پر بیعت کا طوق ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقتدار امت کیلئے ہے۔ پھر آپ ﷺ نے لوگوں سے، مردوں اور عورتوں سے بیعت لی، نہ کہ نابالغ بچوں سے، جو کہ حکومت اور اقتدار کی بیعت تھی نہ کہ آپ ﷺ کی نبوت پر بیعت۔ لہٰذا حقیقت یہ ہوئی کہ مسلمان کتاب اللہ اور سنتِ رسول پر بیعت دیتا ہے اور خلیفہ اس بیعت کے ذریعے اقتدار حاصل کرتا ہے، چنانچہ ظاہر ہوا کہ اقتدار امت کا ہے وہ چاہے جسے سونپے۔

ایک ہی خلیفہ کا تعین فرض ہے:

تیسری بنیاد کہ ایک ہی خلیفہ کا متعین کیا جانا مسلمانوں پر فرض ہے، تو یہ اس حدیث شریف سے ثابت ہے جو نافعؒ سے مسلم شریف میں نقل ہے:

((مَنْ خَلَعَ يَداً مِنْ طَاعَةٍ لَقِي اللهَ يَومَ القِيَامَة لا حُجَّةَ لَهُ وَ مَنْ مَّاتَ وَ لَيْسَ فِي عُنُقِهٖ بَيْعَة‘ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّة۔))

جوکوئی خلیفہ کی اطاعت سے دستبردار ہوا، تو وہ اللہ تعالیٰ سے قیامت کے دن یوں ملے گا کہ اس کیلئے کوئی حجت نہیں

ہوگی اور جو کوئی اس حال میں مرا کہ اس کی گردن پر خلیفہ کی بیعت کا طوق نہ ہو سو وہ جاہلیت کی موت مرا۔ (روایت مسلم)

اس حدیث سے استدلال کرنے کا سبب یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے ہر مسلمان پر فرض کر دیا کہ اسکی گردن پر خلیفہ کی بیعت ہو، اور یہ فرض نہیں کیا کہ ہر مسلمان خلیفہ پر بیعت کرے، سو فرض یہ ہے کہ ہر مسلمان کی گردن پر بیعت ہو، یعنی خلیفہ کا وجود اس بات کیلئے کافی ہے کہ ہر مسلمان کی گردن پر بیعت ہے، خواہ اس نے یہ بیعت خود بنفس نفیس دی ہو یا نادی ہو۔ اب رہی بات کہ ایک ہی خلیفہ ہو، تو حضرت ابی سعید الخدریؓ نے آپ ﷺ سے روایت کیا ہے:

((وَ إذا بُويع لِخَلِيْفَتَيْنِ فَأقْتلوا الآخرَ مِنْهُمَا))

اگر دو خلیفاؤں پر بیعت ہو تو دوسرے کو قتل کر دو۔

یہ صریح اور قطعی ٹھہرا کہ ایک وقت میں دو خلیفاؤں کا ہونا حرام ہے۔

۴.....صرف خلیفہ کو یہ اختیار ہے کہ وہ شرعی احکام کو اپنائے اور دستور و قانون مرتب کرے۔

چوتھا قاعدہ کہ خلیفہ کو ہی یہ اختیار ہے کہ وہ دستور و قوانین کی تبنی کرے یا اُنہیں اپنائے، تو یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجماع سے ثابت ہے کہ صرف خلیفہ ہی احکام شرعیہ کی تبنی کر سکتا ہے اور اسی اجماع سے یہ مشہور شرعی قاعدے ماخوذ ہیں:

امر الإمام يرفع الخلاف

خلیفہ کا حکم نزاع و اختلاف رفع کرتا ہے۔

أمر الإمام نافذ

خلیفہ کا حکم نافذ ہونے کیلئے ہے۔

للسلطان أن يحدث من الأقضية بقدر ما يحدث من مشكلات

یہ حاکم کیلئے ہے کہ وہ جس قدر بھی معاملات ہوں، اُن کیلئے (نئے) قانون اپنائے۔

ان قواعد کی وضاحت کتاب کے آئندہ حصوں میں خلیفہ کے اختیارات اور حدود کے ضمن میں آئینگی۔

ریاست کا ہیکل

ریاست کے مندرجہ ذیل آٹھ ارکان ہیں:

۱-خلیفہ

۲-معاون تفویض (Delegated Assistants)

۳-معاون تنفیذ (Executive Assistants)

۴-امیر جہاد

۵-ولاۃ (والیان) (Governors)

۶-عدالتیں (Judiciary)

۷-انتظامی ادارے (Adminstration)

۸-مجلس امت (Consultative Council)

اِن ارکان کی دلیل حضور ﷺ کے عمل سے ملتی ہے کہ آپ ﷺ نے اسی شکل پر ریاست کا ڈھانچہ تیار کیا تھا۔ حضور ﷺ بذاتِ خود اس ریاست کے سربراہ تھے اور آپ ﷺ نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ وہ خلیفہ اور امام بنا کر ریاست کا امیر تعینات کریں۔ معاونوں کیلئے خود آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کو اپنا معاون بنایا تھا۔ حاتم اور ترمذی شریف میں ابی سعید الخذریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((وَزِيراي مِن السَماء جبريل و ميكائيل، ومن أهل الأرض أبو بكر و عمر))

آسمان پر میرے دو وزیر جبریل اور میکائیل ہیں اور زمین والوں میں (حضرت) ابوبکرؓ اور عمرؓ۔

یہاں وزیر سے مراد معاون ہیں کیونکہ یہی لغوی معنی ہیں۔ زمانۂ حال میں جو لفظ وزیر استعمال کیا جاتا ہے وہ ایک مغربی اصطلاح ہے جس سے مراد کسی معین نوعیت کے کام میں معاونت کے ہیں، یہ تصور اسلامی نظام حکومت کے خلاف ہے اور مسلمانوں کیلئے اجنبی ہے۔ حضور ﷺ نے جس معاون کو وزیر کے نام سے تعبیر کیا ہے وہ کسی ایک معین کام کیلئے نہیں بلکہ اسے خلیفہ عام مجاز دے کر ہر قسم کے کام کیلئے اسکی معاونت یا مدد لیتا ہے چنانچہ معاون کیلئے اسکے کام کی حد بندی کسی ایک دائرہ عمل میں محدود کر دینا صحیح نہیں ہے۔

حضور ﷺ نے مختلف علاقوں کیلئے والی مقرر فرمائے تھے؛ مکہ معظّمہ پر عتّاب بن اُسیدؓ کو فتح مکہ کے بعد متعین کیا تھا، باذان ابن ساسان کو اسلام قبول کرنے کے بعد یمن کا والی بنایا تھا اور اسکے علاوہ کئی اور والی تعینات فرمائے تھے۔ قاضیوں کی تقرری بھی حضور ﷺ نے لوگوں کے معاملات پر فیصلے کرنے کیلئے کی تھی؛ مثلاً حضرت علی ابن ابی طالبؓ، یمن کے قاضی بنائے

گئے تھے، اور معاذ ابن جبلؓ اور ابو موسیٰ الاشعریؓ بھی یمن کے قاضی اور امیر بنائے گئے تھے۔ طبرانی میں صحیح راویوں کے سلسلے سے مسروق کی روایت ہے کہ:

((كان أصحاب القضاء على عهد رسول اللهؐ ستة: عمرؓ، و عليؓ، و عبدالله ابنِ مسعودؓ، و أبي ابن كعبؓ، و زيد ابن ثابتؓ، و أبو موسى الأشعري))

یعنی حضورؐ کے عہد میں چھ افراد قضاء کے عہدوں پر تھے، یہ؛ عمرؓ علیؓ؛ عبداللہ ابن مسعودؓ؛ ابی ابن کعبؓ؛ زید ابن ثابتؓ اور ابو موسیٰ الاشعریؓ تھے۔

حضور ﷺ نے ریاست کے مختلف کاموں کیلئے کاتب مقرر فرمائے تھے جن کی حیثیت اپنے اپنے دائرے کے افسر (Director) کی تھی: مثلاً معیقیب ابن ابی فاطمہؓ مویشیوں کے اعداد و شمار پر مقرر تھے؛ حذیفہ بن الیمانؓ علاقہ حجاز کے پھلوں کی پیداوار پر محاسب تھے؛ اور اسی طرح دوسرے اشخاص کو دیگر کاموں اور اداروں کی نگرانی پر مامور کیا تھا۔ کسی کسی دائرے یا ذمہ داری پر ایک سے زیادہ اشخاص کو بھی متعین کیا گیا تھا۔

فوج کے انتظام پر امیر جہاد مامور ہوتا ہے اور آپ ﷺ بذاتِ خود براہِ راست اس ذمہ داری کو سنبھالتے تھے اور اس کے انتظام کیا کرتے تھے، اور بعض اوقات کسی خاص کام کیلئے قائد مقرر فرماتے تھے، جیسے: حضرت عبداللہ ابن جحشؓ کو قریش کی خبریں لانے کی ذمہ داری دے کر ایک فوجی ٹکڑی کے ساتھ بھیجا تھا؛ ابو سلمہ بن عبدالاسدؓ کو ایک سو پچاس آدمیوں کے دستہ پر لواء (Brigadier) مقرر کیا تھا، اس دستے میں مسلمانوں کے بہادر ترین لوگ شامل تھے مثلاً ابو عبیدہ بن الجراحؓ، سعد ابن ابی وقاصؓ اور اسید بن حضیرؓ۔

مجلس امت کا کام خلیفہ کو مشورے دینا اور اسکا محاسبہ کرنا ہے۔ حضور ﷺ کے عہد میں اس کی کوئی دائمی یا متعین شکل نہیں تھی، بلکہ آپ ﷺ بوقتِ ضرورت مسلمانوں سے مشورہ فرمایا کرتے تھے، جیسے غزوۂ اُحد کے وقت آپ ﷺ نے لوگوں کو جمع کیا اور مشورہ لیا؛ جس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر تہمت لگائی گئی تو آپ ﷺ نے اس موقع پر بھی لوگوں کو جمع کر کے مشورہ لیا، وغیرہ۔ اس طرح عام لوگوں سے مشورے کے علاوہ آپ ﷺ اپنے چند خاص صحابہؓ سے مستقل طور پر مشورے لیا کرتے تھے جیسے؛ حضرت حمزہؓ؛ حضرت ابو بکرؓ؛ حضرت جعفرؓ؛ حضرت عمرؓ؛ حضرت علیؓ؛ حضرت ابن مسعودؓ؛ حضرت سلمانؓ؛ حضرت عمارؓ؛ حضرت حذیفہؓ؛ حضرت ابو ذرؓ؛ حضرت المقدادؓ اور حضرت بلالؓ۔ کیونکہ آپ ﷺ اِن اشخاص سے مستقل طور پر مشورے کرتے تھے، اسلئے ان حضرات پر مشتمل مجلس کی حیثیت آپ ﷺ کی مجلس شوریٰ کے مترادف تھی۔

اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ریاست کا ایک مخصوص ہیکل یا ڈھانچہ (Structure) طے کر دیا تھا جس پر آپ ﷺ اپنے وفات تک قائم رہے۔ پھر حضورؐ کے بعد خلفاء کا دور آیا اور وہ بھی اسی پر قائم رہے، اور اسی طرز پر جو آپ ﷺ نے

بنائی تھی، حکومت کرتے رہے اور یہ تمام صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں ہوا، لہٰذا آپ ﷺ نے یہ طے فرمادیا کہ اسلامی ریاست کا ہیکل اسی شکل پر ہو۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضورؐ نے ایک شخص کو مالیات کا افسر بنا کر اسے مالیات کے امور پر مختاری دے دی تھی؛ اور اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ مالیات بذاتِ خود ایک آزاد ادارہ ہو، نہ کہ اس ہیکل کا ایک حصہ، تو واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ایک شخص معین کو مالیات کا افسر مقرر کر کے اسے مالیات کی ذمہ داری سونپی تھی، لیکن وہ کوئی علیحدہ یا خودمختار ہئیت نہیں تھی بلکہ اسی ریاست کے انتظامیہ کا ایک حصہ تھا۔

جن والیوں کو آپ ﷺ مقرر فرماتے تھے، اُن میں بعض کو عام ولایت دی جاتی تھی، یعنی وہ حکومت اور مالیات دونوں پر مقرر ہوتا تھا؛ اور بعض کو متعین ولایت دی جاتی تھی یعنی صرف حکومت اور یہاں مالیات کیلئے علیحدہ والی ہوتا تھا۔ مثلاً حضورؐ نے عمرو بن الحزمؓ کو یمن کا والیٔ عام مقرر کیا یعنی وہ حکومت اور مالیات دونوں عہدوں پر مقرر ہوئے، اور یہ تقرری اُنہیں تحریری شکل میں لکھ کر دی گئی۔ جبکہ فروہ بن مسیکؓ کو قبائلِ مراد، زبید اور مذحج کا والی مقرر کیا اور اُن کے ساتھ خالد بن سعید بن العاصؓ کو زکوٰۃ کے محصول پر تعینات کیا۔ جس والی کو صرف حکومت کی ولایت دی جاتی تھی وہ والیٔ صلاۃ کہلاتا تھا جو اسکی اصطلاح ہے جس سے مراد یہ کہ وہ شخص سوائے امورِ مالیات کے، عوام کے دیگر تمام امور جیسے انتظامی، عدالتی، سیاسی، جنگی اور عبادات پر مامور ہے۔ نیز جو والی مالیات کے امور پر مقرر ہوتا تھا اسکے لئے والیٔ خراج کی اصطلاح ہے؛ جس سے مراد یہ کہ وہ زکوٰۃ وصول کرنے، زمین کا خراج وصول کرنے جیسے امور پر متعین ہے۔ اِن کے علاوہ جو شخص والیٔ عام مقرر ہوتا تھا اس کیلئے والی الصلاۃ والخراج کی اصطلاح ہے۔ اس صراحت سے ظاہر ہوگیا کہ مالیات کوئی آزاد و خودمختار ہئیت نہیں بلکہ خلیفہ کے ماتحت ریاست کا ایک محکمہ ہے۔

اسی طرح امیر جہاد مختلف امور پر نگراں ہوتا ہے جیسے؛ جنگی معاملات، خارجی امور، داخلی امور، اور صنعت، اور آپ ﷺ اور پھر خلفاء راشدینؓ خود اِن چیزوں کا اہتمام فرماتے تھے۔ حضورؐ خود فوج تیار کرتے، اسکے ساز و سامان کا اہتمام فرماتے اور اسکی قیادت بھی خود ہی کرتے تھے اور خارجی اور داخلی امور کا انتظام بھی فرماتے تھے۔ آپ ﷺ نے بعض صحابہ کرامؓ کو یمن میں جُرش کے مقام پر بھیجا تاکہ وہاں سے اسلحہ سازی میں تربیت حاصل کریں اور یہی بعد میں خلفاء راشدین نے بھی کیا۔ اس کے علاوہ حضرت عمرؓ نے باقاعدہ ایک فوجی ادارہ یا دیوان قائم کیا اور اس پر علیحدہ افسر مقرر فرمایا جو کہ امیر جہاد کے تصرفات کا ہی حصہ ہے۔

اس طرح وہ ریاست جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاسیس فرمائی تھی، وہ اسی ہیکل پر مبنی تھی۔

خلیفہ

حکومت، اقتدار اور شریعت کے احکام کے نفاذ میں خلیفہ امت کی نیابت کرتا ہے، کیونکہ اسلام نے اقتدار امت کیلئے رکھا ہے۔ امت ہی خلیفہ کو یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ اُن کی طرف سے اُن کے امور کی نگرانی کرے، اور اللہ تعالیٰ نے امت پر یہ فرض کیا ہے کہ وہ شریعت کے تمام احکام نافذ کرے۔

کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان ہی خلیفہ کو خلافت پر مامور کرتے ہیں، لہٰذا خلیفہ امت، حکومت، اقتدار اور نفاذِ احکامِ شرع میں امت کا نائب ہوتا ہے۔ اسلئے وہ خلیفہ ہی امت کے بیعت دینے پر بنتا ہے، یعنی جب بیعت ہوگئی تو وہ امت کا نائب بن گیا۔ اس طرز پر بیعت کے بعد اسے اختیار حاصل ہوتا ہے اور امت پر اس کی اطاعت واجب ہو جاتی ہے۔

ایک حاکم جو مسلمانوں کے امور پر حکومت کر رہا ہو، اسوقت تک خلیفہ نہیں ہوگا جب تک کہ امت کے اہلِ حل و عقد اس کو اپنی رضا، اور اختیار سے بیعت نہ دیدیں، اور پھر وہ خلافت کے انعقاد کی تمام شرائط پورے نہ کر دے اور پھر انعقاد کے بعد وہ احکام شریعت کو نافذ نہ کر دے۔

اب جہاں تک اس کے لقب کا موضوع ہے، تو وہ خلیفہ، امام یا پھر امیر المومنین ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ اصطلاحات احادیثِ صحیحہ میں وارد ہوئی ہیں اور صحابہ کرامؓ کے اجماع سے بھی ثابت ہیں، نیز خلفاء راشدین نے بھی یہی لقب اختیار کئے تھے۔ حضرت ابو سعید الخدریؓ سے روایت ہے:

((إذا بويع لخليفتين فأقتلوا الآخر منهما))

اگر دو خلیفاؤں پر بیعت ہو جائے تو دوسرے کو قتل کر دو۔ (بروایت مسلم شریف)

حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ اُنہوں نے حضورؐ کو فرماتے سنا:

((ومن بايع اماماً فأعطاه صفقة يده، و ثمرة قلبه فليطعه))

جو کسی امام کے ہاتھ پر، دل سے بیعت دے، سو وہ اسکی اطاعت کرے۔ (بروایت مسلم شریف)

حضرت عوف بن مالکؓ سے مسلم شریف میں روایت ہے:

((خيار أئمتكم الذين تحبوهم و يحبونكم و تصلون عليهم و يصلون عليكم))

تمہارے بہترین امام وہ ہیں جو تم سے محبت کریں اور تم اُن سے؛ اور وہ تمہارے لئے دعا کریں اور تم اُن کیلئے دعا کرو۔

حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے امیر المومنین کا لقب اختیار کیا، پھر بعد میں دوسرے خلفاء پر بھی، صحابہ کرامؓ کے دور میں اور اُن کے بعد اس کا اطلاق ہوتا رہا۔ ضروری یہ نہیں ہے کہ ان تینوں القاب میں سے کسی لقب کو اختیار کیا جائے، یہ بھی ممکن ہے کہ ایک حاکم کوئی اور لقب اختیار کر لے مثلاً حاکم المسلمین؛ رئیس المسلمین یا سلطان المسلمین وغیرہ، شرط یہ ہے کہ ایسے

القاب کا مفہوم یہی ہو۔البتہ ایسے القاب اختیار نہیں کئے جاسکتے جن کے معنی احکام اسلام کے مخالف ہوں جیسے مَلِک (بادشاہ)؛رئیس الجمہوریہ یا شہنشاہ وغیرہ۔

خلیفہ کیلئے شرائط

خلیفہ میں خلافت کی اہلیت کیلئے سات شرائط کا ہونا لازمی ہے،ان شرائط پر پورا اُترنے پر ہی کوئی خلیفہ بن سکتا ہے۔یہ سات شرائط،شروطِ انعقاد کہلاتی ہیں اور اِن میں سے ایک بھی کم ہو تو خلافت کا انعقاد نہیں ہوتا۔

شروطِ انعقاد

۱-پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مسلم ہو۔کافر مطلقاً خلیفہ نہیں بن سکتا،اور نا اسکی اطاعت واجب ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَنْ يَّجْعَلَ ٱللهُ لِلكَافِرِينَ عَلَى ٱلمومنينَ سَبِيْلاً﴾

اور اللہ تعالیٰ کافروں کو ایمان والوں پر ہرگز راہ نہ دیگا۔(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم:نساء:۱۴۱)

حکومت ہی حکام کیلئے محکوم پر اقتدار کا مضبوط ترین ذریعہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس پر 'لَـــــــــــــنْ بـمـعـنـی" (آئندہ) نہیں" فرما کر اس حکم کو قطعی کر دیا کہ کوئی کافر مسلمانوں پر حکومت کرے،چاہے باعتبارِ خلیفہ یا کوئی اور شکل میں،اور مسلمانوں پر یہ حرام ٹھہرایا کہ وہ کافروں کو کبھی اپنے اوپر حاکم بنائیں۔

مزید یہ کہ خلیفہ ہی ولی الامر ہوتا ہے اور اللہ ﷻ نے ولی الامر کیلئے مسلمان ہونے کی شرط رکھی ہے:

﴿يا ايها الذين ءَ امنوا أطيعواْ اللهَ وَ أطيعواْ الرسولَ و أولى الأمرِ منكم﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو،اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور اُن کی بھی جو تم میں صاحبِ امر ہیں۔

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم:نساء:۵۹)

اور فرمایا:

﴿وَ إذا جَآ ءَ هم أمرٌ مِنَ الأمنِ أوِ الخوفِ أذاعواْ بِهِ و لَو ردُّوهُ إلى الرسولِ وَ إلىٰ أوْلِى الأمرِ منهم لَعَلِمَهُ الَّذِين يَسْطَنبطُونه منهم﴾

جب اُن کے پاس بے خوفی یا خوف کی کوئی بات پہنچتی ہے،تو اسے پھیلا دیتے ہیں حالانکہ اگر وہ اسے رسولؐ اور اپنے ذمہ داروں تک پہنچاتے تو ایسے لوگوں کے علم میں آجاتی جو اُن کے درمیان اس کی تحقیق کر سکتے ہیں۔(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم:نساء:۸۳)

قرآن حکیم میں 'اولی الامر' کے الفاظ جہاں بھی آئے ہیں، ہمیشہ مسلمانوں کے حوالے ہی سے آئے ہیں، اسکے علاوہ اور کسی کے حوالے سے نہیں، لہٰذا ولی الامر کا مسلم ہونا شرط ہوا۔ اور جب خلیفہ، ولی الامر ہوا تو وہ اپنی معاونت کیلئے جو دوسرے اولیاء امر مقرر کرتا ہے جیسے، معاون، والی اور عامل وغیرہ تو اُن کیلئے بھی یہ شرط ہوگی کہ وہ مسلم ہوں۔

۲- خلیفہ کیلئے دوسری شرط اسکا مرد ہونا ہے۔ عورت خلیفہ نہیں ہوسکتی، یہ لازم ہے کہ وہ مرد ہو، بخاری شریف میں ابی بکرہؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ مجھے بذاتِ خود اللہ کے رسولؐ کا یہ قول سننے کا شرف حاصل ہوا ہے، یہ بات اسوقت کی ہے جب میں اصحاب جمل کے ساتھ شامل ہوکر لڑائی کیلئے جارہا تھا، اس وقت حضورؐ تک یہ خبر پہنچی کہ ایرانیوں نے کسریٰ کی بیٹی کو ملکہ بنا لیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((لن يفلح قوم ولّوْا أمرهم امرأة))

وہ قوم جو اپنے امور پر عورت کو حاکم بنالے، ہرگز کامیاب نہیں ہوگی۔

حضورؐ کا یہ فرمانا کہ جو قوم اپنے اوپر عورت کو حاکم بنالے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی، عورت کے حاکم نا بنائے جانے کا حکم ہے۔ یہاں چونکہ یہ حکم اُن لوگوں کی مذمت کے صیغہ میں آیا ہے جو عورت کو حاکم بنائیں، چنانچہ یہ حکم قطعی ہوا۔ چونکہ عورت کے حاکم بنائے جانے کی تحریم یہاں ایک قرینہ سے جڑی ہے، لہٰذا عورت کا حاکم بنایا جانا حرام ٹھہرا۔ یہاں عورت کے ہاتھ میں اقتدار نا دینے سے مراد نہ صرف یہ کہ اس کو خلیفہ نہ بنا جائے، بلکہ اسکے علاوہ کوئی اور عہدہ جس سے اقتدار یا حکم وابستہ ہو، اس کی بھی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں بات کسریٰ کی بیٹی کو محض ملکہ بنائے جانے کی نہیں بلکہ اس کے ولی امر بنانے کی ہے۔ اس حدیث کا اطلاق عام نہیں ہے بلکہ صرف حکم اور اقتدار سے متعلق ہے۔

۳- خلیفہ کیلئے تیسری شرط ہے کہ وہ بالغ ہو، یہ جائز نہیں کہ خلیفہ نابالغ ہو۔ ابوداؤد میں حضرت علی ابن ابی طالبؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا:

((رُفع القلم عن ثلاثة:عن الصبي حتى يبلغ؛وعن النائم حتى يستيقظ؛ و عن المعتوه حتى يبرأ۔))

تین قسم کے لوگوں کا محاسبہ نہیں ہوگا: لڑکا، جب تک کہ وہ سنِ بلوغ کو نہ پہنچے؛ سویا ہوا شخص، جب تک کہ وہ نیند سے نہ جاگ جائے؛ اور مجنون (دیوانہ) جب تک کہ وہ ٹھیک نا ہوجائے۔

حضرت علیؓ سے ہی دوسرے الفاظ میں یہ روایت ہے:

((رفع القلم عن ثلاثة:عن المجنون المغلوب على عقله حتى يفيق؛ وعن النائم حتى يستيقظ؛وعن الصبي حتى يحتلم۔))

تین قسم کے لوگوں کا محاسبہ نہیں ہوگا: مجنون جسکی عقل درست نہیں، جب تک کہ وہ ٹھیک نا ہو جائے؛ سویا ہوا شخص جب تک کہ وہ جاگ نا جائے؛ اور نابالغ لڑکا جب تک کہ بلوغت کو نہ پہنچے۔

ظاہر بات ہے کہ جس پر سے قلم اُٹھالی گئی ہو یعنی جو محاسبہ سے بری الذمہ کر دیا گیا ہو اور خود اپنے اوپر ذمہ دار نا ہو، تو وہ غیر مکلّف ہوا اور اس کیلئے صحیح نہیں ہے کہ وہ خلیفہ بنایا جائے، یا حکم واقتدار کی کسی اور ذمہ داری پر فائز ہو۔ اس بات سے بھی اس کی دلیل ملتی ہے کہ حضورؐ نے ایک نابالغ لڑکے کی بیعت لینے سے منع کر دیا تھا۔ بخاری شریف میں ابی عقیل بن زہرہ بن معبد نے اپنے دادا عبداللہ ابن ہشام سے روایت کی ہے کہ وہ اپنی والدہ زینب بنت حمید کے ہمراہ حضورؐ کے پاس پہنچے اور اُنکی والدہ نے آپ ﷺ سے اُن کی (عبداللہ ابن ہشام کی) بیعت لینے کی گزارش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((هو صغير، فمسح رأسه و دعا له.....))

وہ (ابھی) چھوٹا ہے، اور اسکے سر پہ ہاتھ پھیرا اور اس کیلئے دعا فرمائی.....

لہٰذا اگر ایک نابالغ بچہ اتنا غیر معتبر ہوا کہ اس کی بیعت ہی نہیں لی جاسکتی، تو پھر کس طرح یہ ہوسکتا ہے کہ وہ خلیفہ بنایا جائے۔

۴- خلیفہ کیلئے عاقل وذی ہوش ہونا شرط ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ وہ دیوانہ ہو کیونکہ حضورؐ نے فرمایا:

((رفع القلم عن ثلاثة:عن المجنون المغلوب على عقله حتى يفيق))

تین قسم کے لوگوں کا محاسبہ نہیں ہوگا: مجنون جس کی عقل درست نہیں، جب تک کہ وہ ٹھیک نا ہو جائے.....

اب جو شخص ذمہ داری اُٹھانے کا اہل ہی نہ ہو، اور وہ کسی ذمہ داری کا پابند نا ہو سو وہ غیر مکلّف ہے، اور عقل ہی وہ شرط ہے جس پر انسان کے تصرفات کی صحت اور ذمہ داری ہے۔ خلیفہ کے تصرفات میں حکومت اور شرعی ذمہ داریاں ہیں، چنانچہ یہ صحیح نہیں کہ وہ مجنون ہو کیونکہ ایک مجنون خود اپنے ہی معاملات طے نہیں کر سکتا، تو پھر وہ دوسروں کی ذمہ داری کس طرح اُٹھا سکتا ہے۔

۵- اس کیلئے عادل ہونا شرط ہے، یہ نہیں ہوسکتا کہ خلیفہ فاسق ہو۔ عادل وانصاف پسند ہونا ایسی شرط ہے جس کے بغیر اسکی خلافت کا انعقاد نہیں ہوسکتا اور نہ ہی ایسی خلافت چل سکتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے گواہ کیلئے عادل ہونے کی شرط رکھی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ﴾

اور اپنے میں سے دو صاحبِ عدل آدمیوں کو گواہ بنالو۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: طلاق:۲)

خلیفہ کی حیثیت یقیناً گواہ سے بڑھ کر ہے، اسلئے اس کیلئے یہ ضروری ہوا کہ وہ صاحبِ عدل ہو، کیونکہ جب ایک گواہ کا صحیح ہونا عدل سے مشروط ہے تو خلیفہ کیلئے یہ تو شرط بدرجہ اولیٰ ضروری ہوئی۔

۶-خلیفہ کیلئے آزاد ہونا بھی لازمی شرط ہے کیونکہ ایک غلام اپنے آقا کی ملکیت ہوتا ہے اور از خود اس کا اپنے اعمال پر کوئی تصرف نہیں ہوتا، پھر وہ کیونکر دوسروں پر متصرف ہوسکتا ہے۔

۷-خلافت کیلئے ایک شخص میں اس اہلیت کا ہونا شرط ہے کہ وہ خلافت کے تقاضوں کو پورا کر سکے، کیونکہ یہ اسکی بیعت کا ہی تقاضا، اور جزو لازم ہے۔ ایک شخص جو اس اہلیت سے عاجز ہے وہ قرآن اور سنت سے، جن پر کہ اسے بیعت دی گئی، لوگوں کے امور کا اہتمام نہیں کر سکتا۔

ترجیح کی شرائط:

مندرجہ بالا شروط خلیفہ کا عقد صحیح ہونے کیلئے لازمی ہیں، اُن کے علاوہ کسی اور شرط کا لازمی ہونا صحیح نہیں ہے۔ دیگر شروط اگر نصوص شرعیہ سے ثابت ہوتی ہیں تو اس صورت میں وہ شروطِ ترجیحی ہونگی۔ کسی شرط کا شرطِ انعقاد یا لازمی شرط ہونے کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ شرط طلبِ جازم یا حکم قطعی کے طور پر نصوص شرعیہ میں موجود ہو، اگر ایسا نہیں ہے تو ایسی شرط، ترجیحی ہوسکتی ہے لازمی نہیں، اور اِن سات شروط کے ماسوا کوئی اور شرط حکم قطعی سے وارد نہیں ہوئی ہے، لہٰذا یہ سات شرائط ہی شروطِ انعقاد ہونگی۔ اِن کے علاوہ کوئی اور شرط اگر صحیح دلیل کے ساتھ ہے تو وہ محض ترجیحی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ یہ کہنا کہ خلیفہ کا مجتہد ہونا ضروری ہے، صحیح نہیں ہے کیونکہ ایسی کوئی نص نہیں ہے۔ مزید یہ کہ خلیفہ کا کام حکومت کرنا ہے اور اس کیلئے اجتہاد کی حاجت نہیں ہے، کیونکہ اگر خلیفہ کو کسی حکم میں اجتہاد کی ضرورت ہو تو وہ کسی مجتہد کی تقلید کر سکتا ہے، اور اگر وہ تقلید کرتے ہوئے، احکام کو اپنا سکتا ہے تو پھر مجتہد ہونا ضروری نہیں ہوا۔ البتہ یہ بہتر ہوگا کہ وہ مجتہد ہو، لیکن اگر وہ مجتہد نہیں ہے تو بھی اسکی خلافت کا انعقاد صحیح ہوگا۔ اسی طرح یہ بھی شرطِ انعقاد نہیں ہے کہ وہ بہادر ہو یا صاحبِ رائے ہو یا عوامی امور کے انتظام میں ماہر ہو، کیونکہ ایسی کوئی نصِ شرعی نہیں ہے اور نا یہ کسی شرعی حکم کے تحت وارد ہوا ہے کہ یہ شروط انعقاد کیلئے لازمی ہیں، حالانکہ کسی شخص کے خلیفہ ہونے کیلئے یہ افضل ہے کہ وہ صاحبِ رائے اور بہادر ہو۔ اسی طرح کسی خلیفہ کیلئے یہ شرطِ انعقاد نہیں کہ وہ قریش میں سے ہو۔ اور جہاں تک بخاری شریف کی حدیث کا تعلق ہے کہ معاویہ نے کہا میں نے رسول اللہؐ سے سنا کہ:

((إن هذا الأمر في قريش لا يعاديهم أحد إلا كبة الله على وجهه ما أقاموا الدين۔))

بے شک یہ معاملہ قریش کے اندر ہے جب تک کہ وہ دین کو نافذ کریں، اگر کوئی اُن سے دشمنی کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کو چہرے کے بل گرا دیگا۔

اور بخاری شریف ہی کی روایت حضرت ابن عمرؓ سے ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

((لا يزال هذا الأمر في قريش ما بقي منهم اثنان))

یہ معاملہ قریش ہی میں رہیگا چاہے اُن کے دو ہی آدمی بچے ہوں۔

یہ اور اس قسم کی اور احادیث، جو اقتدار کے قریش میں ہونے کے بابت ہیں اور جو صحیح ہیں اور حضورؐ سے مروی ہیں، تو یہ احادیث صیغہ اُخبار میں ہیں نا کہ صیغہ حکم میں۔ اور گو کہ صیغہ اُخبار میں طلب ہے لیکن حکم نہیں ہے اور نا ہی ایسی کوئی دلیل ہے، لہٰذا یہ قطعی نہیں ہوئیں۔ مزید یہ کہ ایسی احادیث کسی ایسے قرینے یا تاکید سے بھی جڑی ہوئی نہیں ہیں جو انہیں حکم قطعی کی شکل دے۔ چنانچہ یہ افضلیت کیلئے شرط ہونے کے باوجود انعقاد کے صحیح ہونے کی شرط نہیں ہوسکتی۔ پھر حدیث شریف کا یہ قول کہ: (**لا يعاديهم أحد إلا كبة الله**) یعنی اگر کوئی اُن سے دشمنی کرے، تو اللہ تعالیٰ اسے اس کے چہرے کے بل گرادیگا؛ دراصل اس بات کی تحریم ہوئی کہ اُن سے (خلیفہ ہوتے ہوئے) دشمنی کی جائے، نہ کہ اس بات سے جوڑنا کہ: **إن هذا الأمر في قريش** ؛ یعنی بے شک یہ معاملہ قریش کے اندر ہے؛ یہاں حدیث یہ کہتی ہے کہ معاملہ اُن کے اندر ہے؛ اور یہ کہ اُن سے دشمنی نا کی جائے۔ مزید یہ کہ لفظ قریش ایک اسم ہے نا کہ صفت اور شرعی اصطلاح میں یہ لقب کہلاتا ہے اور لقب کا مفہوم قابل لحاظ نہیں، کیونکہ اسم یا لقب کا مفہوم نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ نص کہ 'معاملہ قریش میں ہے' اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ غیر قریش میں نہیں ہو سکتا۔ اس طرح آپ ﷺ کا قول کہ: "**إن هذا الأمر في قريش**" اور "**لا يزال الأمر في قريش**" کا مطلب یہ نہیں کہ یہ غیر قریش میں نہیں۔ اور نا یہ قول کہ "معاملہ جب تک اُن میں ہے" کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ غیر میں نا ہو۔ نص میں یہ واقعہ بتانا کہ معاملہ قریش میں ہے، اس بات میں مانع نہیں کہ معاملہ غیر قریش میں نا ہو۔ لہٰذا کسی کا قریش میں ہونا ترجیحی تو ہوا لیکن یہ کوئی شرطِ انعقاد نہیں۔

مزید یہ کہ حضورؐ نے حضرت عبداللہ ابن رواحہؓ زید ابن حارثہؓ اور اسامہ ابن زیدؓ کو حکومتی عہدے دئے، یعنی کسی قسم کے اقتدار کی حیثیت دی اور یہ تینوں غیر قریش تھے، یعنی آپ ﷺ نے غیر قریش کو اقتدار دیا۔ جب کہ مندرجہ بالا احادیث میں لفظ 'امر' آیا ہے جو صرف خلیفہ تک محدود نہیں بلکہ ولی الأمر بھی شامل ہیں اور آپ ﷺ نے غیر قریش کو ولایت امر دی۔ اس طرح خود آپ ﷺ کا غیر قریش کو اقتدار دینا اس بات کی دلیل ہوئی کہ یہ صرف قریش میں محدود نہیں ہے اور یہ غیر قریش کیلئے ممنوع نہیں ہے۔ یہ احادیث اہلیت کی بناء پر بعض کی ترجیح پر دلالت کرتی ہیں لیکن اُن میں نا تو خلافت کو محدود کرتی ہیں اور نا ہی اُن کے علاوہ دوسروں کے انعقاد کی ممانعت۔

اسی طرح یہ بھی شرط نہیں ہے کہ خلیفہ ہاشمی یا علوی ہو، کیونکہ جیسا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے اقتدار بنی ہاشم اور بنی علیؓ کے باہر بھی دیا۔ جب آپ ﷺ غزوہ تبوک پر روانہ ہوئے تو مدینہ پر آپ ﷺ نے محمد ابن مسلمہؓ کو ولایت (اقتدار-Charge) دی جو نا ہاشمی تھے اور نا ہی علوی۔ اسی طرح یمن کی ولایت پر حضورؐ نے حضرت معاذ ابن

جبلؓ اور عمرو بن العاصؓ کو مامور کیا اور یہ دونوں نا تو ہاشمی تھے اور نا ہی علوی۔ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ تمام صحابہؓ نے اور حضرت علیؓ نے خود حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کو بیعت دی اور خلیفہ بنایا، جب کہ یہ تینوں نا ہاشمی تھے اور نا ہی علوی۔ اس پر تمام صحابہؓ خاموش رہے اور کسی نے بھی اُن کی بیعت سے یہ کہہ کر انکار نہیں کیا کہ یہ غیر ہاشمی یا غیر علوی ہیں، لہٰذا یہ صحابہؓ کا اجماع ہوا اور اس اجماع میں حضرت علیؓ حضرت ابن عباسؓ اور سارا بنی ہاشم خاندان شامل ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ خلیفہ غیر ہاشمی یا غیر علوی ہوسکتا ہے۔ اب رہی بات اُن احادیث کی جو حضرت علیؓ کی افضلیت میں یا اہل بیت کے برتر ہونے میں وارد ہیں، تو یہ اُن کی ترجیح کا اشارہ ہیں نا کہ اس شرط کا کہ خلیفہ اُنہی میں سے ہو۔

اس بحث سے یہ ثابت ہوا کہ ایسی کوئی دلیل نہیں ہے جس سے مندرجہ بالا سات شرائط کے علاوہ کسی اور شرط کا ہونا انعقادِ خلافت کیلئے لازمی ہو۔ ان کے علاوہ اور کوئی شرط، اگر وہ صحیح نصوص سے ثابت ہوتی ہے، یا کوئی شرط اگر کسی شرعی حکم کے تحت آتی ہو تو اسکا ترجیحی ہونا ممکن ہوسکتا ہے لیکن جہاں تک انعقاد کیلئے لازم شرائط کا تعلق ہے، تو وہ اُن سات شرائط کے علاوہ نہیں ہیں۔ شرعاً جو چیز مطلوب ہے وہ شرائط انعقاد ہیں تاکہ خلیفہ منتخب ہو سکے۔ اس کے علاوہ خلیفہ کے انتخاب کے وقت مسلمانوں کو تمام نامزد افراد (Candidates) کے کوائف بتائے جائینگے تاکہ وہ اُن میں سے بہتر کو منتخب کریں۔ لیکن بہرحال خلیفہ کے انعقاد کیلئے اس میں صرف شروطِ انعقاد کا موجود ہونا کافی ہوگا، خواہ دوسری شرائط نہ ہوں۔

خلافت کا انعقاد

خلیفہ کیلئے خلافت ایک معاہدہ (Contract) ہے جس میں عوام کی رضا اور اختیار (Choice) ہو، کیونکہ اس میں اطاعت کے مستحق کی بیعت ہے۔ لہٰذا اس کیلئے یہ ناگزیر ہے کہ جس کی بیعت مقصود ہو، اور جو بیعت دے رہا ہو، دونوں کی رضا شامل ہو۔ چنانچہ اگر ایک شخص خلیفہ بننا نہ چاہتا ہو تو اسے ان کی مرضی کے خلاف مجبور نہیں کیا جاسکتا، بلکہ کوئی اور ہی وہ جگہ لے سکتا ہے۔ اسی طرح عوام کو اس کی مرضی کے خلاف بیعت دینے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس صورت میں یہ عقد صحیح نہیں ہوگا، کسی اور عقد و معاہدے کی طرح اس عقد میں بھی طرفین کی رضا لازمی ہے، جس میں کوئی جبر اور سختی شامل نہ ہو۔ البتہ جب معتبر بیعت ہو جائے تو وہ صحیح تسلیم کی جائیگی اور جس پر بیعت کی گئی ہو وہ صاحبِ اقتدار مانا جائیگا نیز اس کی اطاعت فرض ہو جائیگی۔ اس کے بعد باقی عوام کی بیعت، بیعتِ اطاعت ہوگی نا کہ بیعتِ انعقاد۔ اس بیعتِ انعقاد کے بعد خلیفہ باقی لوگوں کو بیعتِ اطاعت پر مجبور کرسکتا ہے، کیونکہ یہ اطاعت اکا معاملہ ہے اور خلیفہ کی اطاعت ایک شرعی فرض ہے۔ یہاں کوئی یہ بحث کرسکتا ہے کہ جب خلافت ایک معاہدہ ہے تو پھر خلیفہ کیونکر لوگوں کو بیعت کیلئے مجبور کرسکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص بیعتِ انعقاد کے بعد خلیفہ مقرر ہوا اب وہ عوام سے جو بیعت لے رہا ہے وہ اپنی اطاعت کیلئے بیعت لے رہا ہے اور اب یہ جبر اللہ کے حکم کے تحت ہے جس کے بموجب خلیفہ کی اطاعت واجب ہے۔

کیونکہ خلافت ایک عقد (Contract) ہے، اسلئے اس میں عقد دینے والے کا ہونا ضروری ہے جو کسی شخص کو بطور خلیفہ مقرر کرے، جیسے ایک قاضی کیلئے یہ ضروری ہے کہ کوئی اسکی قاضی کے منصب پر تقرری کرے، یا کوئی امیر اسی وقت بن سکتا ہے جب کوئی اسے امیر بنائے۔ اسی طرح کوئی خلیفہ تب ہی بن سکتا ہے جب اسے کوئی (مسلم عوام) خلیفہ بنائے۔ یعنی ایک شخص کا خلیفہ کے منصب اور اقتدار و اختیار پر ہونا، اُسی وقت صحیح اور شرعی ہوگا جب دو فریق ہوں؛ ایک تو وہ شخص جو خلافت حاصل کرنا چاہتا ہو اور دوسرے (مسلم عوام) جو یہ تسلیم کریں کہ یہ خلیفہ ہو۔

خلافت پر غاصب کا حکم

اس صورت میں کہ کوئی شخص قوت کے زور سے منصبِ خلافت حاصل کرلے اور خود کو خلیفہ کہے، تو اُس کی خلافت صحیح نہیں ہوگی، کیونکہ مسلم عوام کی جانب سے اُس کی خلافت کا انعقاد نہیں ہوا۔ اگر وہ طاقت کا استعمال کر کے جبراً بیعت پر لوگوں کو مجبور کرے اور اس طرح سے بیعت حاصل کرلے، تو بھی اسکی خلافت صحیح تسلیم نہیں کی جائیگی کیونکہ زبردستی لی گئی بیعت سے خلافت کا انعقاد نہیں ہوتا۔ خلافت عوام کی مرضی اور اختیار کا عقد ہے، اور اس بیعت میں یہ رضا اور اختیار مفقود ہیں، لہٰذا یہ بیعت صحیح نہیں مانی جائیگی۔ بہرحال اگر ایسا غاصب یعنی متسلط شخص عوام کو اعتبار میں لے کر اُنہیں یہ یقین دلا دیتا ہے کہ مسلمانوں کی مصلحت اسے بیعت دینے میں ہے، اور شرعی احکام سے بیعت حتمی اور قطعی ہو جاتی ہے، عوام اپنی رضا اور اختیار سے اسے بیعت دے دیتے ہیں تو وہ اسی وقت سے خلیفہ تسلیم کرلیا جائیگا جس وقت یہ بیعت ہوئی، حالانکہ اُس نے شروع میں طاقت کا استعمال کر کے تسلط حاصل کیا تھا۔ حقیقتاً شرط یہی ہے کہ بیعت عوام کے اختیار اور مرضی سے ہو، قطع نظر اس سے کہ وہ شخص اُس وقت حاکم تھا یا نہیں۔

وہ افراد جن کی بیعت سے خلافت کا انعقاد عمل میں آتا ہے۔

یہ سمجھنے کیلئے کہ کن لوگوں کی بیعت سے خلافت کا انعقاد عمل میں آتا ہے، یہ ضروری ہے کہ خلفائے راشدین کی بیعت کے حالات اور صحابہؓ کے اجماع پر نظر ڈالی جائے۔ حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ بنتے وقت اس بات پر اکتفاء کیا گیا کہ صرف مدینہ منورہ کے اہل حلّ وعقد کی بیعت لی جائے، اس وقت مکے کے مسلمانوں یا جزیرۂ عرب کے مسلمانوں سے مشورہ نہیں لیا گیا۔ یہی صورتِ حال حضرت عمرؓ کے وقت بھی رہی۔ لیکن حضرت عثمان کی بیعت کے وقت حضرت عبدالرحمان ابن عوفؓ نے مدینے کے اہل حل وعقد اور عام مسلمانوں سے رائے حاصل کی۔ حضرت علیؓ کے وقت اہل مدینہ اور کوفہ کی اکثریت نے حضرت علیؓ پر ہی بیعت کی، یہاں تک کہ جن لوگوں نے حضرت علیؓ سے مخالفت کی اور لڑے، اُن کی بیعت بھی حضرت علیؓ کیلئے صحیح تھی، کیونکہ انہوں نے کسی اور پر بیعت نہیں کی تھی اور نا آپؓ کی بیعت پر اعتراض کیا تھا، وہ تو محض حضرت عثمانؓ کے قتل کا انتقام

چاہتے تھے۔اُن کا معاملہ ایسے باغیوں کا تھا جو خلیفہ سے کسی مخصوص معاملہ میں بغاوت کر جائیں۔اب یہ خلیفہ کا ذمہ ہوا کہ وہ اُنہیں آگاہ کرے اور اُن سے قتال کرے۔اِن لوگوں نے بہر حال کوئی دوسری خلافت قائم نہیں کی تھی۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ مدینے یعنی پایہ تخت کے لوگوں نے، دوسرے علاقے کے لوگوں کے بغیر خلیفہ کیلئے بیعتِ انعقاد کی، اور یہ سب صحابہؓ کے سامنے ہوا اور اُنہوں نے اس بیعت پر اعتراض نہیں کیا، نا ہی مخالفت کی۔ چنانچہ یہ صحابہؓ کا اجماع ٹھہرا کہ بیعتِ انعقاد کیلئے اس قدر اہل حل وعقد کی رائے کافی ہے جو امت کی اکثریت کی نمائندگی کرتے ہوں۔اُس دَور کی حقیقت بھی یہی تھی کہ مسلمانوں میں اہل حل وعقد کی ایک بڑی تعداد مدینے میں مقیم تھی، اور یہ اکثریت اتنی بڑی تھی کہ بہ آسانی یہ مسلمانوں کے اُس وقت کے تمام علاقوں کے لوگوں کی رائے کی نمائندہ تھی۔

لہٰذا خلافت کا انعقاد اُس وقت صحیح قرار پاتا ہے جب امتِ مسلمہ کی اکثریت اسے قبول کر لے۔خلفاء راشدین کی بیعت میں یہی معاملہ کارفرما رہا۔ایسی بیعت، انعقاد کی بیعت کہلائیگی، اور اس کے بعد جب خلیفہ مقرر ہو جائے، پھر جو بھی کوئی بیعت دیگا وہ اس کی خلیفہ کیلئے اطاعت کی بیعت مانی جائیگی نا کہ انعقاد کی بیعت۔

یہ اصول اُس شکل میں ہیں جب کہ ایک خلیفہ کی وفات یا معزول کئے جانے کی صورت میں دوسرے خلیفہ کے تقرر کا معاملہ درپیش ہو۔لیکن اگر صورتِ حال یہ ہو کہ خلیفہ کا وجود ہی نا ہو، اور امت پر یہ فرض ہو گیا ہو کہ اپنے لئے خلیفہ مقرر کرے جو کہ احکام شرع نافذ و جاری کرے اور اسلام کی دعوت سارے عالم میں پہنچائے، جیسا کہ اس وقت حال ہے کہ خلافت ۱۳۴۳ھ یعنی ۱۹۲۴ء میں اسطنبول میں ختم کر دی گئی۔لہٰذا اس وقت اگر اسلامی دنیا کے کسی بھی ملک میں وہاں کے عوام ایک خلیفہ کو بیعت انعقاد دے کر مقرر کر دیتے ہیں تو باقی مسلم ممالک کے مسلمانوں پر یہ فرض ہو جائیگا کہ وہ اِس خلیفہ کو اپنی اطاعت کی بیعت دیں، کیونکہ اس کی خلافت کیلئے بیعتِ انعقاد اُس علاقہ کے مسلمانوں نے پوری کر دی ہے۔اب اس بیعتِ اطاعت کیلئے یہ شرط نہیں ہے کہ باقی ممالک جیسے مصر، ترکی اور انڈونیشیا جیسے بڑے ملک یا اردن، تونس اور لبنان جیسے چھوٹے ملک۔البتہ اِس ملک کیلئے ذیل کی چار شروط کا ہونا ضروری ہے:

پہلی شرط: یہ کہ ایسی ریاست خود مختار ہو، یعنی وہاں اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو نا کہ کسی کافر ملک کا، اور نا ہی وہ کسی کافر ملک کے زیرِ اثر ہو۔

دوسری شرط: اس ملک کے مسلمانوں کا تحفظ اسلام کے نام سے ہو، نا کہ کفر کے نام پر، یعنی داخلی اور خارجی امن (Security) کیلئے مسلم فوج ہو، ایسی قوت جو اسلام کے تحفظ کیلئے ہو۔

تیسری شرط: اس ریاست میں اسلام کا نفاذ مکمل طور سے کیا جائے، جو زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہو، انقلابی نوعیت کا ہو اور یہ ریاست اسلام کی دعوت میں سرگرم ہو۔

چوتھی شرط: یہ کہ خلیفہ انعقادِ خلافت کی تمام شرائط پر پورا اترتا ہو، پھر خواہ باقی ترجیحی شرائط میں معاملہ جو بھی ہو، کیونکہ خلافت کے صحیح اور معتبر ہونے کیلئے انعقادِ خلافت کی شرائط ہی لازم ہیں۔

اگر وہ ریاست اِن شرائط کو پورا کر رہی ہو، تو صرف وہاں کے لوگوں کی بیعت سے خلافت کا قیام صحیح مانا جائیگا، خواہ اس انعقاد میں امتِ مسلمہ کے تمام علاقوں کے اہل حل وعقد کی اکثریت کی نمائندگی نا بھی ہو، کیونکہ خلافت کا قیام فرض علی الکفایہ ہے، اور جو کوئی اس کو اسکی تمام شرائط کے اعتبار سے پورا کر دے تو اُس نے قیامِ خلافت کا فرض پورا کر دیا۔ رہی بات اہل حل وعقد کی اکثریت کی، تو یہ اُس صورت میں ہے کہ جب خلافت پہلے سے قائم ہو اور محض ایک خلیفہ کی وفات یا معزولی کے بعد اب دوسرے کا انتخاب مقصود ہو۔ لیکن جب صورتِ حال یہ ہو کہ خلافت کا سرے سے وجود ہی نا ہو، اور خلافت کا قیام مقصود ہو، تو پھر قطع نظر بیعت کرنے والوں کی تعداد سے، محض یہ کافی ہے کہ خلافت کا قیام شرعی طریقہ سے صحیح ہو اور خلیفہ، انعقاد کی شرائط پوری کرتا ہو؛ کیونکہ ایسے وقت میں جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے وہ فرض کی تکمیل ہے، جس سے مسلمان اسکی مقررہ تین دن کی مدت سے زیادہ عرصہ سے غافل ہیں۔ اب اس غفلت کے سبب، اُنہیں یہ حق نہیں کہ وہ اپنی پسند سے انتخاب کر سکیں۔ لہٰذا اب کسی کی بھی کوشش سے کسی ایک علاقے میں خلافت قائم ہو جائے، اور ایک خلیفہ کو اس کی بیعت ہو جائے، تو یہ تمام مسلمانوں پر فرض ہوگا کہ وہ اُس خلیفہ کے پرچم تلے آ جائیں اور اُس کو بیعت دیں ورنہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک گنہگار ہونگے۔ اس خلیفہ پر یہ لازم ہوگا کہ وہ تمام مسلمانوں کو بیعت کیلئے دعوت دے، اور جو کوئی اس سے انکار کرے وہ باغی کے حکم میں آئیگا اور خلیفہ پر یہ ضروری ہوگا کہ اُن سے اُس وقت تک لڑے جب تک کہ وہ اطاعت نہ کر لیں۔ اب ایک خلیفہ کے شرعی طور پر، پہلے گزری چاروں شرائط کو پورا کرتے ہوئے، بیعت ہو جانے کے بعد اگر اُسی ملک میں، یا کہیں اور کسی اور شخص پر بیعت کی جاتی ہے تو تمام مسلمانوں پر یہ فرض ہوگا کہ اُس دوسرے خلیفہ سے لڑیں جب تک کہ وہ پہلے سے بیعت کر نہ لے، جیسا کہ مسلم شریف کی حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے:

((.....ومن بايع إماماً فأعطاه صفقة يده و ثمرة قلبه فليطعه إن استطاع، فإن جاء آخر ينازعه فأضربوا عنق الآخر))

جو کوئی ایک امام کے ہاتھ پر، دل سے بیعت دے، پھر وہ اسکی حسبِ استطاعت اطاعت کرے، اور اگر کوئی دوسرا آ کر خلیفہ سے تنازعہ کرے، تو اسکی گردن اُڑا دے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ خلیفہ ہی مسلمانوں کو اسلام کے پرچم تلے متحد کرتا ہے، اور خلیفہ کی موجودگی سے ہی مسلمانوں کی ایسی جماعت وجود میں آتی ہے جس میں شامل رہنا ہر مسلمان کیلئے فرض اور اس جماعت سے خروج حرام ہو جاتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے بخاری اور مسلم شریف میں روایت ہے:

((مَنْ رَأی مِنْ أمیرہِ شیئاً یَکْرَھه فلیصبر علیه، فَإنّهُ مَن فَارَقَ الجماعةَ شِبْرَاً فماتَ إلّا ماتَ میتة جاھیلیة۔))

جو اپنے امیر میں کوئی ایسی بات دیکھے جو اسے ناگوار ہو تو اُسے چاہئے کہ وہ اُس پر صبر کرے، پس جو کوئی جماعت سے بالشت بھر دور گیا اور (اس حالت میں) مرا، تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

مسلم شریف میں ہی ایک اور حدیث حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت کی ہے:

((مَنْ کَرِہ مِنْ أمیرہٖ شیئاً فلیصبر علیه، فإنّهُ لیس أحد مِن الناس خرج مِن السلطان شبراً فمات علیه إلّا مات میتة جاھلیة۔))

جس کسی کو اپنے امیر کی کوئی بات ناگوار ہو تو اُسے چاہئے کہ وہ اس پر صبر کرے، کیونکہ جو کوئی (اسلامی حکومت کے) اقتدار سے بالشت بھر دور ہوا اور مر جائے، تو وہ جاہلیت کی مات مرا۔

یہ دونوں احادیث اس بات کی دلیل ہیں کہ مسلمان کیلئے جماعت اور اقتدار کی پابندی اور التزام فرض ہے۔

غیر مسلمان کا یہ حق نہیں کہ وہ بیعت لے، کیونکہ بیعت تو اسلام یعنی اللہ کی کتاب اور حضورؐ کی سنت کی ہوتی ہے، جو اسلام، قرآن اور سنتِ رسولؐ پر ایمان کا تقاضا کرتی ہے۔ غیر مسلم کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ حکومت میں ہو، یا حاکم منتخب کیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے غیر مسلموں کو مسلمانوں پر سبیل نہیں دی ہے اور اُن کی بیعت صحیح نہیں ہے۔

خلیفہ کو کون مقرر کرتا ہے

شارع نے اقتدار امت کو سونپا ہے اور خلیفہ کا تقرر تمام ہی مسلمانوں کی ذمہ داری ہے، یعنی کسی ایک فرقہ کو چھوڑ کر کسی ایک مخصوص فرقے یا جماعت کیلئے اسے خاص نہیں کیا ہے، اور بیعت کو تمام مسلمانوں پر فرض قرار دیا ہے:

((.....مَنْ مَات ولیس في عنقه بیعة مات میتة جاھلیة۔))

جو کوئی اس حالت میں مرا کہ اس کی گردن پر بیعت کا طوق نہیں، تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

(مسلم شریف بروایت حضرت عبداللہ ابن عمرؓ)

یہ حکم مسلمانوں کیلئے عام ہے، نا کہ صرف اہل حل وعقد کیلئے مخصوص۔ لہٰذا صرف اہل حل وعقد ہی نہیں بلکہ عام مسلمانوں کا بھی یہ حق ہے کہ وہ خلیفہ کا تعین کریں، کیونکہ یہ تمام مسلمانوں کیلئے ہے یہاں تک کہ فاجر، فاسق اور منافقین بھی، اگر وہ مسلمان ہوں تو اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ غرضیکہ ہر بالغ مسلمان اس کا اہل ہے، صرف نابالغ ہی اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ اُن سے بیعت نہیں لی گئی، اس کے علاوہ یہ حکم ہر مسلمان کیلئے ہے۔

خلافت کے صحیح ہونے کیلئے یہ ضروری نہیں کہ ہر مسلمان اپنے بیعت کے حق کا استعمال کرے، حالانکہ یہ فرض ہے، لیکن یہ فرض، فرض علی الکفایہ ہے نا کہ فرض عین۔ جب بعض لوگوں کی کوشش سے یہ فرض ادا ہو گیا تو باقی لوگوں سے یہ ساقط ہو جاتا ہے۔ بہر حال یہ ضروری ہے کہ یہ حق تمام مسلمانوں کہ لئے عام ہو اور ہر شخص اس حق کا استعمال کر پائے، قطع نظر اس کے کہ وہ واقعی کرتا ہے یا نہیں۔ یعنی خلیفہ کے نصب کئے جانے کے عمل میں شامل ہونے کا مکمل اختیار ہر مسلمان کے بس میں ہونا ضروری ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرض قرار دیا ہے کہ خلیفہ کا تقرر مسلمانوں کی مرضی سے عمل میں آئے، یہ فرض نہیں ہے کہ ہر مسلمان اس عمل میں لازماً شریک ہو، البتہ یہ ضروری ہے کہ اس عمل میں شامل ہونے کا مکمل اختیار ہر مسلمان کو ہو اور اس راستہ میں کوئی رکاوٹ نا ہو۔ اب یہاں دو مختلف صورتِ حال ممکنہ طور پر ہو سکتی ہیں: ایک یہ کہ تمام مسلمان ایک شخص کے تعین پر راضی ہوں؛ اور دوسری شکل یہ کہ تمام مسلمانوں کی رضا حاصل نہیں ہوتی، حالانکہ دونوں صورتوں میں مسلمانوں کو یہ اختیار تھا کہ وہ اس عمل میں اپنے اس حق کا استعمال بغیر روک ٹوک کے کر سکتے تھے۔

جہاں تک پہلی صورتِ حال کا معاملہ ہے، خلیفہ کے تعین کے لئے کسی معین تعداد کی بیعت مقرر نہیں ہے۔ مسلمان کسی بھی تعداد میں خلیفہ کو بیعت دیں، اور اس بیعت پر باقی عوام کا سکوت ہو، یا وہ خلیفہ کی اطاعت قبول کریں، یا کسی اور طور پر اُن کی رضا کا اظہار ہو، متعین شخص اب تمام مسلمانوں کا خلیفہ شرعاً تسلیم کیا جائیگا، خواہ اس پر محض پانچ افراد نے بیعت کی ہو، بشرطیکہ اِن افراد میں خلیفہ کی تنصیب کے عمل پر اتفاقِ رائے ہو، اور عوام کی رضا، اُنکے سکوت یا بیعتِ اطاعت میں پہل کرنے سے یا اس جیسے کسی اور طریقہ سے واضح ہو جائے۔ البتہ اس عمل میں یہ لازمی ہے کہ عوام کو اُن کی پسند کا مکمل حق ہو، اور وہ اپنی مرضی کا اظہار کرنے کے مجاز ہوں۔

دوسری صورت یہ کہ تمام مسلمانوں کی رضا حاصل نہیں ہو پاتی ہو، تو خلیفہ کا تعین نہیں ہو سکتا، سوائے اس کے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت نے خلیفہ کو مقرر کیا ہو اور یہ جماعت اس تقرری پر عوام کی اکثریت کی رائے عامہ حاصل کر لے، خواہ اس جماعت کی تعداد کچھ بھی ہو۔ اس موضوع پر بعض فقہاء کا موقف یہ ہے کہ اہل حل وعقد کے خلیفہ پر بیعت کرنے سے خلیفہ کی تقرری ہو جاتی ہے۔ یہاں فقہاء کی اہل حل وعقد سے مراد وہ جماعت ہے جو ایک صحیح شخص کو جو انعقاد کی شرائط پوری کرتا ہو، بیعت دے اور پھر اُس شخص پر عوام کی رضامندی حاصل کر سکے۔ بہر حال اہل حلّ وعقد کی بیعت اپنے آپ میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے خلیفہ کا تعین ہو جاتا ہو، اور نا ہی اُن کی بیعت، خلیفہ کے تعین کیلئے شرعی شرط ہے۔ البتہ کیونکہ بہر حال اہل حلّ وعقد کا امّت میں ایک مرتبہ ومقام ہوتا ہے اور وہ عوام کی رائے کی نمائندگی کرتے ہیں، لہٰذا اُن کی بیعت اس بات کی طرف ایک اشارہ کرتی ہے کہ اُن کی اس بیعت پر عوام راضی ہونگے، اور ہر وہ بات جو عوام کی رضا کی طرف اشارہ کرتی ہو، اس سے خلیفہ کی شرعاً تنصیب ہو جاتی ہے۔

اس طرح شرعی حکم یہ ہے کہ مسلمانوں کی جماعت خلیفہ کا تقرر کرے اور اِس تقرر پر مسلمانوں کی رضا حاصل کرے۔ اس رضا کا اظہار کسی بھی طریقہ سے ہوسکتا ہے، مثلاً اہل حلّ وعقد کی اکثریت کی بیعت سے؛ یا اس جماعت کے اکثریت کی نمائندگی کرنے سے؛ اِس بیعت پر عوام کی خاموشی سے؛ یا پھر مسلمانوں کے ذوق وشوق سے بیعت کیلئے آنے پر یا کسی اور وسیلے سے عوام کی رضا ظاہر اور واضح ہوجاتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ عوام کو اپنی رائے اور پسند کے اظہار کیلئے ذرائع مکمل طور پر مہیّا ہوں۔ کسی کا اہل حل وعقد ہونا؛ یا پانچ اشخاص کی جماعت ہونا؛ یا پانچ سو افراد کی جماعت ہونا؛ یا اور زیادہ یا کم ہونا؛ یا پایۂ تخت کے علاقہ کے ہونا؛ یا کسی صوبے کا ہونا حکم شرعی نہیں ہے۔ شرعی حکم تو یہ ہے کہ اس بیعت پر کسی بھی ذریعہ سے مسلمانوں کی رضا حاصل ہو اور مسلمانوں کو اپنی پسند کے اظہار کیلئے تمام ذرائع ووسائل مہیّا ہوں۔

تمام مسلمانوں سے یہاں وہ مسلمان مراد ہیں جو اُن علاقوں میں آباد ہوں جو اسلامی ریاست کے تابع ہوں، یعنی اگر خلافت پہلے سے قائم ہو تو خلیفۂ سابق کی رعایا ہوں اور اگر خلافت کا وجود نا ہو تو تمام مسلمانوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلامی ریاست قائم کر کے اسلامی طرزِ زندگی کا احیاء چاہتے ہوں اور جن سے ریاستِ اسلامی کا وجود میں آنا تکمیل پاتا ہو اور خلافت کا انعقاد ہوتا ہو۔ اس کے علاوہ باقی مسلمانوں کی بیعت اور رضا خلیفہ کے تعین کیلئے شرط نہیں ہیں، کیونکہ ایک تو وہ لوگ اسلام کے دائرۂ اقتدار سے باہر دارالکفر میں بسے ہونگے اور اس اسلامی ریاست میں شامل نہیں ہو پائینگے، اِن لوگوں کو بیعتِ انعقاد کا حق نہیں ہوتا، البتہ بیعتِ اطاعت اُن پر واجب ہوتی ہے اسلئے کہ اسلام کے اقتدار سے باہر رہنا بغاوت کے حکم میں آتا ہے؛ اور ایسے مسلمان اسلامی اقتدار قائم کرنے میں شریک بھی نہیں ہوسکتے، نہ ہی وہ اسلامی اقتدار قائم کر سکتے ہیں اور نہ ہی اُس ریاست میں شامل ہوسکتے ہیں۔ لہٰذا وہی لوگ جو بیعتِ انعقاد کا حق رکھتے ہیں، اور جن کی رضا سے ہی خلیفہ کی تقرری شرعی طور پر صحیح ہوسکتی ہے، انہی کے ذریعے اسلامی اقتدار وجود میں آتا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ عقلی بحث و دلائل ہیں جنکی کوئی شرعی دلیل نہیں، اسلئے کہ یہ حکم کے موضوع سے متعلق امور ہیں نا کہ براہِ راست حکم سے متعلق۔ چنانچہ ضروری یہ ہے کہ اس حکم کی حقیقت کو سمجھا جائے، نا کہ اس کی شرعی دلیل کو۔ مثلاً مردہ گوشت کھانا حرام ہے، یہ شرعی حکم ہے، اور اس بات کو سمجھنا کہ ''مردہ'' کی حقیقت کیا ہے، یہ اُس شرعی حکم کا موضوع یعنی مناط الحکم ہے۔ اس طرح خلیفہ کا تقرر کیا جانا حکم شرعی ہے اور اس تقرری پر مسلمانوں کی رضا کا ہونا بھی شرعی حکم ہے، اس کی شرعی دلیل دی جانا ضروری ہے۔ برخلاف اس کے، یہ سوال کہ وہ کون مسلمان ہوں جن کے ذریعے خلیفہ کی تقرری ہو؛ یا وہ کیا امور ہیں جن سے رضا اور اختیار کی تکمیل ہوتی ہے، تو یہ سوال مناط الحکم میں آتے ہیں، یعنی اُس موضوع میں جن کے بارے میں یہ حکم آیا ہے۔ شرعی حکم کو نافذ و جاری کرنے کیلئے یہ لازم ہے کہ معاملہ کی حقیقت کو سمجھ کر حکمِ شرعی کا اِس معاملہ پر انطباق کیا جائے۔

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ حکم کا موضوع یعنی مناط الحکم، حکم کی علت ہے، لہٰذا اس کی دلیل دی جانا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ حکم کے موضوع یعنی مناط الحکم میں اور حکم کی علّت میں بڑا فرق ہے اور یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ علّت حکم کا محرّک یا سبب ہوتی ہے اور یہ حکم میں شارع کے مقصود کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ شرعی دلیل دی جائے جس سے شارع کا مقصد واضح ہوتا ہو۔ جبکہ مناط، اس حکم کے موضوع سے متعلق ہے جس پر اس حکم کا انطباق ہونا ہے۔ مناط کسی حکم کی دلیل یا اس کا سبب وعلّت نہیں ہوتی۔ لہٰذا مناط وہ چیز ہے جو حکم سے جڑی ہوئی ہے، یعنی حکم اس موضوع کے متعلق یا اس کو حل کرنے کیلئے آیا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حکم اسی (موضوع) کے سبب آیا ہے، یا حکم کے آنے کی یہ علت ہے۔ اس طرح کسی حکم کی مناط، اُس حکم کی نصِ شرعی سے دیگر (غیر نقلی) چیز ہے، اور مناط کو سمجھنا، علت کے سمجھنے سے مختلف ہے جو کہ اُس نص شرعی کو سمجھنا ہے جس کی علت زیر بحث ہو، جبکہ مناط اس سے جدا ہے اور اس سے مراد وہ حقیقت ہے جن پر اس حکم کا انطباق ہونا ہے۔

بیعت

بیعت ہر مسلمان پر فرض ہے اور یہ ہر مسلم مرد اور عورت کا حق ہے۔ اس کی فرضیت کی متعدد احادیث ہیں جن میں سے ایک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا یہ فرمان ہے:

((.....مَنْ مَات وليس في عنقه بيعة مات ميتة جاهلية.))

جو کوئی اس حالت میں مرا کہ اس کی گردن پر بیعت کا طوق نہیں، تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

(مسلم شریف بروایت حضرت عبداللہ ابن عمرؓ)

رہی بات بیعت کے مسلمانوں کا حق ہونے کی، تو بیعت کا طرز اس کا ثبوت ہے، کہ بیعت مسلمانوں کی طرف سے خلیفہ کو دی جاتی ہے نا کہ خلیفہ کی طرف سے مسلمانوں کو، بیعت کا مسلمانوں کی طرف سے حضور ﷺ کو دیا جانا بھی متعدد احادیث سے ثابت ہے، حضرت عبادہ بن صامتؓ سے بخاری شریف میں روایت ہے:

((بايعنا رسول اللهؐ على السمع و الطاعة في العسر واليسر والمنشط والمكره،وأن لا ننازع الأمر أهله،وأن نقوم أو نقول بالحق حيث ما كنا،لا نخاف في الله لومة لائم.))

ہم نے رسول اللہ ﷺ پر اس بات کی بیعت کی کہ ہم مشکلات میں اور آسانیوں میں، اور خوشحالی میں اور سخت حالات میں سنیں گے اور اطاعت کرینگے اور ہم صاحب اقتدار سے اس کے امر میں تنازعہ نہیں کرینگے اور ہم ہر موقع اور جگہ حق کہیں گے اور حق کا ساتھ دینگے، اور اللہ کے معاملے میں کسی سے خوف زدہ نہیں ہونگے۔

بخاری شریف میں حضرت ایوبؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت حفصہؓ سے اور انہوں نے حضرت ام عطیہؓ سنا:

((بايعنا النبي ﷺ فقرا علينا أن لا يشركن بالله شيئاً و نهانا عن النياحة فقبضت أمرلة منا يدها فقالت:فلانة أسعدتني،و أنا أريد أن أجزيها فلم يقل شيئاً فذهبت ثم رجعت.....))

ہم نے نبی ﷺ پر بیعت کی تو آپ ﷺ نے ہمیں بتایا کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، اور ہمیں رونے دھونے اور آہ و بکا کرنے سے منع فرمایا، اُس وقت ہم میں سے ایک عورت نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہا کہ فلاں عورت نے مجھے خوش کیا تھا، میں اسے اِس کا بدلا دینا چاہتی ہوں، آپ ﷺ نے اس سے کچھ نہیں کہا، وہ گئی اور پھر لوٹ آئی۔

حضرت ابی ہریرہؓ سے روایت ہے:

((ثلاثة لا يكلمهم الله يوم القيامة ولا يزكيهم ولهم عذاب أليم:رجلٌ على فضل ماء بالطريق يمنع منه ابنِ السبيل؛و رجلٌ بايع اماماًل ا يبايعه إلا لدنياه،إن أعطاه ما يريد وفىَ لهُ،وإلا لم يفِ لهُ؛ و رجلٌيبايع رجلاً بسلعة بعد عصر فحلف باللهِ لقد أُعْطي بها كذا و كذا فصدقه فأخذها ولم يعط بها۔))

تین قسم کے لوگ ایسے ہونگے جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نا تو بات کریگا اور نا اُن کی تعریف کریگا اور اُن کیلئے شدید عذاب ہوگا: ایک وہ شخص جس کے پاس ضرورت سے زیادہ پانی ہو اور وہ کسی راہگیر کو پانی سے روکے؛ دوسرا وہ شخص جو امام کو بیعت صرف اپنی دنیا (کے مفاد) کیلئے دے، کہ اگر اسے جو چاہئے وہ امام دے تو وہ (بیعت کو) پورا کرے اور اگر نا دے تو (بیعت) پوری نا کرے؛ تیسرا وہ شخص جو کسی (خریدار کو) عصر کے بعد کوئی چیز بیچنے کیلئے یہ کہے کہ میں نے یہ چیز اتنے میں خرید کی تھی، اور خریدار اس پر اعتبار کر لے، جبکہ اُس نے اتنے میں نہیں لی تھی۔ (بخاری و مسلم)

بخاری و مسلم شریف میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے:

((كُنَّا إذا بايعْنا رسول الله ﷺ على السمع و الطاعة يقول لنا فيما استطعت۔))

جب ہم رسول اللہ ﷺ پر سننے اور اطاعت کی بیعت کرتے تو (آپ ﷺ) فرماتے تھے کہ ''جس قدر تم میں استطاعت ہو''۔

بخاری شریف میں جریر بن عبداللہؓ سے روایت ہے:

((بايعت النبي ﷺ على السمع والطاعة،فلقنني فيما استطعت،والنصح لكل مسلم۔))

میں نے نبی ﷺ سے سننے اور اطاعت کرنے کی بیعت کی تو آپ ﷺ نے یہ اضافہ کیا کہ جس قدر استطاعت ہو اور یہ کہ ہر مسلمان کو اچھی نصیحت کرنا۔

جنادہ بن ابی امیہؓ سے روایت ہے:

((دخلنا على عباده بن صامتؓ وهو مريض قلنا أصلحك الله حدّث بحديث ينفعك الله به سمعته من النبيؐ قال:دعانا النبيؐ فبايعناه،فقال:فيما أخذ علينا أن بايعنا على السمع و الطاعة في منشطنا ومكرهنا،و عسرنا و يسرنا،و أثرة علينا،و أن لا ننازع الأمر أهله،قال:إلا أن تروا كفراً بواحاً عندكم من الله فيه برهان۔))

ہم حضرت عبادہ بن صامتؓ کے گھر گئے جب وہ بیمار تھے اور اُن سے کہا کہ اللہ آپ کو شفا دے، ہمیں آپ کوئی ایسی حدیث سنایئے جو آپ نے نبی ﷺ سے سنی ہو، اللہ آپ کو اس کا اجر دیگا، حضرت عبادہ بن صامتؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بلایا اور ہم نے اپنی خوشحالی میں اور سخت حالت میں، اپنی مشکلات میں اور اپنی آسودہ حالی میں اور اپنے مفاد کے برخلاف بات اور صاحب اقتدار سے اس کے امر میں سننے اور اطاعت کرنے کی بیعت کی تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ "جب تک کہ تم کوئی واضح کفر نہ دیکھ لو جس کے بارے میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلیل ہو"

لہٰذا بیعت مسلمانوں کی طرف سے خلیفہ کیلئے ہوتی ہے اور یہ مسلمانوں کا حق ہے، مسلمانوں کے بیعت دینے سے خلیفہ کیلئے خلافت کا انعقاد عمل میں آتا ہے۔ بیعت ہاتھ کے مصافحہ سے ہوسکتی ہے اور تحریری شکل میں بھی ہوسکتی ہے۔ عبداللہ بن دینار فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کو دیکھا کہ جب لوگ عبدالملک کی خلافت پر متفق ہو گئے تو حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے فرمایا: "میں لکھتا ہوں کہ میں، اللہ کے بندے، عبدالملک امیر المومنین کی کتاب اللہ اور نبی ﷺ کی سنت کے مطابق سننے اور حسبِ استطاعت اطاعت کرنے کا اقرار کرتا ہوں"۔ اس کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے بھی بیعت ہوسکتی ہے۔

بیعت کیلئے بالغ ہونا شرط ہے، نابالغ بچے کی بیعت صحیح نہیں ہوتی۔ ابو عقیل زہرہ بن معبد اپنے دادا عبداللہ ابن ہشام سے روایت کرتے ہیں جو حضور ﷺ کے وقت موجود تھے، کہ وہ یعنی دادا اپنی والدہ زینب بنت حمیدؓ کے ساتھ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انکی والدہ نے حضور ﷺ سے دادا کی بیعت لینے کی فرمائش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((هو صغير، فمسح رأسه و دعا له۔))

وہ ابھی بچہ ہے، پھر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کیلئے دعا کی۔ (بخاری)

بیعت کیلئے مخصوص الفاظ متعین نہیں ہیں، البتہ یہ لازم ہے کہ بیعت میں خلیفہ کیلئے اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کی پابندی کا ذکر ہو اور ہر اچھے برے؛ خوشحالی اور تنگدستی میں خلیفہ کی اطاعت کا بیعت دینے والے کی طرف سے وعدہ

ہو۔ بیعت دیتے ہی یا مسلمانوں میں کسی اور کی طرف سے بیعتِ انعقاد ہوتے ہی، بیعت کا طوق مسلمان کی گردن پر امانت ہو جاتا ہے۔ جس کا لوٹایا جانا صحیح نہیں ہوتا۔ یہ ہر مسلمان کا حق ہے کہ وہ خلیفہ سے بیعت کرے اور جب بیعت کر دی گئی تو وہ اُس پر لازم ہوگئی، اب ایک مسلمان اس بیعت سے چاہ کر بھی نہیں لوٹ سکتا۔ بخاری شریف میں حضرت جابر ابن عبداللہؓ سے روایت کہ ایک اعرابی نے حضور ﷺ سے بیعت کی، پھر جب وہ بیمار ہوا تو اس نے کہا "أقلني بيعتي" یعنی مجھے اپنی بیعت سے آزاد کر دیجئے، حضور ﷺ نے انکار کر دیا اور وہ چلا گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((المدينة كالكير تنقي خبثها، و ينْصعُ طيبُها۔))

شہر مدینہ (لوہار کی) بھٹی کی طرح ہے، جو گندگی سے پاک کر دیتا ہے اور اسکی چمک نکھر آتی ہے۔

نافعؒ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے بتایا کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ خَلَعَ يَداً مِنْ طَاعَةٍ لَقِي اللهَ يَومَ القِيَامَة لا حُجَّةَ لَهُ۔))

جو کوئی اطاعت سے دستبردار ہوا، تو وہ اللہ تعالیٰ سے قیامت کے دن یوں ملیگا کہ اس کیلئے کوئی حجت نہیں ہوگی.....(مسلم شریف)

لہٰذا خلیفہ کی بیعت سے پلٹ جانا، اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے ہٹ جانے کے مترادف ہے۔ یہ بات بیعت انعقاد اور بیعتِ اطاعت دونوں پر منطبق ہوتی ہے، البتہ اگر کسی کو شروع میں بیعت دی گئی اور مسلمانوں کی اس شخص کو رضا نہ ملی جس کے سبب وہ خلیفہ نہ بن پایا تو ایسے شخص کو اختیار ہے کہ وہ اپنی بیعت سے آزاد ہو جائے کیونکہ جس شخص کو بیعت دی گئی تھی وہ عوام کی تائید اور بیعت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے خلیفہ نہیں بنا۔ حدیث شریف میں جس بیعت کی واپسی کی ممانعت آئی ہے وہ خلیفہ کی بیعت ہے نہ کہ اُس شخص کی جو خلیفہ نہ بن پایا۔

خلافت کی طلب

خلافت کی طلب کرنا اور اس کیلئے کوشش کرنا تمام مسلمانوں کیلئے جائز ہے، اس میں کوئی کراہت نہیں ہے اور نہ ہی کوئی متنِ شرعی اس سے ممانعت میں وارد ہوا ہے۔ بلکہ یہ ثابت ہے کہ حضور ﷺ کی تدفین سے پہلے مجلس بنی ساعدہ میں مسلمانوں نے خلافت کیلئے اپنے اپنے دعوے پیش کئے تھے۔ اسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ (حضرت عمرؓ کے بعد) چھ جلیل القدر صحابہؓ نے دیگر تمام صحابہؓ کے سامنے خلافت پر مقابلہ کیا اور کسی بھی صحابی نے اِس مقابلہ آرائی سے منع نہیں کیا بلکہ اِس کو قبول کیا، لہٰذا یہ صحابہؓ کا ایسے مقابلہ کے جواز کا، اور خلافت کی طلب، اس کیلئے کوشش، اور اسے حاصل کرنے کیلئے منظّم مہم چلانا اور اپنی رائے سامنے رکھنے (Campaign) کا اجماع ٹھہرا۔ جہاں تک اُن احادیث کا معاملہ ہے جو خلافت طلب کرنے کی ممانعت میں وارد ہوئی ہیں، تو وہ ضعیف لوگوں (جن میں حضرت ابو ذر غفاریؓ ہیں) کیلئے ہیں جو امارت کیلئے موزوں

نا ہوں۔لیکن وہ لوگ جو امارت کے اہل ہیں،تو اُن کیلئے خلافت کی طلب جائز ہے،جس کی دلیل بنی ساعدہ کی مجلس کے واقعے اور حضرت عمرؓ کے بعد چھ جلیل القدر صحابہؓ کے عمل سے ملتی ہے۔اس طلب سے ممانعت کرنے والی احادیث اُن لوگوں کیلئے مخصوص ہیں جو امارت یا خلافت کے اہل نہ ہوں،لیکن جو اہل ہیں اُن کیلئے اللہ کے رسول ﷺ نے اس طلب سے ممانعت نہیں فرمائی اور اُنہیں والی بھی بنایا۔آپ ﷺ نے ایسے لوگوں کو بھی والی بنایا جنہوں نے اپنے لئے یہ طلب کیا تھا،لہٰذا آپ ﷺ کی طرف سے ممانعت،اُن لوگوں کیلئے ممانعت ہوئی جو اس کے اہل نہ ہوں،نا کہ طلب کی مطلق ممانعت ہوئی۔

خلیفہ کی تقرری کا طریقہ

جس طرح شریعت نے امّت پر خلیفہ کے تعین کو فرض قرار دیا ہے،اسی طرح شریعت نے وہ طریقہ بھی طے کر دیا ہے جس سے خلیفہ کا تقرر عمل میں آتا ہے۔یہ طریقہ،اللہ تعالیٰ کی کتاب،اللہ کے رسول ﷺ کی سنّت اور صحابہؓ کے اجماع سے ثابت ہے۔یہ بیعت کا طریقہ ہے۔اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سے کی گئی بیعت سے خلیفہ کی تنصیب عمل میں آتی ہے۔مسلمانوں کے حضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت دئے جانے سے،اور آپ ﷺ کے امام کو بیعت دینے کے حکم سے یہ طریقہ ثابت ہوتا ہے۔مسلمانوں کی حضور ﷺ کو بیعت،آپ ﷺ کی رسالت پر بیعت نہیں تھی بلکہ یہ حکومت اور اطاعت کی بیعت تھی،کیونکہ یہ بیعت فعل وعمل کی بیعت تھی نہ کہ آپ ﷺ کی رسالت کی تصدیق کی بیعت۔آپ ﷺ کی بیعت ایک حاکم کے اعتبار سے بیعت کی گئی تھی نہ کہ ایک نبی یا رسول کے لحاظ سے کیونکہ آپ ﷺ کی نبوت اور رسالت کا اقرار ایمان سے متعلق ہے نہ کہ بیعت سے،لہٰذا حضور ﷺ کی بیعت صرف اس اعتبار سے تھی کہ آپ ﷺ ریاست کے امیر ہیں۔بیعت کا ذکر قرآن و احادیث میں آیا ہے،اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللهِ شَيْئاً وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِيْنَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ﴾

اے نبی ﷺ،جب مومن عورتیں تمہارے پاس آکر تم سے اس پر بیعت کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرینگی اور نہ چوری کرینگی،نہ زنا کرینگی،نہ اپنی اولاد کو قتل کرینگی اور نہ اپنے ہاتھوں اور پیروں کے درمیان کوئی بہتان گھڑ لائینگی،اور نہ کسی امر معروف میں تمہاری نافرمانی کرینگی،تو اُن سے بیعت لے لو۔

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم:سورۂ ممتحنہ:۱۲)

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللهَ يَدُ اللهِ فَوقَ أَيدِيهِمْ﴾

(اے نبی ﷺ) وہ لوگ جو تم سے بیعت کرتے ہیں وہ تو حقیقت میں اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں، اُن کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: فتح:۱۰)

بخاری شریف میں اسمٰعیل سے، پھر مالک سے، اُن کے توسط سے یحیٰی ابن سعید، پھر عبادہ ابن ولید نے حضرت عبادہ ابن الصامتؓ سے نقل کیا ہے:

((بايعنا رسول الله ﷺ على السمع و الطاعة في العسر واليسر والمنشط والمكره، وأن لا ننازع الأمر أهله، وأن نقوم أو نقول بالحق حيث ما كنا، لا نخاف في الله لومة لائم۔))

ہم نے رسول اللہ ﷺ پر اس بات کی بیعت کی کہ ہم مشکلات میں اور آسانیوں میں، اور خوشحالی میں اور سخت حالات میں سنیں گے اور اطاعت کرینگے، اور ہم صاحب اقتدار سے اس امر میں تنازعہ نہیں کرینگے، اور ہم ہر موقع اور جگہ حق کہیں گے اور حق کا ساتھ دینگے، اور اللہ کے معاملے میں کسی سے خوف زدہ نہیں ہونگے۔

بخاری شریف میں علی بن عبداللہ کی عبداللہ ابن یزید اور پھر سعید ابی ایوب سے پھر، ابو عقیل زہرہ بن معبد اپنے دادا عبداللہ ابن ہشام سے روایت کرتے ہیں جو حضور ﷺ کے وقت موجود تھے، کہ وہ (یعنی دادا) اپنی والدہ زینب بنت حمید کے ساتھ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انکی والدہ نے حضور ﷺ سے (دادا کی) بیعت لینے کی فرمائش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((هو صغير، فمسح رأسه و دعا له۔))

وہ ابھی بچہ ہے پھر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کیلئے دعا کی۔ (بخاری)

بخاری شریف ہی میں عبدان، ابی حمزہ سے، وہ الاعمش سے، پھر ابی صالح سے حضرت ابی ہریرہؓ کی روایت نقل کرتے ہیں:

((ثلاثة لا يكلمهم الله يوم القيامة ولا يزكيهم ولهم عذاب أليم: رجلٌ على فضل ماء بالطريق يمنع منه ابنِ السبيل؛ و رجلٌ بايع اماماً لا يبايعه إلا لدنياه، إن أعطاه ما يريد وفىَ لهُ، وإلا لم يفِ لهُ؛ و رجلٌ يبايع رجلاً بسلعة بعد عصر فحلف باللهِ لقد أُعْطي بها كذا و كذا فصدقه فأخذها ولم يعط بها۔))

تین قسم کے لوگ ایسے ہونگے جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نا تو بات کریگا اور نا اُن کی تعریف کریگا اور اُن کیلئے شدید عذاب ہوگا: ایک وہ شخص جس کے پاس ضرورت سے زیادہ پانی ہو اور وہ کسی راہگیر کو پانی سے روکے؛ دوسرا وہ شخص جو امام کو

بیعت صرف اپنی دنیا (کے مفاد) کیلئے دے، کہ اگر اسے جو چاہئے وہ امام دے تو وہ (بیعت کو) پورا کرے اور اگر نا دے تو (بیعت) پوری نا کرے؛ تیسرا وہ شخص جو کسی (خریدار کو) عصر کے بعد کوئی چیز بیچنے کیلئے یہ کہے کہ میں نے یہ چیز اتنے میں خریدی تھی، اور خریدار اس پر اعتبار کر لے، جبکہ اُس نے اتنے میں نہیں لی تھی۔ (بخاری و مسلم)

یہ تمام احادیث صراحت سے یہ ثابت کرتی ہیں کے خلیفہ کے مقرر کئے جانے کا طریقہ بیعت کے ذریعہ ہی ہے۔ حضرت عبادہؓ کی روایت میں آیا کہ اُنہوں نے حضورؐ پر سننے اور اطاعت کرنے کی بیعت کی، جو ایک حاکم کیلئے ہوتی ہے۔ پھر عبداللہ ابن ہشام والی حدیث میں اُنکی بیعت لینے سے آپ ﷺ کا یہ وجہ بتا کر انکار کہ وہ ابھی چھوٹے ہیں، اسی بات کی دلیل ہوا کہ یہ بیعت حکومت کی بیعت ہے۔ حضرت ابی ہریرہؓ کی حدیث امام کی بیعت ہونے پر دلالت کرتی ہے؛ اس حدیث میں لفظ 'امام' نکرہ ہے یعنی بغیر 'ال' کے جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس میں کسی ایک امام کی تخصیص نہ ہو کر یہ کسی بھی امام کیلئے عام ہے۔ مسلم شریف میں عبداللہ ابن عمرو بن العاصؓ سے روایت نقل کی ہے:

((.....ومن بايع اماماً فأعطاه صفقة يده و ثمرة قلبه فليطعه إن إستطاع، فإن جاء آخر ينازعه فاضربوه عنق الآخر))

جو کوئی ایک امام کے ہاتھ پر، دل سے بیعت دے، سو وہ اسکی اطاعت حسبِ استطاعت کرے، اور اگر کوئی دوسرا آ کر خلیفہ سے تنازعہ کرے، تو اسکی گردن اُڑا دے۔

مسلم شریف ہی میں حضرت ابی سعید الخذریؓ سے روایت ہے:

((إذا بويع لخليفتين فأقتلوا الآخر منهما))

اگر دو خلیفاؤں پر بیعت ہو جائے تو دوسرے کو قتل کر دو۔ (بروایت مسلم شریف)

مسلم شریف میں ابی حازمؒ کی روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں پانچ سال حضرت ابو ہریرہؓ کے ساتھ رہا اور اُن سے حضور ﷺ کے بارے میں سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((كانت بنو إسرائيل تسوسهم الأنبياء'كلما هلك نبيٌ خلفه نبي' و إنه لا نبي بعدي'و ستكون خلفاء فتكثر'قالوا فما تأمرنا؟ قال: فوا ببيعة الأول فالأول' و أعطوهم حقهم'فإن الله سائلهم عما استرعاهم۔))

بنی اسرائیل پر انبیاء علیہم السلام حکومت کیا کرتے تھے، جب ایک نبی کا انتقال ہو جاتا تو دوسرا اسکی جگہ لے لیتا تھا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، خلفاء ہونگے اور بہت سے ہونگے۔ پوچھا گیا کہ ہمارے لئے تب کیا حکم ہے؟ فرمایا: اُن سے اپنی بیعت پوری کرو اور اُن کو اُن کا حق دو، اللہ (خود) اُن سے اس بارے میں محاسبہ کریگا جو اُن کے ذمہ کیا تھا۔

اس طرح یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن حکیم اور احادیث رسول ﷺ اس امر میں بالکل صریح ہیں کہ خلیفہ کو مقرر کئے جانے کا طریقہ بیعت ہی ہے۔ اس بات کو تمام صحابہ کرامؓ سمجھتے تھے، اور اسی پر اُن کا عمل تھا۔ پس حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خصوصی بیعت سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوئی اور پھر بیعت عام مسجد نبوی میں عمل میں آئی۔ اُس وقت بھی جو مسجد نبوی میں موجود نہ تھا، اُس نے بعد میں بیعت کی، جن میں سیدنا علی ابن ابی طالبؓ بھی شامل ہیں۔ اسی طرح حضرت عمرؓ سے مسلمانوں نے بیعت کی؛ حضرت عثمانؓ سے مسلمانوں نے بیعت کی اور اسی طرح پھر حضرت علیؓ کی بیعت ہوئی۔ لہٰذا بیعت ہی مسلمانوں کے خلیفہ کے تقرر کا ایک واحد طریقہ ہوا۔

اب بیعت کے عملی طریقے پر غور کریں تو یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی وفات کے فوراً بعد چاروں خلفاء راشدین کی بیعت سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ یعنی حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی بیعت سے۔ تمام صحابہ کرامؓ نے اس کو خاموشی سے قبول کیا، اور یہ بات بعید از قیاس ہے کہ وہ اس پر شریعت کے خلاف ہونے کی صورت میں راضی ہوت جاتے، کیونکہ یہ نہایت ہی اہم معاملہ تھا جس پر اسلامی حکومت کا بقاء منحصر تھا۔ جو کوئی خلفاء راشدین کے تقرر کے حالات پر غور کرے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مجلس بنی ساعدہ میں جب یہ معاملہ زیر غور تھا تو اُس وقت خلافت کے یہی چار امیدوار تھے، یعنی حضرت سعدؓ، حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ، اِن کے علاوہ اور کوئی خلافت کا امیدوار نہ تھا۔ وہاں کی بحث کے بعد حضرت ابوبکرؓ پر اتفاق رائے سے بیعت ہوئی، اور دوسرے دن مسجدِ نبوی میں مسلمانوں کو بلایا گیا جہاں اُنہوں نے بیعت کی۔ بنی ساعدہ کی مجلس کی بیعت، بیعتِ انعقاد تھی جس سے خلیفہ کا انعقاد عمل میں آ گیا، پھر دوسرے دن مسجدِ نبوی میں بیعت ہوئی جو بیعت اطاعت تھی۔ جس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے محسوس کیا کہ اُن کی علالت جان لیوا ہے تو اُنہوں نے مسلمانوں کے خلیفہ کے تقرر پر مشورے کیلئے لوگوں کو بلوایا، اُس وقت لوگوں کی رائے حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ کے بارے میں تھی، تیسرا کوئی نہیں تھا۔ یہ مشورہ تین مہینے چلا۔ جب یہ پورا ہوا، اور حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں کی رائے جان لی، تو آپ نے اعلان کیا کہ اب مسلمانوں کے خلیفہ حضرت عمرؓ ہونگے۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے فوراً بعد مسلمانوں نے مسجد آ کر حضرت عمرؓ سے بیعت کی، جس سے وہ خلیفہ مقرر ہوئے، نہ کہ مشوروں سے یا حضرت ابوبکرؓ کے اعلان سے۔ جب حضرت عمرؓ کو خنجر سے زخمی کیا گیا، تو لوگوں نے اُن سے کہا کہ وہ خلیفہ مقرر کر دیں، جس پر حضرت عمرؓ نے انکار کیا، لیکن لوگوں کے اصرار پر اُنہوں نے یہ معاملہ چھ اشخاص کو نامزد کر کے اُن پر چھوڑ دیا۔ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد اِن چھ اشخاص نے اپنے میں سے ایک کو، یعنی حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کو نامزد کیا کہ وہ مسلمانوں سے مشورے کریں اور اُن کی رائے جانیں۔ پھر حضرت عثمانؓ کی بیعت کا اعلان ہوا اور مسلمانوں نے حضرت عثمانؓ سے بیعت کی، جس کے نتیجہ میں حضرت عثمانؓ خلیفہ مقرر ہوئے، نہ کہ حضرت عمرؓ کے نامزدگان میں سے ہونے کے

سبب یا حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے اعلان سے۔ پھر حضرت عثمانؓ کا قتل ہوا، اور مدینہ اور کوفہ کے مسلمانوں نے حضرت علیؓ سے بیعت کی جس کے نتیجہ میں حضرت علیؓ خلیفہ بنے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ خلافت کے تعین کیلئے اسلام نے جو طریقہ طے کر دیا ہے وہ مسلمانوں کی مرضی اور اُن کے اختیار سے بیعت کا طریقہ ہے۔

اب اگر اُن عملی طریقوں پر غور کریں جن سے خلیفہ کی تنصیب، اس کی بیعت ہونے سے پہلے عمل میں آتی ہے تو اس کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، جیسا کہ خلفاء راشدین کے ساتھ ہوا کہ کسی بھی خلیفہ کیلئے جو صورت عملاً ہوئی، وہ دوسرے خلیفہ کے ساتھ صورتِ حال سے مختلف تھی۔ نیز یہ کہ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اِن مختلف اسالیب کے شاہد رہے اور قبول کیا۔ لہٰذا یہ صحابہؓ کا اجماع ٹھہرا کہ خلیفہ کے تعین کیلئے کسی ایک معین شکل کا التزام ضروری نہیں، چنانچہ خلیفہ کے تعین کیلئے کئی شکلیں ہوسکتی ہیں جن میں مثلاً مندرجہ ذیل اشکال ہیں:

> ا- ریاستِ اسلامی میں مرکز کے لوگ یا وہاں کے اہل حل وعقد، یا وہ جو عوام کی اکثریتِ رائے کے نمائندے ہوں یا وہاں کی نامی گرامی شخصیات، پچھلے خلیفہ کے انتقال، اسکی برطرفی یا اسکے خود عہدہ چھوڑ دینے کی صورت میں جمع ہوں اور ایک یا ایک سے زیادہ اشخاص کو خلافت کیلئے نامزد کر دیں، پھر کسی بھی طریقہ سے اُن میں سے ایک کو چن کر اُس پر قرآن اور سنت رسولؐ سے سننے اور اطاعت کی بیعت کریں۔ اس بیعتِ انعقاد کے مکمل ہوجانے کے بعد وہ شخص یا اُس کا نمائندہ مسلمانوں سے بیعتِ اطاعت حاصل کرے۔

حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے وقت یہی ہوا تھا کہ انصار اپنے سردار حضرت سعد ابن عبادہؓ پر بیعت کرنے کیلئے مجلسِ بنوساعدہ میں جمع ہوئے، پھر قبل اس کے کہ حضرت سعدؓ پر بیعت ہوتی، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ وہاں پہنچے اور سب کے مابین گفتگو ہوئی جو کبھی گرما گرم بھی رہی، اور معاملہ حضرت ابوبکرؓ کی حمایت میں طے ہوگیا، پھر تمام لوگوں نے جو اُس مجلس میں موجود تھے سوائے حضرت سعد ابن عبادہؓ کے، حضرت ابوبکرؓ پر بیعت کی۔ سقیفۂ بنی ساعدہ کی اس بیعت سے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس مجلس بنی ساعدہ کے احوال حسبِ ذیل ہیں:

سیرت ابن ہشام میں ابن اسحٰق کے حوالہ سے بنی ساعدہ کے اس وقت کے احوال درج ہیں جب وہاں انصار صحابہ جمع ہوئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن ابی بکرؓ، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے بیان کیا:

حضور ﷺ کی وفات کے وقت ہمیں خبر ہوئی کہ انصار صحابہ بنوساعدہ میں اپنے اکابرین کے ساتھ جمع ہوئے جس کی ہمیں کوئی خبر نہیں تھی۔ حضرت علی ابن ابی طالبؓ اور حضرت زبیر بن العوامؓ اور اُن کے ساتھی بھی ہم سے علیحدہ رہے اور مہاجرین حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ جمع ہوئے تو میں نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ ہم اپنے انصار بھائیوں کے پاس چلیں، پھر ہم روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ ایک شخص اوڑھے لپٹے ہوئے ہے، میں پوچھا کہ یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ سعد ابن عبادہؓ ہیں۔ میں نے پوچھا کہ اُنہیں کیا ہوا ہے؟ بتایا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پھر ہم بیٹھ گئے، اُن کے خطیب نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی جیسا کہ اُس کا حق ہے پھر کہا: **أما بعد**: ''ہم انصار اللہ، اور اسلام کے فوجی ہیں، اور اے مہاجرین تم ہمارا جز ہو۔ اور تمہاری قوم کے کچھ لوگ یہاں داخل ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ہمیں نظر انداز کر کے معاملہ (امر) اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں''۔ جب وہ ذرُکا تو میں (حضرت عمرؓ) بولنا چاہتا تھا اور میں نے اپنے پسند کی بات سوچ کر ذہن میں تیار کر لی تھی۔ میں اپنا غصہ چھپا کر پہلے حضرت ابوبکرؓ سے کچھ کہنا چاہتا تھا، کیونکہ مجھے اُنہیں غصہ دلانا گوارا نہیں تھا، حضرت ابوبکرؓ نے کہا: ''اے عمر صبر کرو''۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے بولنا شروع کیا، وہ مجھ سے زیادہ ذی علم اور محترم تھے، اُنہوں نے بخدا کوئی وہ بات نہ چھوڑی جو میں کہنا چاہتا تھا، یا اُنہوں نے وہی کہا یا اُس سے بہتر، پھر ذرا وہ چپ ہوئے، اور پھر فرمایا: ''ابھی تم نے جو اپنی اچھائیوں اور خیر کا ذکر کیا، تو تم اُسکے مستحق ہو، لیکن عرب اس معاملہ (اقتدار) کو سوائے قریش کے کسی اور میں تسلیم نہیں کرینگے۔ قریش نصب اور مقام کے اعتبار سے موزوں ہیں۔ میں تمہارے لئے دو آدمی پسند کرتا ہوں، تم چاہے جس کو اُن میں سے بیعت دے دو''۔ پھر اُنہوں نے میرا (حضرت عمرؓ) اور حضرت ابی عبیدہ بن الجراحؓ کا ہاتھ پکڑ لیا، جبکہ وہ ہمارے درمیان بیٹھے تھے۔ مجھے اُن کی یہ بات بہت بری لگی۔ میرے لئے یہ زیادہ مناسب تھا کہ میں مارا جاؤں لیکن اس گناہ کا مرتکب نہ بنوں کہ ایک ایسی قوم کا امیر بنایا جاؤں جس میں ابوبکرؓ شامل ہوں۔ پھر انصار میں سے ایک شخص نے کہا: ''اے اہل قریش! میں اس کا سب سے زیادہ اہل اور تجربہ کار ہوں تو تم سے میں ایک امیر اور ہم میں سے ایک امیر بنالیا جائے''۔ پھر شور اُٹھنے لگا اور آوازیں بلند ہونے لگیں، مجھے (حضرت عمرؓ کو) خوف ہوا کہ اب کہیں تنازعہ نہ ہو جائے تو حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ آپ اپنا ہاتھ بڑھایئے، اُنہوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کی، پھر مہاجرین نے بیعت کی اور پھر انصار نے بیعت کی۔ (اس بھیڑ میں) ہم سعد ابن عبادہؓ کے اوپر سے گزر گئے تو کسی نے کہا کہ تم نے سعدؓ کو مار دیا تو میں نے کہا اللہ سعدؓ کو مارے۔

علامہ ابن کثیر نے بھی سیرۃ النبی میں اسی طرح روایت کیا ہے۔

طبری کی روایت میں ہے کہ حضرت عبیدہ بن الجراحؓ نے اس بحث کے دوران بڑے نازک موقع پر مداخلت کی اور کہا:

يا معشر الأنصار! كُنتم أوّلَ مَن نصر و آزر، فَلا تكونواْ اوّلَ مَن بدّلَ وَ غَيَّرَ

اے اہل انصار! تم پہلے لوگ تھے جنہوں نے مدد اور حمایت کی، تو تم پہلے وہ لوگ نا بنو جو بدل گئے اور پھر گئے۔

جب انصار نے ابی عبیدہؓ سے دانائی کے یہ الفاظ سنے تو بہت متاثر ہوئے اور خزرج کے ایک سردار بشیر ابن سعدؓ کھڑے ہوئے اور کہا:

إنا و الله وإن كُنّا أولي فضيلة في جهاد المشركين، و سابقة في هذا الدين، ما أردنا به إلا رضا ربنا، و طاعة نبينا، والكدح لأنفسنا، فما ينبغي لنا أن نستطيل على الناس بذٰلك، ولا نبتغي من الدنيا عرضاً، فإنَّ الله ولّي النعمة علينا بذٰلك. ألا إنَّ محمداً صلى الله عليه و سلّم مِن قريش، و قومه أحق به و أولى. وأيْمُ الله لا يراني الله أنازعهم في هذا الأمر أبداً. فاتقوا ولا تخالفوهم ولا تنازعوهم.

خواہ ہم مشرکین سے جہاد میں افضل رہے ہوں، اور چاہے ہم اس دین میں آنے والوں میں پہلے ہوں، اس سے ہمارا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنے ربّ کی رضا و خوشنودی حاصل کریں اور اپنے نبی ﷺ کی اطاعت کریں اور اپنے بھلے کیلئے کریں، ہم یہ نہیں چاہتے کہ یہ معاملہ لوگوں کیلئے اور طویل کیا جائے، اور نا ہی ہمیں اس سے کوئی دنیوی مفاد حاصل کرنا ہے، اللہ ہی ہمارے لئے نعمتیں دینے والا ہے۔ یقیناً محمد ﷺ قریش میں سے ہیں اور اُن کی قوم زیادہ موزوں اور مستحق ہے۔ اللہ کی قسم! میں یہ نہیں چاہتا کہ اللہ مجھے اس حال میں دیکھے کہ میں اس معاملے میں قریش سے تنازعہ کروں، اللہ سے ڈرو اور اُن کی مخالفت نا کرو، نا ہی اُن سے تنازعہ کرو۔

بشیرؓ کے یہ الفاظ نہایت دل گداز تھے جن سے اہل خزرج مطمئن ہو گئے۔

اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ اور حضرت ابی عبیدہؓ کا ہاتھ پکڑا جن کے درمیان وہ بیٹھے تھے اور انصار سے کہا: ''یہ عمرؓ ہیں اور یہ ابی عبیدہؓ، اُن میں سے تم جس سے چاہو بیعت کر لو''۔ پھر اُنہیں اتحاد سے رہنے کی تلقین کی اور تفرقہ سے دور رہنے کو کہا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس شور و غُل سے خوف ہوا کہ کہیں یہ اختلاف نہ بڑھ جائے اس لئے وہ اُٹھے اور اُنہوں نے آواز بلند کر کے کہا: ''لے ابا بکرؓ اپنا ہاتھ بڑھایئے''۔ حضرت ابوبکرؓ نے ہاتھ بڑھایا اور حضرت عمرؓ نے یہ کہتے ہوئے بیعت کر لی:

الم يأمر النبي ﷺ بأن تصلي أنت يا أبا بكر رضي الله عنه بالمسلمين، فأنت خليفة رسول الله، فنحن نبايعك لنبايع خير مَن أحب رسول اللهؐ منا جميعاً.

اے ابی بکرؓ کیا خود نبی ﷺ نے آپ کو مسلمانوں کی نماز میں امامت کا حکم نہیں دیا تھا؟ لہٰذا آپ ہی رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ ہیں اور ہم آپ پر بیعت کرتے ہیں، ہم نے ایسے شخص پر بیعت کی جو اللہ کے رسول ﷺ کو ہم سب سے زیادہ عزیز تھا۔

پھر حضرت ابوعبیدہؓ نے ہاتھ آگے بڑھایا اور یہ کہتے ہوئے بیعت کی:

إنك أفضل المهاجرين، و ثاني اثنين إذهما في الغار و خليفة رسول الله على الصلاة، أفضل دين المسلمين، فمَن ذا ينبغي له أن يتقدمك، أو يتولى هذا الأمر عليك؟۔

آپ مہاجرین میں سب سے بہتر ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے غار کے ساتھی ہیں، آپ ہی نے نماز میں حضور ﷺ کی جگہ امامت کی، مسلمانوں کے دین میں آپ ہی سب سے بہتر ہیں، کون ہے جو آپ سے اس معاملہ میں مقدم ہو؟۔

بشیر ابن سعدؓ نے فوراً حضرت ابوبکرؓ پر بیعت کی، قبیلہ اَوس کے سردار اسید ابن حضیرؓ نے اپنی قوم کی طرف دیکھا جو بشیر ابن سعدؓ کے الفاظ ابھی ابھی سن چکے تھے، پھر اُن سے کہا: ''اللہ کی قسم اگر ایک بار خزرج کو حکومت مل گئی تو یہ تم سے برتر ہو جائینگے اور تمہارا اِس میں کوئی حصہ نہ ہوگا، اُٹھو اور ابوبکرؓ کو بیعت دو''۔ قبیلہ اَوس پھر حضرت ابوبکرؓ پر بیعت کرنے کیلئے ایسا جھپٹا کہ کہ بنی ساعدہ کی مجلس چھوٹی پڑ گئی۔

اس طرح سقیفہ کی یہ بیعت مکمل ہوئی، جبکہ ابھی حضور ﷺ کا جسم اطہر دفن نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد لوگ سقیفہ سے منتشر ہو گئے۔ اگلے روز حضرت ابوبکرؓ مسجد نبوی میں بیٹھے تھے جب حضرت عمرؓ نے عوام کو مخاطب کر کے پہلے اپنی پچھلے دن کی بات پر معذرت چاہی جب اُنہوں نے حضور ﷺ کی وفات سے انکار کیا تھا، پھر فرمایا:

و إنَّ اللـهَ أبقى فيكُم كتاب الله الذي هدى به رسولهِ فإن اعتصم به هداكم الله، كما هداه به، و إن الله قد جمع أمركُم على خيركم، صاحب رسول اللهؐ و ثاني اثنين إذهما في الغار۔ فقوُموا فبايعوا۔

اور بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان اپنی کتاب چھوڑی ہے، جس سے اس کے رسول کو ہدایت ملی، پس اگر اس کے پابند رہو گے تو اللہ تمہیں بھی ہدایت دیگا جیسی اپنے رسول کو دی، اور تمہارا خلافت کا معاملہ تم میں بہترین شخص پر چھوڑا ہے جو کہ اللہ کے رسول ﷺ کے دوست تھے، اور غار ثور میں آپ ﷺ کے ساتھی تو اُٹھو اور بیعت کرو۔

اس کے بعد تمام لوگوں نے بیعت کی اور جب یہ مکمل ہو گئی تو حضرت ابوبکرؓ اُٹھے اور لوگوں سے خطاب کیا:

أمَّا بعد، أيها الناس فَإنِّي قد وُلِّيتُ عليكُم و لَسْتَ بِخَيرِكُمْ، فإن أحسَنْتُ فأعينوني، و إن أسأتُ فقوّموني۔ الصدق أمانة والكذب خيانة، والضعيفُ فيكم قوي عندي حتى

أريح عليه حقه إن شاء الله ۔ والقوى فيكُم ضعيف عندي حتى آخذ الحق منه إن شاء الله۔ لا يدع قوم الجهاد فى سبيل الله إلا ضربهم الله بالذل۔ولا تشيع الفاحشة في قومٍ إلا عمهم الله بالبلاء۔أطيعوني ما أطعت الله و رسوله،فإن عصيتُ الله ورسوله فلا طاعة لي عليكُمْ قوموا إلى صلاتكُم يرحمكُم الله۔

اے لوگو! میں تمہارے اوپر امیر بنایا گیا ہوں حالانکہ میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔تو اگر میں اچھا کروں تو میری مدد کرو اور اگر میں برا کروں تو مجھے صحیح کرو۔سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔جو تمہارے درمیان قوی ہے،وہ میرے نزدیک اس وقت تک کمزور ہے کہ میں اس کا حق اسے نا دلا دوں،اگر اللہ نے چاہا؛اور جو تمہارے درمیان کمزور ہے،وہ میرے نزدیک قوی ہے،تاوقتیکہ میں اس سے جو حق ہے،نہ لے لوں،اگر اللہ نے چاہا۔جو قوم اللہ کے راستے میں جہاد سے منہ پھیر لے،اللہ اسے ذلیل وخوار کریگا۔جس قوم میں فحاشی پنپے،اللہ اُن پر بلائیں نازل کریگا۔جب تک میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کروں،تم میری اطاعت کرو۔اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت لازم نہیں۔نماز کیلئے کھڑے ہو جاؤ،اللہ تم سب پر رحم کریگا۔

یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت اور بیعت کے مختصر احوال تھے۔قریش اور انصار کے درمیان جو اختلاف ہوا،وہ دراصل خلیفہ کی نامزدگی کے موضوع پر تھا۔پھر حضرت ابوعبیدہؓ اور حضرت بشیر ابن سعدؓ کے خطاب کے بعد،رائے عامہ مہاجرین کی جانب غالب ہوگئی۔اس اکثریت رائے سے سقیفہ میں موجود لوگوں میں حضرت ابوبکرؓ پر سوائے حضرت سعد ابن عبادہؓ کے سب نے بیعت دی۔سقیفہ بنی ساعدہ کی یہ بیعت حضرت ابوبکرؓ کی بیعتِ انعقاد تھی،جبکہ اگلے روز مسجدِ نبوی میں جو بیعت ہوئی وہ بیعتِ اطاعت تھی۔

اس طرح حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ بنائے جانے میں یہ بات ظاہر ہوئی کہ مدینہ منورہ کے لوگ،جو کہ پایہ تخت تھا،جمع ہوئے،گفت وشنید ہوئی،گرم بحثیں ہوئیں،اور چار اشخاص نامزد ہوئے،یعنی،حضرت سعد ابن عبادہؓ،حضرت ابوبکرؓ،حضرت عمرؓ اور حضرت ابی عبیدہؓ،پھر رائے عامہ حضرت ابوبکرؓ کے حق میں ہوئی اور اس طرح اُن کے ہاتھ پر بیعت ہوگئی۔

۲۔ خلیفہ جب یہ محسوس کرے کہ اب اُسکی زندگی خاتمہ کے قریب ہے تو وہ خود اپنی پہل سے یا لوگوں کے مطالبہ پر،اس غرض سے مشورے شروع کرے کہ اگلا خلیفہ کون ہوسکتا ہے،پھر وہ عوام سے،اہل حل وعقد سے،عوام کے نمائندوں اور بااثر لوگوں سے رائے لے کہ اُس کے بعد کون خلافت سنبھالیگا۔پھر خلیفہ کے انتقال کے بعد اُس شخص کو بیعت دی جائے،جس سے وہ خلیفہ بن جائیگا،نا کہ پچھلے خلیفہ کی نامزدگی سے۔

حضرت ابوبکرؓ نے جب حضرت عمرؓ کو نامزد کیا تو یہی صورت حال تھی۔ جب اُن کا مرض اتنا بڑھ گیا کہ اُنہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ اب موت قریب ہے تو لوگوں کو جمع کیا اور کہا: ''بے شک اللہ نے مجھ پر یہ بھیجا ہے جو تم محسوس کر رہے ہو (یعنی موت)۔ اس بیماری سے میں صرف اپنی موت ہی دیکھ رہا ہوں۔ اللہ نے تمہیں اپنے عہد سے آزاد کر دیا ہے جو تم نے مجھ سے کیا تھا۔ اور وہ گٹھان کھول دی ہے۔ تمہاری امامت کا معاملہ اب پھر تمہیں لوٹا دیا گیا ہے۔ اب جسے تم پسند کرو اپنے اوپر امیر مقرر کر لو۔ اگر تم میری زندگی میں یہ طے کر لو تو یہ زیادہ مناسب ہوگا تا کہ تم بعد میں اختلاف میں نہ پڑ جاؤ''۔

جب لوگ اس بات پر اتفاق نہیں کر پائے کہ حضرت ابوبکرؓ کے بعد کون خلیفہ ہو، تو وہ آپؓ کے پاس واپس آئے اور کہا: ''اے خلیفہ رسول اللہ! آپکی رائے ہی ہماری رائے ہے''۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: ''شاید تم میری رائے سے اختلاف کرو''۔ لوگوں نے کہا: ''نہیں''۔ پھر آپؓ نے فرمایا: ''تو کیا مجھ سے عہد کرتے ہو کہ میری رائے سے اتفاق کرو گے''۔ لوگوں نے اقرار کیا، پھر آپؓ نے فرمایا: ''مجھے کچھ مہلت دو تا کہ میں یہ سوچ سکوں کہ اللہ، اس کے دین اور اس کے بندوں کیلئے کیا بہتر ہے''۔

اس طرح حضرت ابوبکرؓ کو مجاز بنایا گیا کہ وہ مسلمانوں کیلئے خلیفہ کا انتخاب کریں۔ حضرت ابوبکرؓ کو احساس تھا کہ جلیل القدر صحابہؓ کے کیا خیالات ہیں، آپؓ یہ محسوس کر رہے تھے کہ اُن میں سے ہر ایک خلیفہ بننا چاہتا ہے، لہٰذا اُنہوں نے یہ عہد لیا کہ یہ لوگ آپؓ کی رائے تسلیم کرینگے۔

اس مختار نامہ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے جلیل القدر صحابہؓ سے مشورے شروع کئے، آپؓ نے حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ، حضرت عثمان ابن عفانؓ، حضرت سعید ابن زیدؓ اور حضرت اُسید ابن حضیرؓ سے رازداری میں مشورہ کیا۔ اس وقت آپؓ کے ذہن میں حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے نام تھے، پھر آپؓ کی رائے حضرت عمرؓ پر جم گئی اور تب اُنہوں نے لوگوں سے عام مشورے کئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے گھر سے لوگوں کی طرف دیکھا، آپؓ کی اہلیہ حضرت اسماء بنت عمیسؓ آپؓ کو تھامے ہوئے تھیں، آپؓ نے لوگوں سے خطاب کیا: ''میں جسے اپنا وارث بناؤں تو تم اُس پر راضی ہو؟ میں نے اپنی رائے اختیار کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی اور نا ہی اپنے کسی رشتہ دار کو چنا ہے''۔ لوگوں نے اقرار کیا، آپؓ نے پھر کہنا شروع کیا: ''میں نے حضرت عمر بن الخطاب ﷺ کو چنا ہے، پس اُن کی سنو اور اطاعت کرو''۔ لوگوں نے جواب دیا کہ ہم نے سنا اور قبول کیا۔ اِس پر حضرت ابوبکرؓ نے اپنے ہاتھ اوپر آسمان کی طرف اُٹھائے اور فرمایا: ''اے اللہ! اس سے میرا ارادہ صرف اُن کی بھلائی تھی، مجھے لوگوں میں فتنہ کا خوف تھا پس میں نے وہ کیا جو تو جانتا ہے، میں نے اپنی رائے میں خوب سوچ سمجھ کر اُن پر، اُن میں سب سے بہتر، سب سے قوی اور سب سے زیادہ اُن کا خیال رکھنے والا چھوڑا ہے''۔ لوگوں نے آپؓ کی دعا سنی اور اِس معاملہ میں اُن میں اعتماد پیدا ہو گیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات ہو جانے کے بعد حضرت عمرؓ مسجد نبوی گئے اور وہاں ہر ایک نے آ کر بیعت کی، یہاں تک کہ حضرت طلحہؓ نے بھی کی۔ حضرت عمرؓ صبح سے ظہر تک مسجد ہی میں رہے اور لوگوں کا آ آ کر بیعت دینا جاری رہا، یہاں تک کہ مسجد میں بھیڑ

ہوگئی۔حضرت عمرؓ اُٹھ کر منبر پر گئے لیکن جس سیڑھی پر حضرت ابوبکرؓ کھڑے ہوا کرتے تھے،اُس سے ایک درجہ نیچے کھڑے ہوئے، پھر لوگوں سے مخاطب ہوئے،سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد کی، پھر حضور ﷺ پر درود پڑھا اور حضرت ابوبکرؓ کیلئے تعریفی کلمات ادا کئے، پھر فرمایا:

يا أيها الناس ما أنا إلا رجل منكم،ولو لا أني كرهت أن أرد أمر خليفة رسول الله ما تقلدت أمركم۔

اے لوگو! میں محض تم ہی میں سے ایک شخص ہوں۔اگر مجھے یہ ناگوار نہ ہوتا کہ رسول اللہ کے خلیفہ (حضرت ابوبکرؓ) کا حکم ٹھکراؤں تو میں کبھی تمہارا امیر نہ بنتا۔

پھر آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا:

اللهم إني غليظٌ فَلَيِّنِّي۔اللهم إني ضعيفٌ فقوّني۔اللهم إني بخيلٌ فسخّني۔

اے اللہ! میں سخت مزاج ہوں، مجھے نرم کردے؛ میں کمزور ہوں، مجھے قوت دے؛ میں بخیل ہوں، مجھے سخی کردے۔

پھر ذرا توقف کیا اور فرمایا:

بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے امیر بنا کر تمہیں اور مجھے امتحان میں ڈالا ہے،اور میرے ساتھی کے بعد اب مجھے تمہارے درمیان چھوڑا ہے۔تمہارے معاملات دوسروں تک نہ جائیں،اسکے لئے میں ہر کوشش کرونگا۔اور میں تمہارے معاملات کیلئے بہترین لوگوں کو پابند کرونگا۔اگر اُن لوگوں نے اچھا کیا تو میں اُن کے ساتھ اچھا کرونگا اور اگر برا کیا تو سزا دونگا۔

پھر منبر سے اترے اور نماز پڑھائی۔اس طرح مسجدِ نبوی میں مسلمانوں کی بیعت سے حضرت عمرؓ کی خلافت کا انعقاد ہوا اور مسلمانوں پر اُن کی اطاعت لازم ہوئی۔

جہاں تک حضرت ابوبکرؓ کے ذریعہ حضرت عمرؓ کی نامزدگی کی بات ہے،تو یہ صرف نامزدگی ہی تھی،اس سے ان کی خلافت کا انعقاد نہیں ہوا،نا ہی اس نامزدگی سے مسلمانوں پر اُن کی اطاعت فرض ٹھہری، بلکہ مسجدِ نبوی میں مسلمانوں کے ذریعہ ہوئی بیعت سے آپؓ خلیفہ بنے۔

اس طرز کو دیکھنے سے ظاہر ہوا کہ جس طرح حضرت عمرؓ خلیفہ بنے ،وہ اُس طرز سے مختلف تھے جس سے حضرت ابو بکرؓ مسلمانوں کے خلیفہ بنے تھے۔

۳-تیسری شکل یہ ہوسکتی ہے کہ خلیفہ وقت جب حالتِ نزاع میں ہو تو خود اپنی پہل پر یا مسلمانوں کے کہنے پر خلافت کی قابلیت رکھنے والے کچھ اشخاص کو نامزد کرے کہ وہ اُن لوگوں میں سے ایک

پر مشورے کے بعد اتفاق رائے کریں اور اس شخص کو مسلمانوں کا اگلا خلیفہ منتخب کر لیں۔ اِس کام کیلئے اُنہیں مہلت دی جائے جو زیادہ سے زیادہ تین دن ہو۔ اس دوران وہ اپنے طریقے سے ایک شخص کو چن کر اُس کے نام کا اعلان کر دیں۔ پھر اُس شخص کیلئے بیعت لی جائے۔ اب یہ شخص اس بیعت سے مسلمانوں کا خلیفہ ہوگا نہ کہ نامزد افراد کے انتخاب کر لینے سے۔

حضرت عمرؓ کے وقت یہی ہوا جب اُنہیں خنجر سے زخمی کیا گیا جس سے اُن کی موت واقع ہوئی کہ مسلمان اُن کے پاس آئے اور یہ مطالبہ کیا کہ وہ اپنے بعد کسی کو اپنا جانشین مقرر کر دیں تو آپؓ نے فرمایا کہ میں کسے نامزد کروں؟ اگر ابی عبیدہ بن الجراحؓ زندہ ہوتے تو اُنہیں کر دیتا اور جب میرا ربّ مجھ سے پوچھتا تو کہتا کہ میں نے نبی ﷺ سے سنا تھا:

إنه أمين هٰذه الأمة۔

وہ (حضرت ابی عبیدہؓ) امت کے امین ہیں۔

اگر ابو حذیفہؓ کے غلام سالمؓ زندہ ہوتے تو اُنہیں نامزد کرتا اور جب اللہ مجھ سے پوچھتا تو کہتا کہ میں نے نبی ﷺ سے سنا تھا:

إن سالماً شديد الحب لله۔

بے شک سالمؓ اللہ سے بے حد محبت کرنے والے ہیں۔

پھر ایک مسلمان نے اُن سے کہا کہ اپنے بیٹے عبداللہؓ کو نامزد کر دیجئے تو فرمایا:

قاتلك الله،والله ماأردت الله بهذا۔ويحك!كيف أستخلف رجلًا عجز عن طلاق امرأته؟ لاأرب لنا في أموركم، ما حمدتها لأرغب فيها لأحد من أهل بيتي،إن كان خيراً فإنّا قد أصبنا منه،وإن كان شراً فبحسب آل عمر أن يحاسب منهم رجلٌ واحد،يُسأل عن أمر أمة محمدؐ أما لقد جهدت نفسي وحرمت أهلي، وإن نجوت كفافاً لا وزر ولا أجر،إني لسعيد۔

اللہ تم سے لڑے، بے شک تم اس رائے سے اللہ تعالیٰ کی رضا نہیں چاہتے تھے۔ اللہ تمہیں سمجھے، میں کیسے اُس شخص کو نامزد کر سکتا ہوں جو اپنی بیوی کو طلاق بھی نہ دے پایا۔ ہم میں تمہارے معاملات چلانے کی کوئی تمنا نہیں ہے۔ اور نا میں یہ معاملۂ خلافت اپنے کسی گھر والے کیلئے چاہتا ہوں۔ اگر یہ معاملہ اچھا تھا تو ہمیں اِس میں سے اپنا حصہ مل چکا اور اگر یہ برا تھا تو یہی کافی ہے کہ آل عمرؓ میں سے صرف ایک ہی سے اس کا حساب لیا جائے۔ ایک ہی سے محمد ﷺ کی امت کے

بارے میں سوال ہو۔ میں نے خلافت میں بہت محنت کی اور اپنے اہل وعیال کو محروم رکھا۔ اگر میں صرف اتنا ہی کر پاؤں کہ مجھ پر نہ کوئی گناہ کا بوجھ ہو اور نہ کوئی اجر تو میں راضی ہوں۔

مسلمان وہاں سے نکل آئے تا کہ اس موضوع پر حضرت عمر غور کر سکیں، پھر دوبارہ آ کر وہی مطالبہ کیا کیونکہ اسی میں مسلمانوں کیلئے خیر تھی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں اِن لوگوں کو نامزد کرتا ہوں کیونکہ جب حضور ﷺ نے وفات پائی تو وہ اِن سے راضی تھے اور اِن کے بارے میں کہا تھا کہ یہ اہل جنت ہیں: حضرت علی ابن ابی طالبؓ، حضرت عثمان ابن عفانؓ، حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ، حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ، حضرت زبیر بن العوامؓ اور حضرت طلحہ ابن عبید اللہؓ۔ عبداللہ ابن عمرؓ اِن لوگوں کے ساتھ ہونگے لیکن صرف رائے دینے کی حد تک، اس معاملے میں اُن کا کوئی حصہ نہیں ہوگا''۔ پھر حضرت عمرؓ نے اُن لوگوں کو نصیحت کی کہ وہ خلیفہ کا انتخاب کر لیں اور اُنہیں اس کام کیلئے تین دن کی مہلت دی، اور طویل گفتگو کے بعد اُن سے فرمایا: ''میری موت کے بعد تین دن میں اپنے رائے مشورے مکمل کر لو اور اس دوران صہیبؓ نماز کی امامت کرینگے، اور چوتھے دن اس حال میں نہ آنا کہ تمہارے اوپر امیر نہ ہو''۔ پھر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوطلحہ الانصاریؓ کو اِن چھ افراد کی جماعت کی حفاظت، اور ان کو اپنے کام کی ترغیب دینے پر مقرر کیا اور اُن سے فرمایا: ''اے ابوطلحہ! اللہ نے تم انصاریوں سے اسلام کی مدد فرمائی، انصار کے پچاس آدمی چنو اور اِن چھ لوگوں سے کہو کہ یہ اپنے میں سے ایک کو منتخب کر لیں''۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت المقداد بن الاسود ﷺ کو بلوایا کہ وہ اِن لوگوں کے اجتماع کیلئے جگہ پسند کریں اور اُن سے کہا: ''جب مجھے قبر میں اُتار دو تو اِن لوگوں کو ایک گھر میں جمع رکھو جب تک کہ یہ اپنے میں سے ایک شخص کو چن نہ لیں''۔ پھر حضرت صہیبؓ کو یہ ذمہ داری دی کہ وہ اس اجتماع پر نظر رکھیں، اور فرمایا: ''تین دن تک تم نماز کی امامت کرنا، حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت زبیر، حضرت سعد، حضرت عبدالرحمٰن ﷺ کو جمع رکھنا اور اگر حضرت طلحہؓ تب تک آ جائیں تو اُنہیں بھی شامل کرنا، عبداللہ ابن عمر ﷺ کو صرف کو حاضر رکھنا، لیکن وہ خود امیدوار نہیں ہونگے۔ تم فیصلہ ہونے تک اُن لوگوں کی نگرانی کرنا۔ اگر پانچ لوگ، کسی ایک شخص پر اتفاق کر لیں اور چھٹا اختلاف کرے تو اسکی گردن تلوار سے اُڑا دینا؛ اگر چار لوگ ایک شخص پر متفق ہوں اور دو اختلاف کریں، تو اُن دونوں کو قتل کر دینا؛ اور اگر تین لوگ ایک شخص پر اتفاق کر لیں اور دوسرے تین کسی اور پر متفق ہو جائیں تو عبداللہ ابن عمرؓ سے فیصلہ کروالینا؛ اب جس فریق پر فیصلہ ہو جائے وہ اپنے میں سے ایک شخص چن لے؛ اور اگر عبداللہ بن عمرؓ کے فیصلہ کو نا مانیں، تو پھر اُس فریق کے ساتھ ہو جاؤ جس میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ہوں، اگر وہ اِن لوگوں کے اس فیصلہ سے انحراف کریں تو باقیوں کو قتل کر دینا''۔ اسکے بعد اُن سے اس معاملہ کی بحث میں نا پڑنے کی تاکید کی جب تک کہ انکی (حضرت عمر ﷺ کی) موت نہ ہو جائے۔

حضرت عمرؓ کی وفات اور تدفین کے بعد وہ لوگ جن کو حضرت عمرؓ نے نامزد کیا تھا جمع ہوئے، سوائے حضرت طلحہؓ کے جو اُس وقت موجود نہیں تھے۔ روایت میں ہے کہ ان لوگوں کا اجتماع حضرت عائشہؓ کے گھر پر ہوا اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ ان کے

ساتھ تھے۔ اِن لوگوں نے حضرت ابوطلحہ الانصاری رضی اللہ عنہ کو یہ ذمہ داری سونپی کہ اُن کے اس اجلاس میں کوئی خلل نہ پڑے۔ مجلس شروع ہوئی تو حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ نے کہا کہ تم میں سے کون اپنے آپ کو اس معاملہ (خلافت) سے الگ کرسکتا ہے تاکہ پھر وہ اس مجلس کی صدارت کرے اور باقیوں میں سے بہتر کو خلافت سونپے؟ حضرت عبدالرحمٰنؓ کی اس بات پر سب خاموش رہے اور کسی نے جواب نہیں دیا، اس کے بعد خود حضرت عبدالرحمٰنؓ نے فرمایا کہ میں اپنے آپ کو اس سے الگ کرتا ہوں۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے کہا کہ میں پہلا شخص ہوں جو اس بات سے راضی ہے کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے:

أمينٌ في الأرض أمينٌ في السَّماء

جو شخص زمین پر امانت دار ہے وہ آسماں پر بھی امانت دار ہوگا۔

اس پر حضرت زبیرؓ اور حضرت سعدؓ نے بھی حامی بھر لی، لیکن حضرت علیؓ خاموش رہے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ اے ابا حسن آپ کیا کہتے ہیں؟ حضرت علیؓ نے کہا ''مجھ سے وعدہ کرو کہ تم حق کو ترجیح دو گے، اپنی خواہش نفس کا اتباع نہ کرو گے، اپنے کسی قریبی عزیز کی اس معاملہ میں حمایت نہ کرو گے اور امت کے مفاد کو پیش نظر رکھو گے''۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے کہا: ''تم سب قسم کھاؤ کہ تم سب میرے ساتھ اُس شخص کے خلاف ہو گے جو بدل جائے؛ اور اُس پر راضی ہو گے جسے میں پسند کروں؛ اور میرے اوپر اللہ کی قسم ہے کہ میں اپنے کسی رشتہ دار کیلئے تخصیص کروں اور مسلمانوں کے مفاد کو نظر انداز کروں''۔ سب سے قسم لی گئی اور ویسی ہی قسم دی گئی۔ اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰنؓ نے ایک ایک شخص سے علیحدہ علیحدہ مشورہ کیا اور ہر ایک سے کہتے کہ اگر یہ معاملہ تم سے اُٹھا لیا جائے تو تمہارے خیال میں اس جماعت میں سے اور کون مستحق ہے؟ حضرت علیؓ نے کہا: عثمانؓ؛ حضرت عثمانؓ نے کہا: علیؓ؛ حضرت سعدؓ نے کہا: عثمانؓ؛ حضرت زبیرؓ نے کہا عثمانؓ۔ اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰنؓ نے مدینہ کے اہل حل وعقد سے رائے لی، اور پھر تمام مسلمانوں میں ہر مرد اور ہر عورت سے پوچھا کہ وہ اس جماعت میں سے کس کو چاہتے ہیں، یہاں تک کہ ایک ایک سے پوچھ لیا۔ بعض لوگ حضرت عثمانؓ کے اور بعض حضرت علیؓ کے حق میں تھے، حضرت عبدالرحمٰن نے محسوس کیا کہ رائے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے حق میں بٹی ہوئی ہے اور یہ کہ قریش بہر حال حضرت عثمانؓ کے ساتھ تھے۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ نے جب ایک ایک مرد اور عورت سے مل کر اُن کی رائے معلوم کر لی تو مسلمانوں کو مسجد نبوی بلایا، منبر پر چڑھے، اُن کے پاس تلوار تھی، سر پر حضور ﷺ کا دیا ہوا عمامہ بندھا تھا، قدرے طویل توقف کے بعد لوگوں سے خطاب کیا: ''اے لوگو! میں نے تم سے علانیہ اور رازداری سے تمہارے امام کے بابت پوچھا، تمہاری رائے میں سب سے اونچا مقام حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کا ہے''۔ پھر حضرت علیؓ کی طرف دیکھا اور کہا: ''اے علیؓ میرے پاس آ کر کھڑے ہو'' ! یعنی اے علی اُٹھ کر میرے پاس آؤ۔ حضرت علیؓ اُٹھ کر منبر تک گئے، حضرت عبدالرحمٰن نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا کہ کیا آپ مجھ سے اللہ کی کتاب، رسول اللہ ﷺ کی سنت اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طرزِ حکومت جاری رکھنے کا وعدہ کرتے ہو؟ اس

پر حضرت علیؓ نے فرمایا: ''بخدا نہیں! بلکہ میں اپنے اجتہاد اور علم سے فیصلے کرونگا''۔ یعنی، تمہیں بیعت کرتا ہوں اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت پر جو میرا علم ہے اور اُن میں جو میرا اجتہاد ہے اور جو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا فعل ہے تو میں اُس کا پابند نہیں، میں اپنی رائے سے اجتہاد کرونگا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے اپنا ہاتھ کھینچا اور حضرت عثمانؓ کو پکارا کہ اے عثمانؓ اُٹھ کر میرے پاس آؤ۔ حضرت عثمانؓ اُٹھ کر اُسی جگہ آ کر کھڑے ہوئے جہاں ابھی حضرت علیؓ کھڑے تھے، حضرت عبدالرحمٰنؓ نے اُن سے بھی وہی سوال کیا کہ کیا آپ اللہ کی کتاب، رسول اللہ ﷺ کی سنت اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عمل پر مجھ کو بیعت دیتے ہیں؟ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا: ''کہ ہاں میں بیعت کرتا ہوں حضرت عبدالرحمٰنؓ نے گردن اُٹھا کر چھت کی جانب نظر کی اور حضرت عثمانؓ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا: ''اے اللہ! تو سن رہا ہے اور تیری گواہی پر میں جو میرے اختیار میں دیا گیا ہے، اسے حضرت عثمانؓ کی گردن پر ڈال رہا ہوں''۔ اب حضرت عثمانؓ کو بیعت دینے کیلئے لوگوں کا ہجوم اُمڈ پڑا اور حضرت علیؓ اس بھیڑ کو چیرتے ہوئے آگے آئے اور حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس طرح حضرت عثمانؓ پر بیعت مکمل ہوئی۔

حضرت عثمانؓ کی بیعت کے یہ احوال واضح کرتے ہیں کہ اُن کی بیعت کا عملی طریقہ سابقہ دو بیعتوں یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی بیعت سے مختلف تھا۔

> ۴- ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ سابق خلیفہ کے انتقال پر لوگ، یا اہلِ حل وعقد یا وہ لوگ جو فوج سے متعلق ہیں، ایک شخص سے جو کہ خلافت کی اہلیت رکھتا ہے، یہ مطالبہ کریں کہ وہ خلافت سنبھالے، یہ شخص اس پر راضی ہو، اور عوام کی غالب رائے کو اپنے حق میں محسوس کرے، تو عوام سے اعلانیہ طور پر بیعت حاصل کرے۔ اب اس عام بیعت سے اُسکی خلافت کا انعقاد ہو گیا اور عوام پر اس کی اطاعت واجب ہوئی۔

اِس شخص سے یہ مطالبہ محض اُس شخص کی نامزدگی تصور کیا جائیگا، اور یہ نامزدگی ایک ہی شخص کی ہوئی، اس نامزدگی سے وہ خلیفہ نہیں بنا بلکہ اس کے بعد لوگوں کے اُسے بیعت دینے سے اس کی خلافت کا انعقاد ہوا۔

حضرت علیؓ کی خلافت کے وقت ایسا ہی واقع ہوا، جب حضرت عثمانؓ کو فتنہ انگیزوں نے قتل کیا تو مدینہ میں پانچ دن تک کوئی خلیفہ نہ تھا، مدینہ پر الغافقی بن حرب، جو کہ حملہ آوروں میں سے ہی تھا، اس کی ہی امارت رہی، اِن حملہ آوروں نے ہی حضرت علیؓ سے مطالبہ کیا کہ وہ خلافت سنبھال لیں، لیکن حضرت علیؓ اُن سے کنارہ کشی اختیار کر رہے تھے۔ صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت آپ رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور کہا کہ ''اس شخص یعنی عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا گیا ہے اور یہ لازم ہے کہ مسلمانوں کا کوئی امام ہو۔ ہم آج آپؓ سے بہتر اور مستحق کسی کو نہیں پاتے، آپ تجربہ اور حضور ﷺ سے قرابت داری میں سب سے مقدم ہیں۔ حضرت علیؓ نے منع کیا اور کہا کہ مجھے اس معاملہ میں آگے نالاؤ، میں ایک معاون کیلئے بہتر ہوں نا کہ امیر کیلئے۔ لوگوں نہ کہا کہ خدا کی قسم ہم یہ

نہیں کر سکتے جب تک کہ ہم آپ کو بیعت نہ دیدیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ پھر یہ بیعت مسجد میں ہوگی میں نہیں چاہتا کہ میری بیعت خفیہ ہو۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مجھے خوف تھا کہ مسجد میں لوگ کسی قسم کا ہنگامہ کھڑا نہ کر دیں، لیکن حضرت علیؓ نے اصرار کیا کہ بیعت مسجد ہی میں ہو۔ جب یہ لوگ مسجد میں داخل ہوئے تو مہاجر اور انصار ساتھ ساتھ گئے اور بیعت کی، پھر تمام عوام نے بیعت دی، حالانکہ اس بیعت میں بنی امیہ اور بعض دیگر صحابہ شریک نہیں ہوئے۔

مسجد میں صحابہ اور دوسرے مسلمانوں کی بیعت سے حضرت علیؓ کی خلافت کا انعقاد عمل میں آیا اور عوام پر حضرت علیؓ کی اطاعت فرض ہوئی۔

حضرت علیؓ کی بیعت کے احوال کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کیلئے ہوئی بیعت، اس سے پہلے کے تینوں خلفاء کی بیعت کے طریقوں سے مختلف تھی۔

۵-اس حال میں کہ خلافت کا وجود ہو، اور مجلس امت موجود ہو جو خلیفہ کو مشورے دیتی ہو اور حکام کا محاسبہ کرتی ہو، تو اس مجلس امت کے اراکین ایسے لوگوں کو نامزد کر سکتے ہیں جو خلافت کے اہل ہوں اور اُن میں خلافت کے انعقاد کی شرائط موجود ہوں۔

جب اراکین مجلس ایسے امیدواروں کی فہرست تیار کر لیں تو اُن کے ناموں کا اعلان کر دیا جائے اور اُن میں سے ایک کو منتخب کرنے کا دن مقرر کر دیا جائے۔ اب یہ انتخاب یا تو امت کی طرف سے ہو یا پھر مجلس امت کے اراکین کی جانب سے، یہ اس بات پر منحصر ہے کہ ریاست کے دستور میں کیا تبنی کیا گیا ہے یعنی کس بات کو اختیار کیا گیا ہے۔ جس امیدوار کو زیادہ ووٹ حاصل ہوں؛ چاہے امت کی طرف سے اگر انتخاب امت نے کیا ہے؛ یا مجلس امت کے اراکین کی طرف سے اگر انتخاب مجلس امت کے اراکین نے کیا ہے؛ تو اُس کے نام کا اعلان کر دیا جائے کہ اس امیدوار کو زیادہ ووٹ حاصل ہوئے ہیں۔ اب مجلس امت کے اراکین اُسے بیعت دینگے جو بیعتِ انعقاد ہوگی اور اس کے بعد تمام مسلمان بیعت اطاعت کرینگے۔

یہ وہ پانچ جائز شکلیں ہیں جن سے مسلمانوں کے خلیفہ کی تنصیب عمل میں آسکتی ہے جبکہ ایک ریاستِ خلافت ہو جس میں اسلام نافذ و جاری ہو رہا ہو۔

اس کے برعکس اگر صورتِ حال یہ ہو کہ ریاست خلافت کا وجود ہی نہ ہو جیسا کہ ۱۹۲۴ء میں خلافت کے مٹا دینے کے بعد سے اب حالت ہے، تو مسلمانوں کے کسی ایک ملک یا خطہ میں یا ایک سے زیادہ ممالک میں، مسلم عوام؛ یا مسلمانوں کی ایک جماعت؛ یا وہاں کے بااثر اشخاص وہاں کی حکومت و اقتدار پر قبضہ حاصل کر کے، وہاں کے حاکم کو جو کافرانہ نظام اور احکام مسلّط کر رہا ہے، برطرف کریں، اس ہدف سے کہ وہاں مکمل اسلامی طرزِ زندگی کا احیاء کرنا ہے، اُن احکام کے مطابق جو اللہ تعالیٰ نے نازل کئے ہیں۔ اب اِن لوگوں کیلئے جنہوں نے اقتدار پر قبضہ کیا ہے، یہ جائز ہے کہ وہ ایک شخص کو خلافت کیلئے نامزد کریں

جس میں انعقادِ خلافت کی شرائط موجود ہوں، اور اُس ملک کے، یا زیادہ ممالک کے اہل حل وعقد سے مطالبہ کریں کہ وہ اس نامزد شخص کو بیعت دیں تا کہ وہ خلیفہ بن سکے۔ اہل حل وعقد اپنی رضا اور اختیار سے جب اللہ کی کتاب اور سنت رسول ﷺ پر اس شخص سے بیعت کرلیں تو اس شخص کی خلافت کا انعقاد عمل میں آجائیگا، اب اُس ملک کے مسلمان اس سے بیعتِ اطاعت کریں، اور یہ خلیفہ بلا تاخیر اسلام کو مکمل طور پر نافذ وجاری کرے۔

اس طرزِ عمل پر اسلامی خلافت کا وجود زندہ ہو جائیگا، اسلام کے احکام ونظام کا احیاء ہوگا اور یہ ملک یا علاقہ دار الاسلام بن جائیگا۔

نامزد کرنا، یا ولی عہد مقرر کرنا:

خلافت کا انعقاد کسی کو محض نامزد کرنے یا اپنا ولی عہد مقرر کردینے سے نہیں ہوسکتا، کیونکہ خلافت دراصل مسلمانوں اور خلیفہ کے درمیان ایک معاہدہ ہے جس میں مسلمانوں کی طرف سے بیعت، اور خلیفہ کی طرف سے اسکی قبولیت شرطِ لازم ہے، جبکہ کسی شخص کو نامزد کرکے ولی عہد مقرر کرنے میں یہ شرط نہیں ہوتی لہٰذا نامزدگی کے ذریعے ولی عہد بنانے سے خلافت کا انعقاد نہیں ہوتا۔ اس طرح اگر ایک خلیفہ دوسرے شخص کو خلیفہ بنا دے تو اس کا معاہدہ صحیح نہیں ہوگا کیونکہ یہ اُس کا حق ہی نہیں تھا۔ کیونکہ خلافت مسلمانوں کا حق ہے نہ کہ خلیفہ کا، لہٰذا مسلمان اپنی مرضی سے جسے چاہیں خلیفہ بنا سکتے ہیں، اور خلیفہ کی جانب سے ایسی یک طرفہ نامزدگی، یعنی کسی کو ولی عہد بنا دینا صحیح نہیں، اسلئے کہ خلیفہ کو اس کا حق ہی نہیں کہ وہ کسی اور کو اپنا ولی عہد بنائے۔ جس چیز پر کسی کا مالکانہ حق نہ ہو، اُس چیز کا کسی کو دے دیا جانا، شرعاً جائز نہیں ہے۔ لہٰذا جب خلیفہ کسی کو ولیعہد بنا کر اقتدار سونپے، خواہ وہ اس کا بیٹا ہو یا عزیز یا اس سے کوئی رشتہ داری بھی نہ ہو، اُس (نئے) شخص سے خلافت کا انعقاد مطلقاً نہیں ہوتا، کیونکہ ایسا معاہدہ کرنا جو کہ مسلمانوں کا حق تھا، یہ اُن کی جانب سے نہیں ہوا چنانچہ یہ باطل ہے۔

اب رہی یہ بات کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو نامزد کیا تھا اور حضرت عمرؓ نے چھ افراد کو نامزد کیا تھا، اور صحابہ کرامؓ اس پر خاموش رہے اور اس کی مخالفت نہیں کی، یہ صحابہ کا اجماع تصور کیا جائیگا، تو اُن حضرات ﷺ کی کی ہوئی نامزدگی، ولیعہد بنانے کے مترادف نہیں تھی اور نہ یہ اس کا جواز ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کسی کو ولیعہد نہیں بنایا، بلکہ مسلمانوں سے مشورہ کیا کہ اُن میں کون خلیفہ ہوگا اور اس مشورے کے بعد حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کو امیدوار نامزد کیا، پھر حضرت ابوبکرؓ کی زندگی ہی میں تین مہینے تک مشورے کرکے مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے حق میں رائے دی۔ پھر حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد لوگوں نے آکر حضرت عمرؓ کو بیعت دی اور اُس وقت حضرت عمرؓ کی خلافت کا انعقاد مکمل ہوا۔ اس بیعت سے پہلے وہ خلیفہ نہیں تھے، نا اُن کی خلافت کا انعقاد، حضرت ابوبکرؓ کے نامزد کردینے سے یا عوام کی اکثریت کی رائے کی تائید سے ہوا، بلکہ اُس وقت ہوا جب مسلمانوں نے بیعت کی اور اُنہوں نے خلافت قبول کرلی۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کا چھ افراد کو نامزد کرنا، دراصل اُن کی طرف

سے چھ امیدواروں کی نامزدگی تھی، جو مسلمانوں کے ہی مطالبہ اور اصرار پر حضرت عمرؓ نے کی۔ پھر حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ نے مسلمانوں سے رائے حاصل کی جن میں اکثریت کی رائے یہ تھی کہ اگر حضرت علیؓ، خلفاء سابقین یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے افعال کے پابند رہیں تو وہی خلیفہ ہوں اور نہیں تو پھر حضرت عثمانؓ خلیفہ بنیں۔ حضرت علیؓ نے ایسی پابندی سے انکار کیا اور اس طرح حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ نے حضرت عثمانؓ کو بیعت دی اور پھر لوگوں نے بیعت دی۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا انعقاد عوام کی اس بیعت سے ہوا، نہ کہ حضرت عمرؓ کے ذریعہ امیدوار بنائے جانے سیاور نہ ہی لوگوں کی طرف سے پسند کئے جانے سے۔ اگر لوگوں نے بیعت نہ دی ہو، یا اُنہوں نے اسے قبول نہ کیا ہو تو خلافت کا انعقاد نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ لازم ہے کہ مسلمان بیعت دیں، ولیعہد کو نامزد کرنا صحیح نہیں، یہ معاہدہ اقتدار کا معاہدہ ہے اور اس کو اُن شرائط پر کھرا اترنا لازم ہے جو معاہدوں کیلئے ہوتی ہیں۔

ولیعہد بنایا جانا:

نظامِ اسلام میں ولیعہد کی نامزدگی ایک منکر فعل ہے اور یہ اصولاً اسلامی نظام کے خلاف ہے کیونکہ اس نظام میں اقتدار امت کیلئے ہے نہ کہ خلیفہ کیلئے۔ خلیفہ اقتدار میں امت کی نیابت کرتا ہے تو یہ اُس کیلئے کس طرح ممکن ہے کہ وہ یہ اقتدار کسی اور کو سونپ دے؟ حضرت ابوبکرؓ کا حضرت عمرؓ کو نامزد کرنا فی الحقیقت ولیعہد بنانا نہیں تھا، بلکہ امت نے حضرت عمرؓ کو منتخب کیا تھا اور حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کو بیعت دی تھی۔

اس کے باوجود حضرت ابوبکرؓ نے بڑی احتیاط سے کام لیا تھا، جب اُنہوں نے مسلمانوں سے خطاب کیا تو فرمایا کہ کیا تم لوگ اُس شخص سے راضی ہو جسے میں نامزد کروں؟ اللہ کی قسم میں نے اس نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش میں کوئی کسر نا اُٹھا رکھی اور نہ ہی اپنے کسی رشتے دار کو نامزد کیا ہے۔ اسی بنیاد پر حضرت عمرؓ نے جب چھ اشخاص کو نامزد کیا تو اپنے بیٹے کو محض رائے دینے کے لئے رکھا تھا اور وہ بھی اس شرط پر کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کو اس معاملے میں سوائے رائے کے اور کوئی حق نہیں ہوگا، تاکہ ولیعہد بنائے جانے کے جواز کا کوئی شائبہ بھی رہے۔ اس کے برخلاف معاویہ نے جب اپنے بیٹے یزید کو ولیعہد بنایا تو یہ اسلامی نظام کے سراسر خلاف تھا۔ جو اسباب معاویہ کے اس فعل بدعت کے محرک تھے وہ یہ تھے:

۱- معاویہ ریاست کی امارت کو بادشاہت تصور کرتے تھے نا کہ خلافت۔ جب اُنہوں نے صلح کے بعد اہل کوفہ کو مخاطب کیا تو کہا: ''اے اہل کوفہ! میں نے تم سے نماز زکوٰۃ اور حج کیلئے لڑائی نہیں کی، میں جانتا ہوں کہ تم نمازیں پڑھتے ہو، زکوٰۃ ادا کرتے ہو اور حج کرتے ہو۔ لیکن میں تم سے اسلئے قتال کرتا ہوں کہ تمہارے اوپر حکومت کروں اور تمہاری گردنوں پر (سوار) ہوں۔ اور اللہ نے مجھے یہ حکومت دے

دی ہے حالانکہ تم اس سے راضی نہیں ہو۔اس فتنہ میں جو خون بہا اور جو مال ضائع ہوا اس کا کوئی بدلہ نہیں ہوگا۔اور ہر وہ شرط جو میں نے صلح کیلئے قبول کی تھی وہ میرے اِن دو قدموں کے نیچے ہے''۔

یہ احوال ابن ابی شیبہ نے اپنی کتاب میں سعید ابن سوید کی روایت سے نقل کئے ہیں کہ ''معاویہ نے ہمارے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھی اور پھر ہمیں مخاطب کیا.....''۔امام بخاریؒ نے بھی اپنی تاریخ الکبیر میں یہی روایت کیا ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ وہ خود اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ اسلام کے مخالف ہے، یہ اعلان بھی کیا کہ ''تمہارے اوپر حکومت کروں اور تمہاری گردنوں پر (سوار) ہوں''۔اس سے آگے بڑھ کر وہ بات کہی جو اور بھی زیادہ شدید اور افسوسناک ہے کہ ''ہر وہ شرط جو میں نے صلح کیلئے قبول کی تھی وہ میرے اِن دو قدموں کے نیچے ہے''، جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَأَوْفُواْ بِالعَهْدِ إِنَّ العَهْدَ كَانَ مَسْئُولاً﴾

اور عہد کو پورا کرو، عہد کے بارے میں لازماً پوچھا جائیگا۔(ترجمہ معانی قرآن کریم: بنی اسرائیل:۳۴)

اس قول سے یہ اعلان ہو رہا ہے کہ وہ اسلام کے قانون کے پابند نہیں۔پھر امارت کی وراثت کے معاملہ میں یزید کے انتخاب کے طریقہ سے بھی وضاحت ہوتی ہے کہ وہاں معاملہ اسلام کے مطابق بالکل نہیں تھا، کیونکہ جب وہاں سب کی اس معاملہ میں رائے لی گئی اور یہ دیکھا گیا کہ کوئی اس تجویز کی حمایت نہیں کر رہا تو دولت کا استعمال کیا گیا۔اس حربہ سے صرف وہ لوگ تیار ہو پائے جن کا عوام میں کوئی مقام نہیں تھا اور مسلمان جنہیں کوئی وزن نہیں دیتے تھے، اس کے بعد پھر تلوار استعمال کی گئی۔مورخین میں علامہ ابن کثیر اور ابن اثیر لکھتے ہیں کہ جب معاویہ کے والی، حجاز میں لوگوں سے یزید کیلئے بیعت لینے میں ناکام ہوئے تو معاویہ خود اپنی فوج کے ساتھ، کافی مال و دولت لے کر وہاں پہنچے، اور مسلمانوں کے سرداروں کو خطاب کیا کہ تم میری سیرت سے خوب واقف ہو، میرے خاندان کو بھی جانتے ہو، یزید تمہارا بھائی اور چچا کا بیٹا ہے۔میں چاہتا ہوں کہ تم یزید کو خلافت کے لئے آگے بڑھاؤ، پھر تم ہی لوگ ہوگے جو لوگوں کو مقرر اور معزول کروگے، تم ہی لوگوں کا اقتدار ہوگا، مال تم ہی جمع کروگے اور تم ہی تصرف کروگے۔حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے جواب دیا کہ تم وہ عمل اختیار کرو جو حضور ﷺ نے کیا کہ اُنہوں نے کسی کو مقرر نہیں کیا، یا حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی طرح۔اس پر معاویہ کو غصہ آ گیا اور لوگوں سے پوچھا تو لوگوں نے کہا کہ جو کچھ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے کہا وہی صحیح ہے۔پھر معاویہ نے کہا: ''میں تمہیں خبردار کرتا ہوں، میں ایک لفظ کہونگا اور جس کسی نے جواب میں ایک لفظ بھی کہا تو وہ دوسرا لفظ کہہ پائے، اِس سے پہلے تلوار اُس تک پہنچ جائیگی۔لہٰذا ہر ایک خود کو بچالے''۔پھر اپنی فوج کے ایک سردار کو حکم دیا کہ وہ حجاز کے ہر سردار اور ہر دشمن کی گردن پر دو سپاہی کھڑا کرے اور اگر کوئی میری بات کو تسلیم کرنے کیلئے، یا انکار کرنے کیلئے زبان کھولے، تو اس کی گردن اُڑا دی جائے۔

اس طرح معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو ولیعہد بنانے کا منصوبہ نافذ کیا۔

یزید کو ولیعہد بنائے جانے کا منصوبہ اسلام کے بالکل خلاف تھا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

مَن أمَّرَ رَجُلاً لِقُرَابة أوْ صداقَة بَينِهما وَهو يَجِد في المسلمينَ خيرَاً مِنْه،فقد خانَ الله و رسوله و المؤمنين۔

اگر کوئی اپنی رشتے داری یا دوستی کی بنیاد پر کسی کو اقتدار دے، جبکہ مسلمانوں میں اُس سے بہتر لوگ موجود ہوں، تو اُس نے اللہ، اُس کے رسول اور مسلمانوں سے خیانت کی۔

۲-معاویہ نے نصوص شرع کی جوڑ توڑ کر کے ایسی تاویل کی کہ بیٹے کیلئے ولیعہد بنائے جانے کا جواز نکالا جا سکے، جبکہ اسلام نے امیر بنائے جانے کا اختیار امت کو دیا ہے۔ یہی فعل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا کہ وہ امت پر چھوڑ گئے کہ وہ اپنے معاملات کیلئے ایک شخص کو منتخب کر لیں۔ معاویہ نے بیعت کے حکم کی غلط تاویل کی اور اپنے بعد اختیار یزید کیلئے خاص کر دیا جس طرح کہ رومی اور ساسانی کیا کرتے تھے اور اپنی زندگی میں یزید کیلئے بیعت لی۔

۳-سیاسی معاملات میں اجتہاد کیلئے معاویہ کا طریقہ ذاتی مفاد پر مبنی تھا۔ معاویہ نے اسلامی احکام کو اپنے وقت کے حالات کے مطابق ڈھالا، جبکہ اسلامی احکام کو حالات پر ڈھالنے کے بجائے، اُن احکام کو ہو بہو نافذ کر کے مسائل کو حل کیا جانا چاہئے تھا۔ معاویہ پر واجب یہ تھا کہ وہ اجتہاد کیلئے اسلامی طریقہ اپناتے، یعنی قرآن اور حضورﷺ کی سنت کو بنیاد بناتے، نہ کہ مادی مفاد کو، اور اسلامی احکام سے زمانے کی مشکلات کو حل کرتے، نہ کہ زمانے کے مسائل کو لے کر احکام کو اُن کے مطابق ڈھالتے اور اُن میں توڑ موڑ، تبدیل کرتے اور اس طرح شرعی احکام کی خلاف ورزی کرتے۔

یہاں یہ ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ اس طرح ولیعہد بنا دئے جانے سے بیٹا، خلیفہ کی موت کے بعد خلیفہ نہیں بن جاتا، بلکہ خلیفہ کی موت کے بعد بیعتِ انعقاد واطاعت سے بنتا ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ بیعت بعض اوقات مرضی اور اختیار کے بجائے جبر سے حاصل کی گئی، بہر حال اسلامی ریاست جب تک رہی، منصبِ خلافت کے لئے بیعت ہی کا طریقہ اپنایا گیا، نہ کہ وراثت یا ولیعہدی کا۔

خلیفہ کی میعاد:

خلیفہ کے خلافت پر قائم رہنے کی مدت متعین نہیں کی جاتی، بلکہ جب تک وہ شریعت کا پاسدار ہے، اُس کے احکام نافذ کرتا ہے، ریاست کے امور چلانے پر اور خلافت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کی قدرت رکھتا ہے، وہ خلیفہ بنا رہیگا، کیونکہ نصوص شرعیہ

میں خلافت کی کوئی مدت مقرر نہیں کی گئی بلکہ وہ مطلق ہے۔ بخاری شریف میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((اسمعوا و أطيعوا، و إن استعمل عليكم عبدٌ حَبَشِيٌّ،كان رأسهُ زبيبة۔))

سنو اور اطاعت کرو، خواہ تمہارے اوپر ایک حبشی غلام ہی کیوں نا مقرر کر دیا جائے جس کا سر منقہ کی طرح پچکا ہی ہو۔

ایک اور حدیث مسلم شریف میں ام حصینؓ سے نقل کی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں:

((يقود كم بكتاب الله۔))

وہ تم پر اللہ کی کتاب سے حکومت کرے۔

مزید یہ کہ تمام خلفاء راشدین کو مطلق بیعت دی گئی، جیسا کہ احادیث میں وارد ہے، اور ان سب کی کوئی طے شدہ میعاد نہیں تھی۔ ان سب کی خلافت اُن پر بیعت سے وفات تک رہی۔ لہٰذا یہ صحابہ کرامؓ کا اجماع ہوا کہ خلافت کیلئے متعین مدت نہیں ہے بلکہ یہ مطلق ہے اور بیعت کے وقت سے وفات تک کیلئے ہے۔

البتہ اگر ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے کہ خلیفہ کی معزولی ضروری ہو، تو پھر اس کی میعاد ختم ہو جاتی ہے، لیکن بہر حال یہ خلیفہ کیلئے مدت طے کرنا نہیں ہوا بلکہ خلافت کی شرائط میں نُقص کا واقع ہونا ہوا۔ نص شرعی اور صحابہ کرامؓ کے اجماع سے جو بیعت کا طریقہ ثابت ہے، اس میں مدت متعین نہیں ہے بلکہ جب تک خلیفہ کا عمل بیعت کی شرائط کے مطابق ہے، جس کیلئے بیعت دی گئی ہے، یعنی قرآن اور سنت رسولؐ پر عمل اور شرعی احکام کا نفاذ، تو وہ خلیفہ بنا رہیگا، لیکن شریعت کے نافذ نہ کرنے، اور اسکی حفاظت نہ کرنے کی صورت میں اسے معزول کرنا واجب ہو جائیگا۔

مسلمانوں کو خلیفہ مقرر کرنے کیلئے دی گئی مدت:

مسلمانوں کو خلیفہ مقرر کرنے کیلئے جو مدت دی گئی ہے وہ تین دن اور اُن کے درمیان راتوں کی ہے۔ یہ مسلمان کیلئے جائز نہیں کہ اُس پر تین راتیں ایسی گزریں کہ اس پر بیعت کا طوق نہ ہو۔ خلیفہ کی موت یا معزول کئے جانے کے فوراً بعد مسلمان پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ نیا خلیفہ مقرر کریں، لیکن صرف تین دن کی تاخیر کی گنجائش ہے، پھر اگر تین دن کی مدت پوری ہو جاتی ہے اور خلیفہ مقرر نہیں ہوتا، تو یہ دیکھا جائیگا کہ کیا مسلمان خلیفہ کی تقرری میں مشغول تو ہیں، لیکن ایسے حالات کی وجہ سے جو اُن کی پہنچ سے باہر ہیں، اس کام کو تین دن میں مکمل نہیں کر پائے، تو فرض کی تکمیل میں لگے ہوئے ہونے کے اور اس میں ہونے والی تاخیر پر اپنی مرضی کے خلاف مجبور ہونے کے سبب، گناہ اُن پر نہیں ہوگا۔ ابن ماجہ اور ابن حبان میں حضرت ابن عباسؓ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((إنَّ اللهَ وَضَعَ عَن أمتي الخطأ وَ النسيان و ما أستكرِهوا عليه۔))

اللہ تعالیٰ نے میری امت کو غلطی، بھول چوک اور جس پر وہ مجبور ہو (محاسبہ نہیں ہے)۔

لیکن اس کے برعکس اگر صورتِ حال یہ ہو کہ کوئی بھی اس کام میں مشغول نہ ہو تو سب کے سب گناہ گار ہونگے تاوقتیکہ خلیفہ کا تقرر نہ ہو جائے، اور یہ فرض اُن کے سر سے اُٹھ جائے۔ اس صورت میں بھی، خلیفہ کے مقرر کرنے کے کام سے غفلت کے سبب بیٹھے رہنے کا گناہ تو بہرحال باقی رہیگا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کا حساب لے، جیسا کہ وہ اور فرائض کے ترک کرنے پر احتساب کرتا ہے۔

جہاں تک خلیفہ کے منصب کے خالی ہوتے ہی فوراً بیعت کی دلیل کی بات ہے، تو امر یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین نے سقیفۂ بنی ساعدہ میں حضور ﷺ کی وفات کے دن، اور آپ ﷺ کی تدفین سے قبل ہی حضرت ابوبکرؓ سے بیعتِ انعقاد کی اور دوسرے دن مسجد میں بیعت اطاعت ہوئی۔

پھر اس کام کیلئے تین دن اور اُن کے درمیان راتوں کی مہلت کی دلیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فعل سے ملتی ہے کہ جب آپ رضی اللہ عنہ کو خنجر سے زخمی کیا گیا، تو آپ رضی اللہ عنہ نے شوریٰ کے لوگوں کو پابند کیا کہ وہ اُنکی (یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی) وفات کے بعد تین دن کے اندر خلیفہ مقرر کردیں اور یہ وصیّت کی کہ اِن (شوریٰ کے) افراد میں جو خلیفہ کی مخالفت کرے، وہ قتل کر دیا جائے، پھر مسلمانوں کے پچاس آدمیوں کو اس وصیت پر عمل کیلئے پابند کیا، جبکہ وہ چھ جلیل القدر صحابہ عشرہ بمبشرہ میں تھے۔ یہ پورا عمل تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں ہوا اور کسی بھی صحابی رضی اللہ عنہ سے اس کی مخالفت روایت نہیں کی گئی۔ لہٰذا یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اِس امر پر اجماع قرار پایا کہ نئے خلیفہ کے مقرر کئے جانے کیلئے تین دن سے زیادہ کی تاخیر جائز نہیں ہے، اور کتاب اللہ اور سنتِ رسول کی طرح، صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع بھی ایک شرعی دلیل ہے۔

بخاری شریف میں المِسوَر بن مخرمہ سے روایت ہے کہ وہ رات کو کچھ ہی سو پائے ہونگے کہ دروازے پر حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ عنہ نے دستک دی اور وہ نیند سے بیدار ہو گئے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم سو رہے تھے، بخدا میں اِن تین راتوں کو ٹھیک سے سو بھی نہیں پایا۔ اس کے بعد لوگوں نے فجر کی نماز ادا کی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت ہوئی۔

خلافت کا ایک ہی ہونا:

یہ ضروری ہے کہ تمام کے تمام مسلمان ایک ہی ریاست میں ہوں، اور اُن پر ایک ہی خلیفہ ہو، نہ کہ ایک سے زیادہ، شرعاً یہ حرام ہے کہ تمام عالم کے مسلمانوں کی ایک سے زیادہ ریاست ہو اور ایک سے زیادہ اُن کے خلیفہ ہوں۔

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ریاستِ خلافت کا ایک متحدڑھانچہ ہو، نہ کہ کوئی وفاقی (Federal) ہیئت۔

مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اُنہوں نے حضور رضی اللہ عنہ سے سنا:

((.....ومن بايع اماماً فأعطاه صفقة يده و ثمرة قلبه فليطعه إن إستطاع، فإن جاء

آخر ينازعه فاضربوه عنق الآخر))

جو شخص ایک امام کے ہاتھ پر، دل سے بیعت دے وہ اسکی اطاعت حسبِ استطاعت کرے، اور اگر کوئی دوسرا آکر خلیفہ سے تنازعہ کرے، تو اسکی گردن اُڑا دے۔

اسی طرح مسلم شریف ہی میں حضرت عرفجہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا:

((مَنْ أتَاكُم وَ أمركُم جَميع على رجُل واحد يريد أن يشقّ عصاكُم،أوْ يُفرّق جماعتكُم فاقتُلوه۔))

جب تمہارے درمیان ایک امیر موجود ہو جس کے ذمہ تمہارے امور ہوں، اور کوئی تمہارے پاس اس نیت سے آئے کہ تمہاری قوت کو تقسیم کر دے اور تمہارے درمیان تفرقہ ڈال دے، تو اُس کو قتل کر دو۔

مسلم شریف ہی میں حضرت ابی سعید الخذری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إذا بويع لخليفتين فأقتلوا الآخر منهما))

اگر دو خلیفاؤں پر بیعت ہو جائے تو دوسرے کو قتل کر دو۔ (بروایت مسلم شریف)

مسلم شریف میں ابی حازم رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں پانچ سال حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہا اور اُن سے حضور ﷺ کے بارے میں سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((كانت بنو إسرائيل تسوسهم الأنبياء‘كلما هلك نبيٌ خلفه نبي‘ و إنه لا نبي بعدي‘و ستكون خلفاء فتكثر‘قالوا فما تأمرنا؟قال: فوا ببيعة الأول فالأول‘و أعطوهم حقهم‘فإن الله سائلهم عما استرعاهم۔))

بنی اسرائیل پر انبیاء علیہم السلام حکومت کیا کرتے تھے، جب ایک نبی کا انتقال ہو جاتا تو دوسرا اسکی جگہ لے لیتا تھا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، خلفاء ہونگے اور کثرت سے ہونگے۔ پوچھا گیا کہ ہمارے لئے تب کیا حکم ہے؟ فرمایا: اُن سے اپنی بیعت پوری کرو اور اُن کو اُن کا حق دو، اللہ (خود) اُن سے اس بارے میں محاسبہ کریگا جو اُن کے ذمہ کیا تھا۔

لہٰذا پہلی حدیث یہ واضح کرتی ہے کہ جب ایک شخص کو امامت یعنی خلافت دے دی جائے تو اسکی اطاعت فرض ہو جاتی ہے، پھر اگر کوئی اور آکر اس امر میں تنازعہ کھڑا کرے تو اس سے قتال کرنا واجب ہو جاتا ہے، اور اگر وہ اپنے اِس موقف سے نا ہٹے تو اس کا قتل کر دیا جانا بھی واجب ہو جاتا ہے۔

دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب امت ایک جماعت ہو، اور ایک خلیفہ کی امارت میں متحد ہو اور پھر کوئی شخص اُن کی طاقت کو کمزور کرنے کی کوشش کرے یا اُن میں تفرقہ ڈالنا چاہے تو اُس کا قتل کر دیا جائے۔ دونوں احادیث کا مفہوم اسلامی ریاست کے ٹکڑے کرنے سے منع کرتا ہے اور اسکی وحدت قائم رکھنے پر زور دیتا ہے چاہے اس کیلئے تلوار ہی اُٹھانا پڑے۔

تیسری حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ایک خلیفہ کے ہٹنے کی صورت میں؛ خواہ یہ خلیفہ کی موت کی وجہ سے ہو، اس کے برطرف کر دینے کے سبب ہو یا اس کے مستعفی ہونے سے ہو؛ اگر دو لوگوں کو بیعت دے دی جاتی ہے تو اُس دوسرے شخص کو قتل کر دیا جائے اور اگر دو سے زیادہ اشخاص کی بیعت ہوتی ہے تو اور بھی زیادہ صراحت سے یہ بات صادق آتی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ریاست کی تقسیم نہ ہو اور یہ کئی ریاستیں نہ ہو کر ایک ہی متحد ریاست ہو۔

چوتھی حدیث بتاتی ہے کہ حضور ﷺ کے بعد کثرت سے خلفاء ہونگے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پوچھنے پر کہ اس صورت میں مسلمانوں کیلئے کیا حکم ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کو پہلے بیعت دی گئی ہو اسکی اطاعت کرو کیونکہ وہی شرعی خلیفہ ہے، رہے دوسرے تو اُن کی اطاعت نہیں ہوتی کیونکہ ایک خلیفہ کے ہوتے دوسرے پر بیعت ہی باطل ہے۔ یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ ایک ہی خلیفہ کی اطاعت کی جائے، لہٰذا یہ مسلمانوں کیلئے جائز نہیں کہ اُن کا ایک سے زیادہ خلیفہ ہو اور ایک سے زیادہ ریاست۔

خلیفہ کے اختیارات:

خلیفہ ہی ریاست ہے اور تمام اختیارات جو ریاست کے ہوں، وہ خلیفہ کے پاس ہوتے ہیں۔ خلیفہ کے اختیارات حسب ذیل ہیں:

۱- خلیفہ ہی احکامِ شرعیہ کی تبنی کر کے نافذ کرتا ہے۔ تبنی شدہ احکام قانون بن جاتے ہیں جن کی اطاعت واجب ہو جاتی ہے اور اِن کی خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی۔

۲- خلیفہ ہی ریاست کی داخلی اور خارجی پالیسی اختیار کرنے کا ذمہ دار ہے، وہی مسلح افواج کا قائد اعلیٰ ہوتا ہے، اسے ہی جنگ کا اعلان کرنے، صلح کرنے، جنگ بندی کرنے اور تمام معاہدات کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔

۳- خلیفہ ہی بیرونی ممالک کے سفیروں کو قبول یا مسترد کرتا ہے، وہی مسلم سفیر متعین کرتا ہے اور وہی اُنہیں معزول کرتا ہے۔

۴- خلیفہ ہی معاونین اور والیوں کا تقرر کرتا ہے اور اُنہیں معزول کرتا ہے۔ وہ سب خلیفہ اور مجلسِ امت کے آگے جوابدہ ہوتے ہیں۔

۵-خلیفہ ہی قاضی القضاۃ (Chief Justice)، محکمات کے افسران (Directors)، فوج کے سالار اور امیر سپاہ، متعین کرتا ہے جو سب اُسی کو جوابدہ ہوتے ہیں نا کہ مجلس امت کو۔

۶-خلیفہ ہی وہ احکام شرعیہ بھی تبنی کرتا ہے جس کی بنیاد پر ریاست کا بجٹ تیار کیا جاتا ہے، وہی بجٹ کی مدیں طے کرتا ہے اور ہر محکمہ کیلئے آمدنی اور مصارف کی رقوم کا تعین کرتا ہے۔

خلیفہ کے اِن اختیارات کی دلیل، خلافت کا تمام عالم کے مسلمانوں کی امارت عامہ ہونا ہے، جو شریعت کے احکام نافذ کرتی ہے اور اسلام کا پیغام دنیا بھر تک پہنچاتی ہے۔ لفظِ ریاست (State) ایک اصطلاح ہے، جس کا تصور مختلف نظریات میں علیحدہ علیحدہ ہے۔ مثلاً مغربی قوموں میں ریاست: زمین، افراد اور حکام کا مجموعہ ہے، ان کے تصور میں ریاست جغرافیائی حدود میں بندھی ہے جسے وہ وطن کہتے ہیں، جسکی سیادت (Sovereignty) عوام کے پاس ہوتی ہے اور حاکمیت کی نوعیت اجتماعی ہوتی ہے، نہ کہ انفرادی۔ چنانچہ وہاں ایک امیر ریاست (Head of State/President) ہوتا ہے جو حاکموں کا رئیس ہوتا ہے، عوام ہوتے ہیں، ملک (زمین) ہوتی ہے، اور حکومت کا سربراہ یا وزیراعظم (Head of Government/Prime Minister) ہوتا ہے جبکہ اسلام میں ریاست کی دائمی سرحدیں (Permanent Borders) نہیں ہوتیں کیونکہ ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کی دعوت تمام عالم کو پہنچائے۔ لہٰذا کسی علاقے یا ملک کے اسلام قبول کر لینے کے بعد، جب وہ اسلامی اقتدار کے دائرے میں آجاتا ہے تو ریاستِ اسلامی کی سرحدیں آگے بڑھ جاتی ہیں۔ اور اسلام میں لفظ 'وطن' سے مراد وہ جگہ ہے جہاں ایک شخص ہمیشہ رہتا ہے، یعنی اس کا گھر اور شہر، اس سے زیادہ وطن سے مطلق اور کچھ مراد نہیں ہے۔ اسلام میں سیادت، شریعت کی ہوتی ہے نہ کہ امت کی، چنانچہ حکام اور عوام، دونوں شریعت کی منشاء کے پابند ہوتے ہیں۔ اسلام میں اقتدار انفرادی ہے نہ کہ اجتماعی، حضور ﷺ نے فرمایا:

((إذا كانوا ثلاثة في سفرٍ فليؤمروا أحدهم))

اگر تین لوگ سفر میں ہوں تو ایک کو اپنا امیر بنالیں۔ (البزار: روایت ابن عمر رضی اللہ عنہ)

((إذا خرج ثلاثة في سفرٍ فليؤمروا أحدهم))

اگر تین لوگ سفر پر نکلیں، تو ایک کو اپنا امیر بنالیں۔ (ابوداؤد: ابی سعید الخذری رضی اللہ عنہ)

((إذا بويع لخليفتين فأقتلوا الآخر منهما))

اگر دو خلیفاؤں پر بیعت ہو جائے تو دوسرے کو قتل کر دو۔ (مسلم شریف: ابی سعید الخذری رضی اللہ عنہ)

اس طرح اسلام میں ریاست کا تصور دوسرے تمام نظاموں سے جدا ہے۔ اسلام میں ریاست کے معنی، اقتدار اور حکم کے ہیں، اور اس کے اختیارات، خلیفہ کے اختیارات ہیں، اور کیونکہ خلیفہ ہی اقتدار کا مجاز ہوتا ہے لہٰذا خلیفہ ہی ریاست ہے۔

مزید یہ کہ حضور ﷺ نے جب مدینہ میں اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی تو اقتدار خود آپ ﷺ کے ہی پاس تھا، اور اقتدار سے متعلق تمام اختیارات و تصرفات کے آپ ﷺ ہی مالک تھے، یہی حالت آخر تک رہی یہاں تک کہ آپ ﷺ اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ آپ ﷺ کے بعد خلفاء راشدین آئے، اُنہوں نے بھی اقتدار اور اس سے متعلق تمام اختیارات اپنے ہی پاس رکھے، یہ بھی اس بات کی دلیل ہوئی کہ خلیفہ ہی ریاست ہے۔ اس کے علاوہ جب حضور ﷺ نے امیر کی اطاعت سے باہر ہونے پر خبردار کیا تو امیر کیلئے اقتدار کا ہی لفظ استعمال کیا۔ مسلم شریف میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((مَنْ كَرِه مِنْ أميرِهِ شيئاً فليصبر عليه، فإنْهُ ليس أحد مِن الناس خرج مِن السلطان شبراً فمات عليه إلّا مات ميتة جاهلية.))

جس کسی کو اپنے امیر کی کوئی بات ناگوار ہو تو اُسے چاہئے کہ وہ اس پر صبر کرے، کیونکہ جو کوئی (اسلامی حکومت کے) اقتدار سے بالشت بھر دور ہو اور اس حالت میں مر جائے، تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

خلافت مسلمانوں کی امارت ہے اور خلیفہ ہی اقتدار ہے، ریاست کا ہر اختیار، خلیفہ کا ہی اختیار ہے، یعنی خلیفہ ہی ریاست ہے۔ خلیفہ کے اختیارات کے یہی دلائل ہیں۔ رہی بات اِن اختیارات کی تعداد کی، تو یہ وہی اختیارات ہیں جو ریاست کے ہیں اور اِن سے غرض یہ ہے کہ اِن اختیارات کے احکام شرعیہ تفصیل سے بیان کئے جا سکیں۔

اِن چھ (۶) مذکورہ اختیارات کے ادلۂ تفصیلیہ یہ ہیں:

۱- اس اختیار کی دلیل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے۔ لفظِ قانون ایک اصطلاح ہے اس کے معنی وہ حکم ہے جسے حاکم صادر کرے اور جس پر عوام عمل کریں۔ قانون کی تعریف یہ بھی ہے کہ: ''وہ مجموعۂ قواعد جن سے حاکم عوام پر یہ لازم کرتا ہے کہ عوام اُن کے ذریعے اپنے معاملات طے کریں''۔ یعنی جب ایک حاکم معینہ احکام صادر کرے تو یہ احکام قانون ہوتے ہیں جن کی پابندی لازم ہوتی ہے، اور اگر حاکم اِنہیں جاری نہ کرے تو یہ قانون نہیں ہوتے اور اِن کی پابندی عوام پر نہیں ہوتی۔ مسلمان شریعت کے احکام کے پابند ہوتے ہیں، وہ اللہ اور اس کی شریعت کے اوامر و نواہی پر چلتے ہیں نہ کہ حاکم کے اوامر و نواہی پر۔ امر یہ بھی ہے کہ احکامِ شرعیہ کے بارے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی رائے ایک دوسرے سے علیحدہ رہی ہے، ایک صحابی مثلاً کسی حکم شرعی کو ایک طرح سمجھتے تھے، جبکہ بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم اُسی حکم کے بارے میں علیحدہ رائے رکھتے تھے۔ ہر ایک صحابیؓ اس حکم پر اپنے فہم اور ادارک کے مطابق عمل کرتا تھا، ہر حکم شرعی کا جو فہم ایک صحابیؓ کو تھا، وہی اُس صحابیؓ کیلئے حکم شرعی کی حیثیت رکھتا تھا۔ البتہ بعض احکام جن سے

امت کے امور اور معاملات چلائے جاتے ہیں، اُن کا تقاضا یہ ہے کہ تمام امت اُن پر ایک ہی رائے رکھے، اور ان پر ہر شخص اپنے ذاتی اجتہاد سے نہ چلے۔ حقیقتاً ہوا بھی یہی، حضرت ابوبکرؓ اس رائے کے قائل تھے کہ مال تمام مسلمانوں میں برابری سے تقسیم ہو کیونکہ اس میں سب کا برابری کا حق ہے، اس کے برخلاف حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ یہ صحیح نہیں ہے کہ جو شخص حضورؐ کے ساتھ غزوات میں شریک رہا ہو، اس کا حصہ اُس شخص جیسا ہو جو ساتھ نہیں رہا، اور یہ کہ ایک غریب اور ایک امیر کو برابری سے حصہ دیا جائے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ خلیفہ تھے، لہٰذا اُنہیں کی رائے نافذ رہی، یعنی یہ حکم تبنی کیا گیا کہ مال کی تقسیم برابری سے ہو، مسلمان اسی کے پابند رہے، قاضی اور والیوں نے اِسی کو اختیار کیا اور حضرت عمرؓ بھی اسی پر عمل پیرا رہے، پھر جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو اُنہوں نے خود اپنی رائے اختیار کی، یعنی یہ حکم دیا کہ مال کی تقسیم میں مراتب کا لحاظ رکھا جائے نہ کہ برابری سے تقسیم کیا جائے۔ لہٰذا اب مال کی تقسیم میں یہ ملحوظ رکھا گیا کہ کس کی کیا ضرورت ہے اور یہ کہ اسلام قبول کرنے میں کس نے سبقت حاصل کی تھی، اسی پر والیان اور قاضی فیصلے کرنے لگے اور مسلمان بھی اب اسی کے پابند رہے۔ چنانچہ یہ صحابہ کرامؓ کا اجماع قرار پایا کہ امام کو یہ حق ہے کہ وہ معین شرعی احکام کی تبنی کرے، اُنہیں جاری کرے اور مسلمان ان احکام کا اتباع کریں، خواہ یہ تبنی شدہ احکام اُن کے اپنے اجتہاد کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں، مسلمانوں پر یہ لازم ٹھہرا کہ وہ اپنے اجتہاد اور اپنی رائے کو چھوڑ کر ان تبنی شدہ احکام کا ہی اتباع کریں۔ پس یہ تبنی شدہ احکام ہی قوانین ہوئے اور قوانین کی تدوین صرف خلیفہ کا حق ہے، یہ حق کسی اور کا مطلقاً نہیں۔

۲- اس اختیار کی دلیل خود حضور ﷺ کا عمل ہے، آپ ﷺ خود والیوں اور قاضیوں کی تقرری فرماتے تھے اور اُن کا محاسبہ بھی کرتے تھے، آپ ﷺ خرید و فروخت پر نظر رکھتے تھے اور دھوکہ دھڑی سے منع فرماتے تھے، آپ ﷺ ہی مال کی تقسیم بھی فرماتے، اور بیروزگار کو کام کی تلاش میں مدد بھی کرتے۔ غرضیکہ عوام کے معاملات سے متعلق، ریاست کے داخلی امور کا آپ ﷺ خود اہتمام فرماتے، دوسرے ممالک کے بادشاہوں کو خطوط لکھواتے، بیرونی وفود سے ملاقات کرتے اور ہر طرح کے خارجی امور کی نگرانی فرماتے تھے۔ افواج کی قیادت بھی آپ ﷺ براہ راست کرتے، غزوات میں بنفس نفیس فوج پر قائد رہتے اور فوجی دستوں کو جب مختلف مہمات پر روانہ فرماتے تو اُن کے قائد خود مقرر کرتے۔ آپ ﷺ نے ایک فوجی دستہ شام روانہ کیا تو اُس پر اسامہ

بن زید ؓ کو قائد مقرر کیا، صحابہ ؓ کو یہ بات اسلئے پسند نہیں آئی کہ اسامہ ؓ اس وقت کم عمر تھے، لیکن حضور ﷺ نے صحابہ ؓ حکم دیا کہ وہ اسامہ ؓ کو ہی قبول کریں، لہٰذا یہ دلیل ہے اس بات کی کہ خلیفہ خود ہی عملاً فوج کا قائد اعلیٰ ہوتا ہے، نہ کہ محض برائے نام قائد۔ مزید یہ کہ خود آپ ﷺ نے قریش کے خلاف جنگ کا اعلان کیا، نیز بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع، خیبر اور روم پر بھی آپ ﷺ نے خود جنگ کا اعلان کیا۔ غرضیکہ کہ جو بھی جنگ ہوئی، خود آپ ﷺ نے اُس کا اعلان کیا، یعنی جنگ کا اعلان کرنا خلیفہ کی ذمہ داری ہے۔ حضور ﷺ نے یہودیوں سے خود ہی معاہدہ کیا، نیز بنی مدلج اور اُن کے حلیف بنی ضمرہ سے معاہدہ کیا، ایلہ کے یوحنہ بن رؤبہ سے معاہدہ کیا۔ حدیبیہ کی صلح بذاتِ خود آپ ﷺ نے کی جس پر صحابہؓ نے ہتک بھی محسوس کی، لیکن آپ ﷺ نے اُن کی رائے ماننے سے انکار کرتے ہوئے معاہدہ کیا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ معاہدات خلیفہ ہی کر سکتا ہے، کوئی اور نہیں، خواہ یہ معاہدۂ صلح ہو، یا کسی اور نوعیت کا معاہدہ۔

۳- خلیفہ کے اس اختیار کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے بذاتِ خود مسیلمہ کے وسفیروں سے اور قریش کے سفیر ابو رافع سے ملاقات کی، اپنے سفیر، ہرقل، کسریٰ، مقوقس، حیرہ کے بادشاہ حارث الغسانی، یمن کے بادشاہ حارث الحمیری، اور حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے پاس بھیجے۔ حضرت عثمان ابن عفان ؓ کو آپ ﷺ نے حدیبیہ کے موقع پر سفیر بنا کر قریش کے پاس روانہ کیا۔ ان دلائل سے واضح ہوتا ہے کہ خلیفہ ہی سفراء کو قبول یا مسترد کرتا ہے، اور اپنے سفیر دوسرے ممالک کو بھیجتا ہے۔

۴- حضور ﷺ خود ہی والیوں کی تقرری فرماتے تھے، مثلاً حضرت معاذ ابن جبل ؓ کو یمن کا والی مقرر فرمایا؛ آپ ﷺ ہی والیوں کو معزول کیا کرتے تھے، جیسے العلاء بن الحضرمی کو بحرین کے والی کی حیثیت سے معزول کیا، کیونکہ وہاں کے لوگوں نے ان کی شکایت کی تھی۔ اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ والی، اپنے علاقے کے عوام کے سامنے بھی جوابدہ ہیں جیسے وہ خلیفہ کے اور مجلس امت کے سامنے جوابدہ ہیں، کیونکہ مجلس امت تمام ولایات کی نمائندہ ہے۔ رہی بات معاونین کی، تو حضور ﷺ کے دو معاونین تھے، یعنی حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ، آپ ﷺ نے اپنی تمام حیات، اِنہیں معزول کر کے کسی اور کو معاون نہیں بنایا۔ بہر حال کیونکہ معاون خلیفہ ہی سے اقتدار حاصل کرتا ہے پس اسکی حیثیت نائب کی ہوگی جسے خلیفہ معزول کر سکتا ہے جیسے ایک مؤکل اپنے وکیل

کو معزول کر سکتا ہے۔

۵-اس کی ایک دلیل حضور ﷺ کا یہ فعل ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی مقرر کیا تھا۔ مسندِ احمد میں عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ کے پاس دو اشخاص آئے جن کے درمیان کوئی تنازعہ تھا، حضور ﷺ نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "**أقض بينهما يا عمرو**"۔ یعنی، "اے عمروؓ اِن کے درمیان فیصلہ کرو"۔ حضرت عمروؓ نے جواب دیا کہ "آپ ﷺ مجھ سے بہتر ہیں" حضور ﷺ نے فرمایا: "پھر بھی"، حضرت عمروؓ نے سوال کیا کہ اگر میں اِن کے درمیان فیصلہ کر دوں تو مجھے کیا اجر ملیگا؟ حضور ﷺ نے فرمایا:

((إن أنت قضيتَ بينهما فأصبتَ القضاء فلك عشر حسنات، وإن أنت اجتهدت فأخطأت فلك حسنة۔))

اگر تم نے صحیح فیصلہ کیا تو تمہیں دس نیکیاں ملینگی اور اگر تم نے اجتہاد میں خطا (بھی) کی تو ایک نیکی۔

حضرت عمرؓ قاضیوں کی تقرری بھی فرماتے تھے اور (ضرورت پڑنے پر) معزول بھی کرتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے شریحؒ کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا تھا اور ابو موسیٰؓ کو بصرہ کا؛ نیز شرجیل بن حسنہؓ کو شام کی ولایت سے معزول کر کے معاویہ کو والی بنایا تھا۔ شرجیل نے حضرت عمرؓ سے اپنی معزولی کا سبب پوچھا کہ "کیا مجھے نافرمانی کے سبب معزول کیا گیا ہے یا خیانت کے"؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا دونوں نہیں، لیکن میں تم سے زیادہ قوی شخص کو والی بنانا چاہتا تھا۔ اسی طرح حضرت علیؓ نے ابوالاسود کو متعین کیا اور پھر معزول کر دیا۔ ابوالاسود نے حضرت علیؓ سے پوچھا "میں نے نہ تو خیانت کی اور نہ ہی میں نافرمانی کا مرتکب ہوں، پھر مجھے کیوں برطرف کیا گیا ہے"؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا "میں نے تمہیں (تنازعہ میں شامل) دونوں فریقین سے اونچی آواز میں بات کرتے دیکھا تھا"۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے یہ افعال تمام صحابہؓ کے سامنے پیش آئے لیکن کسی نے نہ تو اس کی مذمت کی اور نہ اس پر نکتہ چینی، جو کہ اس بات کی دلیل ہے کہ خلیفہ ہی قاضیوں کا تقرر کرتا ہے۔ خلیفہ کو یہ بھی حق ہے کہ وہ قاضیوں کی تقرری اپنے نائب سے کروائے، جیسا کہ نمائندگی کا معاملہ ہے، جس میں خلیفہ کسی کو اپنے خصوصی اختیارات دے کر نائب بنا سکتا ہے یا اپنی نمائندگی کا اختیار دے سکتا ہے۔

جہاں تک محکمات کے افسران کی تقرری کا سوال ہے، تو حضور ﷺ نے ریاست کی بہتر کارکردگی کیلئے مختلف محکمات پر کاتب مقرر فرمائے تھے جن کی حیثیت (Directors) کی طرح تھی۔ مثلاً معیقیب ابن ابی فاطمہ الدوسیؓ کو مہر نبوت اور مالِ غنیمت کی ذمہ داریاں دی تھیں، حذیفہ بن الیمانؓ کو علاقہ حجاز میں پھلوں کی پیداوار کے حساب کی ذمہ داری دی تھی، حضرت زبیر بن العوامؓ صدقات پر متعین تھے، مغیرہ ابن شیبہ قرضوں اور دیگر معاملات کا حساب رکھتے تھے وغیرہ.....۔

فوج کے قائد، اور سپہ سالار کا تعین خود حضور ﷺ ہی فرماتے تھے، مثلاً حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ کو سمندر کے کنارے قریش کا سامنا کرنے کیلئے تیس سپاہیوں کے دستے کا قائد مقرر فرمایا، عبیدہ بن الحارثؓ کو ساٹھ سپاہیوں پر افسر مقرر کر کے وادیٔ رابغ بھیجا، حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کو بیس سپاہیوں کی ٹکڑی پر متعین کر کے مکہ کی جانب روانہ فرمایا۔ اسی طرح آپ ﷺ فوج کے قائد مقرر فرماتے تھے جو اس بات کی دلیل ہوئی کہ خلیفہ ہی فوج کے قائدین کو مقرر کرتا ہے۔

یہ تمام مقررہ افراد صرف حضور ﷺ کو جوابدہ تھے نہ کہ کسی اور کو، جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قاضی، فوج کے قائدین اور تمام افسران صرف خلیفہ کو جوابدہ ہیں نہ کہ مجلس امت کو۔ مجلس امت کے آگے جوابدہی صرف معاونین خلیفہ، والیان اور حاکمیت سے متعلق افسران ہی کی ہو سکتی ہے۔ ان کے علاوہ اور کوئی شخص مجلس امت کے آگے جوابدہ نہ ہو کر صرف خلیفہ کو جوابدہ ہوتا ہے۔

۶- ریاست کے بجٹ کی محصولات اور مصارف میں بھی احکام شرع کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔ حکم شریعت سے ہٹ کر ایک دینار بھی نہ کسی اور طریقہ سے وصول کیا جا سکتا ہے نہ ہی خرچ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ بجٹ میں محصولات اور مصارف کی مختلف مدوں کو طے کرنا خلیفہ کی رائے اور اجتہاد پر منحصر ہے۔ مثلاً یہ خلیفہ طے کرتا ہے کہ خراج، جزیہ اور دیگر محصولات کی رقم کیا ہو۔ اسی طرح مصارف کے معاملات میں خلیفہ ہی یہ بھی طے کرتا ہے کہ مثلاً سڑکوں (کی تعمیر یا مرمت) پر کتنا خرچ کیا جائے، اور ہسپتالوں پر کیا خرچ ہو۔ یہ تمام محصولات اور مصارف کا تعین خلیفہ کی رائے اور اجتہاد کے ذیل میں آتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود یہ رقوم اپنے مقرر کردہ افسران سے وصول کرتے تھے اور اپنی تولیت میں خرچ کرتے تھے۔ بعض والیان کو اجازت تھی کہ وہ (اپنی صوابدید سے) مال وصول کریں اور خرچ بھی کریں، مثلاً حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کو جب یمن کا والی مقرر فرمایا تو یہی معاملہ تھا۔ یہی عمل خلفاء راشدین کا بھی رہا، ہر ایک نے بحیثیتِ خلیفہ، اپنی رائے اور اجتہاد سے محصولات وصول کیں اور مصارف کی مدیں طے کیں۔ اس پر کبھی کسی نے اعتراض نہیں کیا اور نہ ہی کبھی ایک دینار بھی خلیفہ کی مرضی یا اجازت کے بغیر وصول کیا گیا اور نہ ہی خرچ کیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے جب معاویہ کو ولایت عام پر مقرر کیا تو اسی اختیار کے ساتھ کیا تھا۔ یہ سب اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ خلیفہ یا اُن کا مقرر کردہ نمائندہ ہی بجٹ کی مختلف مدوں کو طے کرتا ہے۔

خلیفہ کے خاص اختیارات کی تفصیلات میں یہ ادلۂ تفصیلیہ ہوئے۔ ان سب پر ایک مجموعی دلیل حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے نقل کی گئی حدیث ہے جسے بخاری شریف اور مسند احمد میں روایت کیا گیا ہے، فرمایا حضور ﷺ نے:

((.....الإمام راع و مسؤول عن رعيته))

امام سرپرست، اور اپنی رعایا کا ذمہ دار ہے۔

بالفاظِ دیگر، ہر وہ معاملہ جو عوام کے معاملات سے متعلق ہو، خلیفہ اُنکی نگہداشت کرتا ہے، اور یہ اُس کا حق ہے کہ وہ اس کام کیلئے جسے چاہے، جیسے چاہے نائب بنا سکتا ہے یا اپنا وکیل بنا سکتا ہے، جو اس کی نمائندگی میں اِن کاموں کو انجام دے۔

رعایا کے معاملات کے اہتمام کی کیفیت:

خلیفہ کا یہ مطلق حق ہے کہ وہ اپنی رائے اور اجتہاد سے عوام کے معاملات کی نگہداشت کرے۔ البتہ اسے یہ چھوٹ نہیں کہ وہ کسی مفاد یا مصلحت کے سبب، شرعی احکام سے تجاوز یا روگردانی کرے۔ مثلاً وہ کسی کو سامان برآمد (Import) کرنے سے، اس وجہ سے منع نہیں کرسکتا کہ اس طرح ریاست کی اپنی صنعت پر منفی اثر پڑیگا، البتہ اگر اس سے ریاست کی معیشت (Economy) متاثر ہو تو علیحدہ بات ہوگی؛ خلیفہ اشیاء کے دام استحصال (Exploitation) کے خوف سے، اپنی مرضی سے مقرر نہیں کرسکتا؛ وہ کسی مکان (یا زمین) مالک کو اپنی زمین یا مکان کرائے پر دینے کو مجبور نہیں کرسکتا کہ اس سے رہائش کا مسئلہ آسان ہوگا، الا یہ کہ کوئی سخت حالات وضرورت اس کی متقاضی ہوں۔ اسی طرح وہ کسی اور چیز پر شرعی احکام کے خلاف پابندی نہیں لگا سکتا، نہ ہی کسی مباح (جائز) کو حرام ٹھہرا سکتا ہے اور نا ہی کسی حرام کو مباح کرسکتا ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((.....الإمام راع و مسؤول عن رعيته))

امام سرپرست، اور اپنی رعایا کا ذمہ دار ہے۔

مزید یہ کہ شریعت نے بعض احکام خلیفہ کے سپرد کئے ہیں، جیسے بیت المال پر اپنی رائے اور اجتہاد سے تصرف، عوام کو کسی مسئلہ میں ایک ہی تبنی شدہ رائے کا پابند کرنا وغیرہ۔ یہ حدیث خلیفہ کو عوام کے معاملات میں اہتمام اور نگہداشت کا مکمل حق، بغیر کسی پابندی کے، بیت المال پر تصرف، اور تبنی شدہ رائے پر عوام کے التزام کا مکمل حق عطا کرتی ہے، نیز فوج کی تیاری اور ساز وسامان سے لیس کرنے کا، والیوں کو مقرر کرنے وغیرہ کا بھی اسکی صوابدید کے مطابق بغیر کسی قید کے مکمل حق دیتی ہے۔ اِن تمام امور میں اسکی اطاعت واجب ہے اور روگردانی گناہ۔ البتہ خلیفہ پر واجب ہے کہ وہ اِن تمام اعمال میں احکام شرع اور نصوص شرع کی مکمل پابندی کرے۔ یعنی اسکے اختیارات تو مطلق ہیں لیکن شریعت کے پابند اور اسی کے مقید ہیں۔ مثلاً اسے یہ مکمل اختیار ہے کہ جیسے وہ چاہے والی مقرر کرے، لیکن وہ یہ نہیں کرسکتا کہ کسی کافر یا نابالغ بچے یا عورت کو والی مقرر کردے کیونکہ شریعت اسکی اجازت نہیں دیتی۔ یا مثلاً خلیفہ کا یہ حق ہے کہ وہ کافر ممالک کے سفارت خانے اپنی ریاست کے تحت آنے والے علاقوں میں قائم ہونے کی اجازت دے، جو کہ اسکا مطلق حق ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ وہ کسی ایسے ملک کے سفارت خانے اپنی ریاست میں کھولنے کی اجازت دے، جو اِن سفارت خانوں کی آڑ میں اسلامی ریاست پر کنٹرول حاصل کرنا چاہتے

ہوں، کیونکہ شریعت نے اس کی ممانعت کی ہے۔ یا مثلاً خلیفہ کو بجٹ کی مدیں طے کرنے کا مطلق اختیار ہے، پس وہ یہ کرے کہ پانی روکنے کیلئے ایک باندھ تعمیر کروائے جبکہ بیت المال میں اس قدر رقم موجود نہ ہو جو ایسے کام کیلئے درکار ہے، اور پھر وہ اس کو مزید محصول (Tax) لگا کر پورا کرے، کیونکہ اگر اُس باندھ کا بنایا جانا فوری طور پر ضروری نہیں ہو تو شرعاً یہ جائز نہیں کہ اس کی تعمیر کیلئے عوام پر ٹیکس عائد کیا جائے۔ اس طرح خلیفہ کو شریعت کے دائرے میں عوام کے معاملات کے اہتمام کا پورا اختیار ہے۔ اس اختیار کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہر قسم کے قوانین وضع کر سکتا ہے؛ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف اُن معاملات میں جو مباح کے دائرہ میں آتے ہوں، اپنی رائے اور اجتہاد سے جو مناسب سمجھے وہ اختیار کر سکتا ہے۔ لہٰذا جن معاملات میں اُسے اختیار ہے، وہ قانون وضع کر سکتا ہے اور اُن کی اطاعت عوام پر واجب ہوتی ہے، کیونکہ شریعت نے خلیفہ کو یہ اختیار دیا ہے اور امت کو اسکی اطاعت کا پابند بنایا ہے۔ چنانچہ اسے یہ حق ہے کہ وہ ایسے قانون وضع کرے اور امت اس کا اتباع کرے۔ مثلاً اسے بیت المال کے انتظام کیلئے اپنی رائے اور اجتہاد کی اجازت ہے، اور عوام کو اطاعت کا حکم، لہٰذا وہ اس کے متعلق قانون وضع کر سکتا ہے، جن کا اتباع ہم پر واجب ہوگا۔ خلیفہ کو فوج کی قیادت کا اور اسے اپنے اجتہاد اور رائے سے منظّم کرنے، اور اس کیلئے قانون وضع کرنے کا حق ہے، اور ہم ایسے قوانین کا اتباع کرنے کے پابند ہیں۔ یا مثلاً خلیفہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کے امور کی نگہداشت اپنے اجتہاد اور رائے کے مطابق کرے اور اس کام کے لئے ملازموں کا تقرر کرے، جس میں عوام پر یہ فرض ہے کہ وہ اس کی اطاعت کریں، لہٰذا یہ اس کا حق ہے کہ وہ ملازموں کیلئے قوانین وضع کرے، جن کی اطاعت واجب ہوگی۔ اس طرح ہر وہ معاملہ جو خلیفہ کے اجتہاد اور رائے پر چھوڑا گیا ہے، اسے حق ہے کہ وہ اُن امور میں مناسب قوانین وضع کرے جن کا اتباع واجب ہوگا۔ اِن معاملات میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ قوانین محض اسلوب ہیں جو مباح کے دائرے میں آتے ہیں اور خلیفہ کسی ایک مباح کو اپنا کر اسے فرض کر رہا ہے، اور مباح کے باقی اسالیب کو چھوڑ کر ایک کو اپنانے سے باقی اسالیب کو حرام ٹھہرا رہا ہے، جو کہ صحیح نہیں ہے۔ یہ بحث اس لئے غلط ہے کہ مباح ایک اسلوب ہے، اور مثلاً بیت المال کے انتظام کیلئے خلیفہ مختلف مباح اسالیب میں سے ایک کو تبنی، یعنی اختیار کرتا ہے، پس بیت المال سے متعلق مباح اسالیب خلیفہ کیلئے مباح ہیں نہ کہ ہر ایک کیلئے؛ اسی طرح فوج کے انتظامی امور میں مباح اسلوب خلیفہ کیلئے مباح ہیں، نہ کہ ہر ایک کیلئے؛ یا عوامی امور کی نگہداشت میں جو مختلف مباح اسلوب ہو سکتے ہیں وہ خلیفہ کیلئے مباح ہیں نہ کہ ہر ایک کیلئے۔ لہٰذا ایسے تبنی شدہ احکام کا اتباع کرنا اُنہیں فرض نہیں بنا دیتا، بلکہ خلیفہ کی رائے اور اجتہاد سے، اِن اختیار کئے ہوئے اسلوب و قوانین کا اتباع اُس کا وہ حق تصرف ہے جو شریعت نے خلیفہ کو دیا ہے۔ حالانکہ یہ ایک مباح عمل کا معاملہ ہے جسے اختیار یا تبنی کر کے خلیفہ نے عوام کو اس کا پابند بنایا ہے، اور اس کے مقابلے میں دوسرے مباح اسالیب سے روک دیا ہے، لیکن یہ مباح خلیفہ کیلئے ہے تاکہ وہ عوام کے معاملات کی نگہداشت بہتر طور سے کر سکے، عوام کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ (خلیفہ کے ایک اسلوب تبنی کرنے کے بعد) دوسرے اسلوب کو اختیار کریں۔ لہٰذا ہر وہ

مباح جو خلیفہ نے رعایا کے امور کی نگہداشت کیلئے اپنی رائے اور اجتہاد سے اختیار (تبنی) کیا ہو، اسکی اطاعت عوام پر واجب ہوئی۔ اسی بنیاد پر حضرت عمر بن خطابؓ نے مختلف محکموں کیلئے دیوان تیار کروائے، جن کو خلفاء نے ریاست کے ملازمین کیلئے قوانین وضابطے مرتب کئے اور ملازمین کو ان ضابطوں کا پابند بنایا۔ اسی نہج پر یہ جائز ہے کہ اداری یا انتظامی اور دیگر قوانین مرتب کئے جائیں جن کا اتباع ہر ایک پر لازم ہو کیونکہ یہ اتباع دراصل خلیفہ کی اطاعت کے ذیل میں آتا ہے جو کہ شرعاً فرض ہے۔

البتہ یہ قوانین وضابطے، مباح کے ضمن میں ہونگے جو عوام کے امور چلانے کیلئے ضروری ہوں، یعنی وہ معاملات جن میں خلیفہ کو اپنے اجتہاد اور رائے کا تصرف شرعاً ہو مثلاً محکموں کے نظم، فوجوں کی ترتیب اور اسی جیسے دیگر امور، نہ کہ ہر ایک مباح، بالفاظ دیگر وہ امور جو خلیفہ کیلئے باعتبار خلیفہ مباح ہوں۔ رہے باقی احکام جو ہر ایک کیلئے فرض، مندوب، مکروہ، حرام اور مباح ہیں، تو خلیفہ بھی اُن شرعی احکام کا پابند ہوگا، اور اس کیلئے اُن احکام سے خروج مطلقاً جائز نہیں۔ بخاری و مسلم شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((مَن أحْدَثَ في أمرنا هذا ما ليسَ منهُ فهو ردّ۔))

جو کوئی ہمارے معاملے میں کوئی نئی چیز داخل کردے جو اُس کا حصہ نہیں، تو وہ ردّ ہے۔

اس کا اطلاق عام ہے، یعنی خلیفہ پر بھی اس کا اطلاق ہوگا۔

خلیفہ احکامات تبنی کرنے میں شرع کا پابند ہے:

خلیفہ احکامات تبنی کرنے میں شریعت کا پابند ہوتا ہے، اس کے لئے یہ حرام ہے کہ وہ کوئی ایسا حکم تبنی کرے جس کا استنباط ادلہ شرعیہ سے صحیح نہ ہو۔ وہ اپنے تبنی کئے ہوئے احکام کا بھی پابند ہے اور اُس اجتہاد کے طریقے کا بھی، یہ جائز نہیں کہ وہ کسی ایسے طریقے سے استنباط کرے جو اُس کے اپنے طے شدہ طریقے سے متناقض ہو اور نہ ہی وہ کوئی ایسا حکم جاری کرسکتا ہے جو اس کے ذریعے تبنی شدہ سابقہ احکام سے ٹکراتا ہو۔

اس ضمن میں دو باتیں قابلِ غور ہیں: اول یہ کہ خلیفہ احکام کی تبنی میں شریعت کا پابند ہو، یعنی قانون سازی میں شریعت کا التزام ملحوظ ہو اور قوانین اسی بنیاد پر وضع کئے جائیں، کیونکہ اسلامی ریاست کیلئے یہ جائز ہی نہیں کہ اس میں قوانین کی بنیاد شرع کے خلاف ہو، جو کہ سراسر کفر ہوگا۔ دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ خلیفہ اپنے تبنی شدہ احکام کا، اور اپنے طریقہ استنباط کا بھی پابند ہو۔ اگر کوئی حکم شرع کے خلاف تبنی کرلیا گیا ہو تو یہ دیکھا جائیگا کہ کیا خلیفہ خود اُس حکم کو خلاف شرع سمجھ رہا ہے یا نہیں، اگر خلاف شرع سمجھتے ہوئے حکم تبنی کیا ہے تو خلیفہ کفر کا مرتکب ہوا اور مرتد ہوگیا؛ اور اگر شکل یہ ہوتی ہے حکم کو شرع کے خلاف نہ سمجھتے ہوئے اختیار کیا، تو یہ حرام تو ہوگا لیکن اُس پر کفر کا اطلاق نہیں ہوگا۔ یہی صورتِ حال خلفاء بنی عثمان کے ساتھ اُن کے آخری دور میں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک صورت یہ بھی ممکن ہوسکتی ہے کہ خلیفہ کو کسی حکم کے تبنی کرنے میں اشتباہ ہو

اور وہ اس شبهة الدليل کے تحت کسی مصلحت کے باعث قائدۃ المصالح المرسلہ؛ سد الذرائع یا مآلات الافعال وغیرہ کو شرعی دلیل مانتے ہوئے رجوع کرے اور حکم تبنی کرے، تو نا یہ حرام ہوگا اور نا اس پر کفر کا اطلاق ہوگا، البتہ وہ خطا کار ہوگا، تاہم ایسا حکم شرعی حکم مانا جائیگا اور اُس کی اطاعت ہر مسلمان پر لازم ہوگی، کیونکہ بہرحال یہ شرعی حکم ہے جس پر شبهة الدليل ہے، اگرچہ اس کے استنباط میں غلطی سرزد ہوئی ہے۔ خلیفہ کو بہرحال احکام کی تبنی میں شریعتِ اسلامی ہی کا پابند رہنا ہے جن کو صحیح طریقہ سے مستنبط کیا گیا ہے۔ اس کی دلیل حسبِ ذیل ہے:

۱- اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان پر، چاہے وہ خلیفہ ہی ہو، یہ فرض کیا ہے کہ وہ اپنے تمام افعال میں شریعتِ اسلامی کا پابند ہو، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَلاَ وَ رَبِّكَ لَا يُؤمِنُونَ حَتّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَينَهُم ثُمّ لَا يَجِدُوا فِيّ أَنفُسِهِم حَرَجاً مِمّا قَضَيتَ وَيُسَلِّمُوا تَسلِيماً﴾

پس تمہیں تمہارے ربّ کی قسم! یہ مومن نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اُن کے درمیان جو نزاع ہو، اُس میں یہ تم سے فیصلہ نہ کرائیں، پھر تم جو فیصلہ کر دو اس پر یہ اپنے دل میں کوئی تنگی بھی نہ پائیں، اور پوری طرح تسلیم کر لیں۔ (ترجمہ معانیٔ قران: نساء: ۶۵)

شریعت کے مطابق اپنے افعال و امور کو انجام کیلئے یہ بات لازم ہو جاتی ہے کہ، جہاں شارع کے خطاب سے ایک سے زیادہ مفہوم اخذ ہو رہے ہوں، تو اُن میں سے کسی ایک مفہوم کو اختیار کر کے اس کی پابندی کی جائے؛ یہ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ کسی عمل میں یا خلیفہ کسی حکم کو نافذ کرنے کیلئے، شارع کے خطاب سے ایک مفہوم اختیار کرے۔

۲- اُس بیعت کے متن کی رو سے جو خلیفہ کو دی گئی، یہ بات لازم ہو جاتی ہے کہ خلیفہ شریعتِ اسلامی کا پابند رہے، کیونکہ اُس کو دی گئی بیعت اللہ کی کتاب اور سنتِ رسول ﷺ پر ہی مبنی ہے۔ خلیفہ کیلئے یہ قطعاً جائز نہیں کہ اُس سے تجاوز کرے؛ اگر خلیفہ دانستہ شریعت سے خروج کرتا ہے تو وہ کفر کا مرتکب ہوگا؛ اور اگر شریعت سے تجاوز دانستہ نہیں ہے تب بھی وہ گنہگار، ظالم اور فاسق ہوگا۔

۳- خلیفہ کا تقرر ہی شریعت کو نافذ کرنے کیلئے کیا جاتا ہے، پس اُس کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ شریعت کے علاوہ کسی اور شئے سے رجوع کرے، کیونکہ اس سے شریعت نے مطلقاً اور قطعی طور پر منع کیا ہے، اس ممانعت کی قطعیت اتنی شدید ہے کہ یہ بات غیر اسلام سے حکومت کرنے والے کے ایمان کی نفی تک پہنچتی ہے اور یہ اس ممانعت کی قطعیت پر قرینہ ہے۔ اس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچی کہ

خلیفہ احکام تبنی کرنے میں یعنی قوانین وضع کرنے میں شریعت کا پابند ہے، اور اگر وہ کسی قانون کو خلاف شرع مانتے ہوئے بھی وضع کرتا ہے، تو وہ اِس حالت میں کفر کا مرتکب ہوگا لیکن اگر وہ خلاف شریعت قانون وضع تو کرتا ہے مگر اُن پر اس کا عقیدہ نہیں ہے تو بھی وہ ظالم وفاسق ضرور ہوگا۔

اب دوسرے پہلو پر غور کریں کہ خلیفہ نہ صرف اپنے تبنی شدہ احکام کا پابند ہے بلکہ اپنے اختیار کئے ہوئے استنباط کے طریقہ کا بھی پابند ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ خلیفہ جو حکم شرعی (نہ کہ ہر ایک شرعی حکم) تبنی کرتا ہے، وہ اُس کے اپنے لئے شریعت کا حکم ہے نہ کہ دوسروں کیلئے؛ بالفاظِ دیگر، خلیفہ جو حکم تبنی کرتا ہے، یا اس حکم میں کسی کی تقلید کرتا ہے، تو وہ حکم، خلیفہ کی گردن پر اللہ کا حکم ہوگا، اب وہ اس حکم کے خلاف کوئی قانون وضع نہیں کرسکتا، بلکہ وہ اسی کے تبنی شدہ حکم کا پابند رہیگا، اس کے برخلاف جو بھی حکم ہوگا وہ اس کیلئے شرعی حکم کی حیثیت نہیں رکھتا اور نہ ہی عوام کیلئے ایسے حکم کی حیثیت شرعی حکم کی ہوگی۔ لہٰذا وہ قانون صادر کرنے میں اسی حکم کا پابند ہوگا جو اُس نے اختیار یا تبنی کر رکھے ہوں اور اُن سے تجاوز یا اُن کی خلاف ورزی اس کیلئے جائز نہیں۔ ایسے قوانین جو تبنی شدہ احکام کے خلاف ہوں وہ خلافِ شرع تصور کئے جائینگے۔ لہٰذا خلیفہ کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے ہی تبنی شدہ احکام کے خلاف کوئی حکم جاری کرے۔

مزید یہ کہ ایک متعین طریقۂ استنباط کے تبدیل کردینے سے، اس کے ذریعے اخذ کئے ہوئے حکم شرعی کا تصور اور فہم بھی بدل جاتا ہے۔ یعنی اگر خلیفہ کسی حکم کی علت کو، اگر وہ نصوص شرع میں ہے سے شرعی علت مانتا ہے، نہ کہ مصلحت کو، یا مفادِ عام (**المصلحة المرسلة**) کو شرعی دلیل تصور کرتا ہے؛ تو اُس خلیفہ نے اپنے لئے استنباط کا ایک طریقہ متعین کرلیا، اب اُس کیلئے یہ واجب ہوگیا کہ وہ اس خاص طریقے سے ہی استنباط کرے اور اسی کا پابند رہے۔ اب وہ ایسا کوئی حکم اختیار نہ کرے جس کی بنیاد **المصالح المرسلة** پر ہو، یا کسی ایسی علت پر قیاس کرے جو نصوص شرعیہ میں نہ ہو۔ ایسا حکم اس کے لئے اللہ کا حکم نہیں ہوگا، کیونکہ خلیفہ کی دانست میں اس حکم کی دلیل شرعی دلیل نہیں ہے۔ جب یہ حکم اس کی اپنی نظر میں شرعی حکم نہیں ہوا تو وہ ایسے حکم کا مسلمانوں کو پابند کیونکر کرسکتا ہے؟ یہ فعل اُس کیلئے غیر شرعی حکم اختیار کرنے کے مترادف ہوگا جو کہ اس کیلئے حرام ہے۔ اس کے برعکس اگر خلیفہ وقت صرف مقلد ہے یا مجتہد المسئلہ (صرف ایک معاملے میں مجتہد) ہے، اور استنباط کیلئے اس کا اپنا کوئی متعین طریقہ نہیں ہے تو ایسی صورت میں اس کیلئے یہ جائز ہے کہ وہ کوئی بھی حکم شرعی تبنی کرے چاہے اس کی کوئی بھی دلیل ہو حتی کہ محض دلیل کا شبہ (**شبهة الدليل**) بھی۔ اب وہ کسی ایک طریقۂ استنباط کا پابند نہیں، البتہ اُن احکام کا پابند وہ بہر حال رہیگا جو اس نے صادر و جاری کئے ہوں۔

خلیفہ کی معزولی:

خلیفہ کی موجودہ حالت یا حیثیت میں کوئی بھی ایسی تبدیلی آنے پر جو اسے خلافت سے برطرف کر دیتی ہو؛ خلیفہ خود بخود معزول ہو جائیگا، یا خلیفہ کی حیثیت میں ایسی تبدیلی واقع ہو جائے، جس سے وہ خود بخود خلافت سے نہیں ہٹ جاتا، لیکن شریعت کی رو سے، وہ خلیفہ بھی نہیں رہ سکتا، تو اس کا ہٹایا جانا واجب ہو جائیگا۔

اِن دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں، اس کی اطاعت عوام پر واجب نہیں رہ جائیگی، جب کہ دوسری صورت میں اس کی اطاعت اس وقت تک واجب رہیگی جب تک کہ وہ عملی طور پر معزول نہیں کر دیا جاتا۔

پہلی صورتِ حال کے واقع ہونے کیلئے مندرجہ ذیل تین شکلیں ہونگی:

پہلی شکل: اگر خلیفہ مرتدّ ہو جائے؛ کیونکہ خلیفہ کا مسلم ہونا اسکے انعقاد کی شرائط میں سے ہے۔ یہ شرط ایسی ہے جو صرف انعقاد تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ شرط مستمر ہے یعنی ہمیشہ کیلئے ہے۔ جو شخص اسلام سے پھر گیا، اگر وہ رجوع نہیں کرتا ہے، تو وہ کافر ہو جائیگا اور اس کا قتل واجب ہوگا؛ اور کافر کا مسلمانوں پر حاکم ہونا جائز نہیں کیونکہ کافر کیلئے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کو مسلمانوں پر راہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَنْ يَّجْعَلَ اللهُ لِلكَافِرِينَ عَلَى المومنين سَبِيْلاً﴾ اور اللہ کبھی کفار کو اہلِ ایمان کے مقابلے میں کوئی راہ نہیں دیگا۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن: نساء:۱۴۱)

اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے:

﴿أَطِيْعُواْ اللهَ وَ أَطِيعُواْ الرَّسُولَ وَ أُوْلِى الأَمْرِ مِنْكُمْ﴾

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اُن کی جو تم میں صاحب امر ہیں۔

(ترجمہ معانیٔ قرآنِ کریم: نساء:۵۹)

امر، یعنی حکومت کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ ''جو تم میں سے'' (منکم) یہ واضح کرتا ہے کہ حاکم مسلمان ہی ہو، اور جب ولی امر (حاکم) کافر ہو گیا تو وہ ہم میں سے نہیں رہا، جس سے اسکی وہ صفت (یعنی اسلام) جاتی رہی جس کا از روئے قرآن وہ پابند ہے۔ اب وہ خلیفہ نہیں رہا اور اسکی اطاعت واجب نہیں رہی۔

دوسری شکل: اگر خلیفہ اس طرح مجنون ہو جائے کہ اسکی ٹھیک حالت میں واپسی نہ ہو سکتی ہو۔ کیونکہ عاقل ہونا خلیفہ کے انعقاد کی شرائط میں سے ہے، اور یہ شرط بھی استمراری ہے یعنی ہمیشہ کیلئے ہے، نہ کہ صرف انعقاد کے وقت تک کیلئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((رُفع القلم عن ثلاثة: عن الصبي حتى يبلغ؛ وعن النائم حتى يستيقظ؛ و عن المعتوه

حتی یبرأ۔))

تین قسم کے لوگوں کا محاسبہ نہیں ہوگا: لڑکا، جب تک کہ وہ سن بلوغ کو نہ پہنچے؛ سویا ہوا شخص، جب تک کہ وہ نیند سے نہ جاگ جائے؛ اور مجنون (دیوانہ) جب تک کہ وہ ٹھیک نہ ہو جائے۔

دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: **عن المجنون المغلوب علی عقله حتی یفیق**..... یعنی تین قسم کے لوگوں کا محاسبہ نہیں ہوگا: مجنون جسکی عقل درست نہیں، اب جس پر سے قلم اُٹھالی گئی ہو، یا جسے محاسبے سے معاف رکھا گیا ہو، وہ اپنے ہی امور نہیں سنبھال سکتا تو یہ بات اور زیادہ واضح ہوئی کہ وہ دوسروں کے معاملات کی نگہداشت نہیں کرسکتا۔

تیسری شکل: اگر خلیفہ کسی زبردست طاقت کی قید میں چلا جائے جس سے نجات پالینا اُس کے اختیار میں نہ ہو، اور نا ہی اسے چھڑا لینا ممکن ہو۔ کیونکہ اس قید میں وہ مسلمانوں کے معاملات کی نگہداشت نہیں کرسکتا اور وہ معدوم مانا جائیگا۔

ان تین حالتوں میں خلیفہ، خلافت سے علیحدہ ہو جاتا ہے اور معزول تصور کیا جاتا ہے چاہے اسکی برطرفی نہ بھی کی گئی ہو، اب اسکی اطاعت واجب نہیں رہتی۔ اس کے احکام اب نافذ نہیں ہو سکتے، اگر ایسے شواہد موجود ہوں جو اِن تین میں سے کسی ایک بھی شکل کو ثابت کرتے ہوں۔ البتہ یہ لازم ہے کہ اِن میں سے کسی بھی شکل کا ثبوت موجود ہو اور عدالتِ مظالم (**محکمة المظالم**) اِن شواہد کو قائم کرے اور یہ حکم جاری کرے کہ خلیفہ، خلافت سے علیحدہ ہو گیا ہے اور اسے معزول کر دیا گیا ہے، تاکہ مسلمان اب نئے خلیفہ کا انعقاد کرسکیں۔

رہی وہ دوسری صورتِ حال جس میں از خود خلیفہ معزول نہیں ہو جاتا، لیکن اُس کا خلافت پر قائم رہنا بھی جائز نہیں، تو یہ پانچ شکلیں ہیں:

پہلی شکل: اگر اسکی صفتِ عدل اس طرح مجروح ہو جاتی ہے کہ فسق عیاں ہو جائے۔ عدل خلیفہ کے انعقاد کیلئے شرائط میں سے ایک لازمی شرط ہے، اور یہ شرط بھی استمراری ہے، یعنی ہمیشہ رہنا چاہئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ایک گواہ کیلئے عدل کو شرط رکھا ہے تو اس شرط کا استمرار سے خلیفہ میں ہونا اولیٰ ہو جاتا ہے۔

دوسری شکل: اگر خلیفہ زنانہ یا زن نما (Effeminate) بن جائے۔ کیونکہ مرد ہونا بھی خلافت کے انعقاد کیلئے شرطِ استمراری ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا: لن یفلح قوم ولّوْا أمرهم

امرأۃ ؛یعنی، وہ قوم جو اپنے امور پر عورت کو حاکم بنالے، ہرگز کامیاب نہیں ہوگی۔(بخاری شریف میں ابی بکرۃ سے مروی)

تیسری شکل: اگر خلیفہ پر جنون کے دورے پڑیں جن کی وجہ سے کبھی وہ ٹھیک حالت میں ہو اور کبھی جنون کی حالت میں، کیونکہ ذی عقل ہونا خلافت کی شرائط میں سے ایک استمراری شرط ہے، یعنی ہمیشہ رہنے والی؛ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا ارشاد ہے:

رُفع القلم عن ثلاثة: عن الصبي حتى يبلغ؛ وعن النائم حتى يستيقظ؛ و عن المعتوه حتى يبرأ. یعنی تین قسم کے لوگوں کا محاسبہ نہیں ہوگا: لڑکا، جب تک کہ وہ سن بلوغ کو نہ پہنچے؛ سویا ہوا شخص، جب تک کہ وہ نیند سے نہ جاگ جائے؛ اور مجنون (دیوانہ) جب تک کہ وہ ٹھیک نہ ہو جائے۔ اب جس پر سے قلم اُٹھالی گئی ہو، یا جسے محاسبہ سے معاف رکھا گیا ہو، وہ اپنے ہی امور نہیں سنبھال سکتا تو یہ بات اور زیادہ واضح ہوئی کہ وہ دوسروں کے معاملات کی نگہداشت بھی نہیں کرسکتا۔

چوتھی شکل: خلافت کی ذمہ داریاں کسی بھی سبب نہ نباہ پانے کی حالت میں۔ یہ سبب جسم کے کسی حصے کے نہ ہونے کا ہوسکتا ہے یا کسی ایسی بیماری کا جو لاعلاج ہو اور جس کی وجہ سے ذمہ داریوں کو نباہ پانا ممکن نہ رہا ہو۔ اِن نواقص یا کمیوں سے، خلیفہ کا ذمہ داریوں کو نہ نباہ پانا عبارت ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ خلافت کے انعقاد کیلئے، اسکی ذمہ داریوں کو نباہنے کی اہلیت رکھنا بھی ایک شرط ہے، اور جب، کسی نقص کی وجہ سے یہ ممکن نہ رہا تو عقد کی شرائط میں سے ایک شرط مفقود ہوگئی، جس کی وجہ سے اس کی معزولی واجب ہوگئی۔ مزید یہ کہ جس کام کیلئے خلیفہ کو متعین کیا گیا تھا، وہ اس کام کے کرنے کی اب اہلیت نہیں رکھتا جس کے سبب دینی کاموں میں تعطل ہوجاتا ہے اور مسلمانوں کے معاملات متاثر ہوتے ہیں جو کہ ایک منکر ہے، چنانچہ اسے معزول کیا جائیگا تا کہ اسکی جگہ نئے خلیفہ کا تعین ہوسکے۔ اس حالت میں اُس خلیفہ کو معزول کرنا واجب ہوجائیگا۔

پانچویں شکل: اگر کسی وجہ سے خلیفہ معذور ہوجائے کہ وہ شریعت کے مطابق اپنی رائے کو نافذ کرتے ہوئے مسلمانوں کے امور کا اہتمام نہ کرسکے۔ اس کی مجبوری اس قدر بڑھ جائے کہ وہ مسلمانوں کے معاملات کو اپنی رائے اور صوابدید سے نگہداشت کر پانے کے قابل نہ

رہے۔خلیفہ کی ایسی حالت اسکے خلافت کی ذمہ داریوں کو نہ نباہ پانے پر عبارت ہوگی اور اسکی معزولی واجب ہوجائیگی۔اس شکل کی دوصورتیں ہوسکتی ہیں:

پہلی صورت یہ کہ خلیفہ کے اوپر اس کے ماتحت کوئی شخص یا کچھ اشخاص اس درجہ اثر انداز یا حاوی ہوجائیں کہ امور کو نافذ کرنا اُن کے ہاتھ میں چلا جائے اور یہ شخص یا اشخاص زبردستی خلیفہ کو اس حد تک اپنی رائے کا پابند بنالیں کہ خلیفہ اُن کی مخالفت نہ کر پائے؛اب یہاں یہ دیکھا جائیگا کہ کیا خلیفہ اُن سے بہت جلد ایک قلیل مدت میں اُن اشخاص کے تسلط سے نجات پالیتا ہے،اگر یہ بات ہے اور خلیفہ اُنہیں ہٹا کر رکاوٹ کو دور کر دیتا ہے،جس سے ایک نقص زائل ہوجاتا ہے تو وہ خلیفہ بنا رہیگا؛اور اگر خلیفہ اُن سے نجات حاصل نہیں کر پاتا،اور حالتِ نقص باقی رہتی ہے تو پھر خلیفہ کو ہٹا دیا جائیگا۔

دوسری صورت یہ کہ خلیفہ کسی طاقتور دشمن کا قیدی بن جاتا ہے یا اُس دشمن کا خلیفہ پر تسلط ہوجاتا ہے۔اس حالت میں یہ دیکھا جائیگا کہ کیا خلیفہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ اس حالت سے نجات پاجائے،ایسی حالت میں یہ مہلت دی جائیگی کہ وہ آزاد ہوسکے اور اپنے اقتدار پر لوٹ آئے،لیکن اگر اس بات کی امید ہی نہ ہو کہ خلیفہ قید یا تلسط سے نجات پاسکتا ہے تو،ایسی حالت میں اسے معزول کر دیا جائیگا۔

اس کا سبب یہ ہے کہ خلیفہ اِن دونوں حالتوں میں شریعت کے مطابق خلافت کی ذمہ داریاں نباہنے سے قاصر ہے،چنانچہ وہ معدوم مانا جائیگا،اور جس بات کیلئے اس کی خلافت کا عقد ہوا تھا،اس کو پورا نہ کر پائیگا۔

بہرحال اگر ان دونوں حالتوں میں اس کے چھوٹ پانے کا امکان ہو تو اسے مہلت دی جائیگی،تاکہ وہ نجات حاصل کرلے،اور اگر نہ کر پائے تو معزول کر دیا جائیگا؛لیکن اگر شروع سے ہی رہائی یا نجات کا امکان نہ ہو،تو پھر فوراً معزول کر دیا جائیگا۔

لہٰذا اِن پانچ شکلوں میں سے کسی ایک بھی شکل کے واقع ہوجانے پر خلیفہ کی معزولی واجب ہوگی۔لیکن ایسی صورتحال میں اس معزولی کیلئے یہ ضروری ہے کہ اس حالت کا حکم صادر ہو۔مزید یہ کہ اِن پانچوں شکلوں میں خلیفہ کی اطاعت بہرحال واجب رہیگی اور اس کے جاری کئے ہوئے احکام قابلِ نفاذ رہینگے،تاوقیکہ اس کے معزول کئے جانے کا حکم یا فیصلہ صادر نہ ہوجائے،کیونکہ اِن پانچوں میں سے کسی بھی حالت میں،اس کی خلافت خود بخود ختم نہیں ہوجاتی جب تک کہ قاضی یہ حکم جاری نہ کردے۔

خلیفہ کو معزول کرنے کا اختیار امت کو نہیں ہوتا:

حالانکہ خلیفہ کو امت ہی بیعت دے کر نصب کرتی ہے، لیکن بہرحال امت کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ ایک بار شرعی طریقہ سے خلیفہ کو بیعت دے کر پھر اُسے برطرف کرے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ صحیح احادیث میں خلیفہ کی اطاعت کو واجب قرار دیا گیا ہے خواہ وہ منکر کرے، ظلم کر جائے یا حقوق دبالے، جب تک کہ وہ کسی معصیت (گناہ) کا حکم نہ دے، اور اس میں کھلا ہوا یا صریح کفر (کفراً بواح) عیاں نہ ہو، بخاری شریف میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ:

مَنْ رَأى مِنْ أميرهِ شيئاً يَكْرَهه فليصبر عليه، فَإنّهُ مَن فَارَقَ الجماعةَ شِبْرَاً فماتَ إلّا ماتَ ميتة جاهيلية۔

جو اپنے امیر میں کوئی ایسی بات دیکھے جو اسے ناگوار ہو تو اُسے چاہئے کہ وہ اُس پر صبر کرے، پس جو کوئی جماعت سے بالشت بھر دور گیا اور اس حالت میں مرا، تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

یہاں لفظ 'امیرہ' یعنی 'اُسکے امیر' عام ہے اور اس کا اطلاق خلیفہ پر ہوتا ہے کیونکہ وہ امیر المومنین ہے۔ اسی طرح مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((كانت بنو إسرائيل تسوسهم الأنبياء'كلما هلك نبيٌ خلفه نبي' و إنه لا نبي بعدي'و ستكون خلفاء فتكثر'قالوا فما تأمرنا؟قال: فوا ببيعة الأول فالأول'و أعطوهم حقهم'فإن الله سائلهم عما استرعاهم۔))

بنی اسرائیل پر انبیاء علیہم السلام حکومت کیا کرتے تھے، جب ایک نبی کا انتقال ہو جاتا تو دوسرا اسکی جگہ لے لیتا تھا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، خلفاء ہونگے اور کثرت سے ہونگے۔ پوچھا گیا کہ ہمارے لئے تب کیا حکم ہے؟ فرمایا: اُن سے اپنی بیعت پوری کرو اور اُن کو اُن کا حق دو، اللہ (خود) اُن سے اس بارے میں محاسبہ کریگا جو اُن کے ذمہ کیا تھا۔

مسلم شریف ہی میں ایک روایت ہے کہ حضرت سلمہ بن یزید الجعفیؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے دریافت کیا کہ اگر ہمارے اوپر ایسے امیر آجائیں جو ہم سے اپنا حق تو وصول کریں لیکن ہمیں ہمارا حق نہ دیں، تو ہم ایسی حالت میں کیا کریں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے منہ پھیر لیا، اُنہوں نے پھر سوال کیا اور حضورؐ نے پھر جواب دینے سے منہ پھیر لیا، اسی طرح دوسری یا تیسری بار پوچھنے پر حضرت اشعث بن قیسؓ نے اُنہیں کھینچ لیا جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا:

((اسمعوا و أطيعوا فإنما عليهم ما حُمِّلوا و عليكم ما حُمِّلْتُم))

سنواور اطاعت کرو کیونکہ ان سے اُن کے اعمال کا محاسبہ ہوگا اور تم سے تمہارے اعمال کا محاسبہ ہوگا۔

مسلم شریف کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((خيار أيمتكم الذين تحبونهم و يحبونكم،و تصلّون عليهم و يصلون عليكم، وشرار أيمتكم الذين تبغضونهم و يبغضونكم،و تلعنونهم و يلعنونكم،قيل يا رسول الله أفلا ننابذهم باسيف فقال:لا،ما أقاموا فيكم الصلاة،ألا مَن وليَ عليه وال،فرآه يأتي شيئاً مِن معصية الله فليكره ما يأتي مِنْ معصية الله،ولا ينزعنّ يداً مِن طاعة))

تمہارے بہترین امام وہ ہیں جو تم سے محبت کریں اور تم اُن سے محبت کرو،تم اُن کیلئے دعا کرو وہ تمہارے لئے دعا کریں،اور سب سے برے امام وہ ہیں جو تم سے نفرت کریں اور تم اُن سے نفرت کرو،اور وہ تمہارے لئے بددعا کریں اور تم اُن کیلئے،(آپ ﷺ سے) پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ کیا ہم اُن سے جنگ نہ کریں؟ فرمایا:نہیں،جب تک کہ وہ تم میں صلاۃ قائم کرتے رہیں۔(لیکن) خبردار،تم میں سے جو شخص اپنے کسی والی کو گناہ کرتے دیکھے،تو وہ اس کے اُس گناہ سے نفرت کرے مگر والی کی اطاعت سے اپنا ہاتھ نہ کھینچے(مسلم شریف؛بروایت عوف ابن مالکؓ)

حضرت حذیفہ بن الیمانؓ سے مسلم شریف میں نقل کیا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

((يكون بعدي أئمة لا يهتدون بهدي،ولا يستنون بسنّتي،و سيقوم فيكم رِجالٌ قلوبهم قلوب الشياطين في جثمان إنس،قال:قلت:كيف أصنع يا رسول الله إن أدركت ذلك؟قال:تسمع و تطيع للأمير و إن ضرب ظهرك، و أخذ مالك،فاسمع و أطع))

میرے بعد ایسے امام ہونگے جو میری طرز کی ہدایت پر نہیں ہونگے،نہ ہی میری سنتوں پر عمل کرینگے،اور تم میں ایسے لوگ کھڑے ہونگے جن کے دل،انسانی جسم میں شیطانی دلوں کے مانند ہونگے۔حضرت حذیفہؓ نے پوچھا کہ اگر میں اُس وقت کو پہنچوں تو میں کیا کروں؟ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے) فرمایا:سنو اور اطاعت کرو،خواہ امیر تمہاری پیٹھ پر مارے اور تمہارا مال لے لے،پس تم سنو اور اطاعت کرو۔

مسند احمد اور سنن ابی داؤد میں روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا:

((يا ابا ذركيف بك عند ولاة يستأثرون عليك بهذا الفيء؟ قال:والذي بعثك بالحق أضع سيفي على عاتقي،فأضرب به حتى الحقك،أفل ا أدلك على خير لك مِن ذلك،تصبر حتى تلقاني))

اے ابوذرؓ اگر ایسے والی ہو جو مال غنیمت سب خود رکھ لیں اور تمہیں نہ دیں تو تم کیا کرو گے؟ (حضرت ابوذرؓ نے) کہا: قسم اُس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا، میں اپنی تلوار اُٹھا کر اُن سے اُس وقت تک لڑونگا حتی کہ آپ ﷺ کے پاس پہنچ جاؤں۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے) فرمایا: کیا میں تمہیں اس سے بہتر بات نہ بتاؤں، صبر کرنا حتی کہ تم میرے پاس پہنچ جاؤ۔

اِن تمام احادیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ ممکن ہے کہ خلیفہ شریعت کے خلاف عمل کرے، لیکن اس کے باوجود حضور ﷺ نے یہ حکم دیا کہ اس کے اس ظلم پر صبر کرتے ہوئے اس کی اطاعت کی جائے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ امت خلیفہ کو معزول کرنے کا حق نہیں رکھتی۔ بخاری شریف میں حضرت جابر ابن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی نے حضور ﷺ سے بیعت کی، پھر جب وہ بیمار ہوا تو اس نے کہا "أقلني بيعتي" یعنی مجھے اپنی بیعت سے آزاد کر دیجئے، حضور ﷺ نے انکار کر دیا اور وہ چلا گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((المدينة كالكير تنقي خبثها، و ينْصعُ طيبُها۔))

شہر مدینہ (لوہار کی) بھٹی کی طرح ہے، جو گندگی سے پاک کر دیتا ہے اور اسکی چمک نکھر آتی ہے۔

یہ اس بات کی دلیل ہوئی کہ ایک بار بیعت دینے کے بعد واپس نہیں لی جا سکتی اور یہ کہ بیعت دینے والا اپنی بیعت کا پابند رہیگا۔ لہٰذا جب بیعت واپس نہیں لی جا سکتی تو امت کو خلیفہ کے معزول کرنے کا بھی حق نہیں ہوا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اعرابی اپنی بیعت واپس لے کر اسلام ہی سے نکلنا چاہتا تھا نہ کہ سلامی ریاست کے امیر کی اطاعت سے؛ کیونکہ اگر یہ بات ہوتی تو وہ اعرابی ارتداد کا مرتکب ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اس کے قتل کا حکم دیتے جو کہ ایک مرتد کی سزا ہے۔ مزید یہ کہ بیعت اطاعت کی ہوتی ہے نہ کہ اسلام میں داخل ہونے کی۔ اس لئے یہ بات طے ہے کہ اعرابی اطاعت سے بری الذمہ ہونا چاہتا تھا نہ کہ اسلام سے۔ اس لئے مسلمانوں کو یہ حق نہیں کہ وہ بیعت سے باہر ہو جائیں، لہٰذا وہ خلیفہ کو معزول کرنے کا حق بھی نہیں رکھتے۔ البتہ شریعت نے واضح کر دیا ہے کہ خلیفہ کن حالات میں خود بخود معزول ہو جاتا ہے اور یہ بھی واضح کر دیا کہ کن حالات میں خلیفہ کو برطرف کر دیا جاتا ہے، لیکن اس کا یہ بھی مطلب قطعاً نہیں کہ خلیفہ کو معزول کرنے کا امت کو اختیار ہے۔

محکمہ مُظالم ہی خلیفہ کو برطرف کر سکتا ہے:

محکمہ مُظالم ہی وہ ادارہ ہے جو یہ فیصلہ کرنے کا مکلّف ہے کہ کیا حالات میں وہ تبدیلی آئی ہے کہ خلیفہ کو برطرف کر دیا جائے یا نہیں، اور محکمہ مُظالم ہی وہ واحد ادارہ ہے جو خلیفہ کو معزول یا خبردار (Warning) کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔

کسی بھی ایسے واقعہ کا ہونا جن میں خلیفہ یا تو معزول ہو جاتا ہے یا اسے برطرف کر دیا جانا واجب ہو جاتا ہے، دراصل مظالم میں سے ایک مظلمہ ہے جس کا ازالہ کیا جانا ضروری ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ اس بات کا ثبوت بھی درکار ہوتا ہے کہ

حالات میں ایسی تبدیلی واقع ہوئی ہے جس سے خلیفہ معزول ہوجاتا ہے یا برطرف کر دیا جاتا ہے۔ یہ ضروری ہوگا کہ ایسے ثبوت کو ایک قاضی ہی کے سامنے پیش کیا جائے۔ کیونکہ محکمہ مُظالم ہی وہ ادارہ ہوتا ہے جو مظالم کا تدارک اور ازالہ کرتا ہے اور اس محکمہ کا قاضی ہی اس بات کا اختیار اور استطاعت رکھتا ہے کہ کیا حالات میں ایسی تبدیلی واقع ہوئی ہے جس سے خلیفہ کو معزول کر دیا جانا ضروری ہوگیا ہے۔ اگر ایسے حالات ہوتے ہیں اور خلیفہ از خود علیحدہ ہوجاتا ہے تو معاملہ یہیں ختم ہوجاتا ہے؛ لیکن اس کے برعکس اگر مسلمان یہ سمجھیں کہ خلیفہ کو معزول ہوجانا چاہئے لیکن خلیفہ اس بات میں اُن سے تنازعہ کرے تو پھر یہ معاملہ محکمہ مُظالم سے رجوع کیا جائیگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فإن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيءٍ فَرُدُّوهُ إلى اللهِ وَالرَّسُولِ﴾

پھر اگر کسی چیز میں تمہارا تنازعہ ہوجائے تو، اُسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔ (ترجمہ معانی قرآن کریم: نساء:۵۹)

یعنی یہاں تنازعہ لوگوں اور اُن کے ولی امر کے مابین ہوا، جس میں رجوع اللہ اور اسکے رسول سے کیا جائیگا، یعنی ان کے احکام سے جو کہ قضاۃ کا معاملہ ہے یعنی محکمہ مُظالم کا۔

۵- ریاست خلافت

ایک بشری ریاست ہے نہ کے روحانی ریاست

اسلامی ریاست خلافت ہوتی ہے، کیونکہ یہی وہ منصب ہے جس کو ریاست کے تمام حکم واقتدار اور قانون سازی، بلا استثناء حاصل ہوتے ہیں۔ یہ دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کی امارتِ عامہ ہوتی ہے، جو اسلامی شریعت کے احکام کو، اسلامی فکر سے قائم و نافذ کرتی ہے اور تمام عالم کو اس کی دعوت پہنچاتی ہے، یہ دعوت عالم کے سامنے اسلام کی تبلیغ کر کے دی جاتی ہے اور اس کیلئے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا جاتا ہے۔ اس ریاست کو مسلمانوں کی امامت یا امارت بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک دنیوی منصب ہے نہ کہ کوئی اُخروی منصب۔ اس کا مقصد دینِ اسلام کو بنی نوع انسان کی زندگیوں پر نافذ کرنا، اور تمام انسانوں میں اس کو پھیلانا ہے۔ یہ قطعی طور نبوت کے مقام سے علیحدہ ہے، کیونکہ نبوت اور رسالت میں نبی اور رسول ہوتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کی شریعت بذریعہ وحی ملتی ہے جس کی وہ لوگوں میں تبلیغ کرتے ہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ نافذ ہو یا نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا عَلَى الرَّسولِ إلا البَلاغُ المُبِينُ﴾

اور رسول پر تو بس صاف صاف پہنچا دینے ہی کی ذمہ داری ہے (ترجمہ معانی قرآن کریم: سورۂ نور: آیت: ۵۴)

﴿فَإِنَّمَا عَلَيْكَ البَلاغُ﴾

تو تم پر ذمہ داری صرف پہنچا دینے کی ہے (ترجمہ معانی قرآن کریم: سورۂ آل عمران: آیت: ۲۰)

﴿مآ عَلَى الرَّسُولِ إلا البَلاغُ﴾

رسول پر پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری نہیں (ترجمہ معانی قرآن کریم سورۂ المائدہ: آیت: ۹۹)

یہ خلافت سے مختلف ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی شریعت کو انسانوں پر نافذ کرتی ہے۔ کسی کے نبی یا رسول ہونے کیلئے یہ شرط نہیں ہوتی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی شریعت جو اُس نے بذریعہ وحی نازل کی ہو اس کو لوگوں پر نافذ کرے؛ اس کے نبی یا رسول ہونے کیلئے صرف یہ کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس پر بذریعہ وحی شریعت نازل کی ہو۔

اس طرح منصبِ خلافت، نبوت و رسالت کے منصب سے مختلف ہے۔ نبوت ایک منصب ہے جو اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے دیتا ہے، جبکہ خلافت ایک بشری اور انسانی منصب ہے جو مسلمان جسے پسند کرتے ہیں بذریعہ بیعت دیتے ہیں، اور اپنے اوپر خلیفہ بنا لیتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم حاکم تھے اور اُس شریعت کو نافذ کرتے تھے جو اللہ نے اُن پر نازل کی تھی۔ آپ ﷺ ایک ہی وقت میں منصبِ نبوت اور منصبِ رسالت پر فائز تھے اور مسلمانوں کی امارت پر رہتے ہوئے احکام اسلام کو نافذ بھی کرتے تھے، جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اُنہیں حکم دیا تھا، جس طرح دین اسلام کی تبلیغ کا حکم دیا تھا۔ مثلاً:

﴿وَ أن أحكُم بَينَهم بِمآ أنْزَلَ اللهُ﴾

اور یہ کہ تم اُن کے درمیان وہی فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ المائدہ:۴۹)

﴿إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ الكِتَابَ بِالحَقِّ لِتَحْكُمَ بَينَ النَّاسِ بِمَآ أَرَئك اللهُ﴾

بے شک ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے، تاکہ اللہ نے جو کچھ تم پر ظاہر کیا ہے تم اسی کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ نساء:۱۰۵)

﴿يَآ أَيُّها الرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنْزِلَ إِلَيكَ مِن رَّبِّكَ﴾

اے رسول، تمہارے رب کی طرف سے تم پر جو کچھ نازل ہوا ہے اسے پہنچادو؛ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورہ مائدہ:۶۷)

﴿وَ أُوحِيَ إِلَيَّ هذا القُرآنُ لأُنْذِرَكُمْ بِهِ وَ مَن بَلَغَ﴾

اور یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ سے تمہیں خبردار کردوں اور جس کسی کو یہ پہنچے وہ بھی یہ کام انجام دے (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ انعام:۱۹)

﴿يَآ أَيُّها المُدَّ ثِّرُ☆قُمْ فَأَنْذِرْ﴾

اے اوڑھنے لپیٹنے والے، اٹھو اور خبردار کرنے میں مصروف ہو (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورہ مدثر ء:۱،۲)

آپ ﷺ اسلام کی تبلیغ زبان سے بھی کرتے تھے، مثلاً جب آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ اس حکم کی تبلیغ کی:

﴿وَأَحَلَّ اللهُ البَيعَ وَ حَرَّمَ الرِّبَوٰا﴾

حالانکہ اللہ نے بیع کو جائز اور سود کو حرام قرار دیا ہے (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ بقر:۲۷۵)

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم عملاً بھی تبلیغ کرتے تھے، مثلاً آپ ﷺ نے بلا کسی تردد کے معاہدۂ صلح حدیبیہ کیا، اور اس معاملہ میں بغیر کسی سے مشورہ کئے، یہ قطعی حکم دیا کہ اس پر عمل کیا جائے۔ بلکہ اگر کسی کی رائے اللہ کے حکم کے خلاف ہوئی تو اس سے انکار بھی فرمایا۔ اور اگر کسی ایسے حکم کے بارے میں آپ ﷺ سے دریافت کیا جاتا جس کے بارے میں ابھی تک کوئی وحی نازل نہ ہوئی ہو، تو آپ ﷺ نے بغیر کوئی جواب دئے سکوت بھی فرمایا، جب تک کہ وحی نازل نہ ہوگئی۔ لیکن جب آپ ﷺ کسی کام کیلئے کھڑے ہوتے تو لوگوں سے مشورہ فرماتے، اور جب اس معاملہ میں فیصلہ کردیتے تو یہ نہ کہتے کہ یہی حقیقت ہے بلکہ فرماتے کہ جو کچھ دلائل اُنہوں نے سنے، یہ (فیصلہ) اس کے مطابق ہے۔ جس وقت سورۂ توبہ نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو بھیجا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے قافلے میں جائیں جو حج کیلئے مکہ گیا ہوا تھا اور لوگوں تک سورۂ توبہ پہنچادیں، چنانچہ حضرت علیؓ نے عرفات میں لوگوں کو سورۂ توبہ سنائی اور اُن کے ساتھ رہے یہاں تک کہ سب تک پہنچادی۔ پھر آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقعہ پر تمام صحابۂ کرام کے مشوروں کو ٹھکرادیا اور اپنی رائے پر قائم رہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی تھی۔ اسی طرح

جب حضرت جابرؓ نے حضور ﷺ سے اپنے مال کے بارے میں دریافت کیا تو آپ ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا جب تک کہ اللہ کا حکم وحی کے ذریعہ نازل نہ ہوگیا۔ بخاری شریف میں محمد ابن المنکدر سے روایت ہے:

((سمعت جابر بن عبدالله يقول:مرضت فعادني رسول الله ﷺ و أبو بكر رضي الله عنه و هماماشيان،فأتاني وقد أغمي عليّ،فتوضأ رسول اللهؐ فصبَّ عليّ وضوءه فأفقت،فقلت: يا رسول اللهؐ كيف أصنع مالي؟ كيف أقضي في مالي؟ فلم يجبني بشيء حتى نزلت آية الميراث۔))

میں نے جابر بن عبداللہؓ سے یہ سنا کہ، میں (حضرت جابرؓ) بیمار ہوا تو حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ میرے پاس پیدل تشریف لائے، اس وقت میں بے ہوشی میں تھا، حضور ﷺ نے وضو فرمایا اور اس کا پانی میرے اوپر چھڑکا، پھر مجھے ہوش آیا تو میں نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ میں اپنے مال کا کیا کروں، اس مال کا کیا فیصلہ کروں؟ تو حضور ﷺ نے مجھے کوئی جواب نہ دیا جب تک کہ میراث کے بابت آیت نازل نہ ہوگئی۔

یہ تمام امور آپ ﷺ کے بحیثیتِ نبی اور رسول لوگوں میں تبلیغ دین کے ضمن میں آتے ہیں۔ رہی بات حکومت کی ذمہ داری کے کام کی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرزِ عمل اس میں مختلف تھا۔ مثلاً غزوۂ احد کے موقع پر آپ ﷺ نے لوگوں کو مسجد میں جمع کیا اور اس بارے میں رائے لی کہ جنگ مدینہ کے اندر لڑی جائے یا شہر کے باہر۔ اکثریت کی رائے شہر سے باہر جا کر لڑنے کی تھی جبکہ آپ ﷺ کی رائے باہر جانے کی نہیں تھی؛ لہٰذا آپ ﷺ نے اکثریت کی رائے پر عمل کیا اور شہر سے باہر جا کر لڑائی لڑی۔ یا مثلاً جب آپ ﷺ دو متنازعہ فریقوں کے درمیان فیصلے کرتے تو اُنہیں خبردار کردیتے کہ یہ ممکن ہے کہ کسی ایک کے حق میں فیصلہ کرتے وقت دوسرے کی کسی قدر حق تلفی ہوئی ہو۔ بخاری شریف میں حضرت ام سلمہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے حجرے کے دروازے پر دو فریقوں کے مابین شور سنا تو آپ ﷺ باہر تشریف لائے اور فرمایا:

((إنَّمَا أنا بشر و إنه ياتيني الخصم فلعل بعضكم أن يكون أبلغ من بعض فأحسب أنه صادق فأقضي له بذلك،فمن قضيت له بحق مسلم فإنَّمَا هي قطعة من النَّار فليا خذها أو يتركها))

میں ایک بشر ہوں، اور میرے پاس کوئی معاملہ (فیصلہ کیلئے) آتا ہے، ممکن ہے کہ تم میں سے ایک شخص دوسرے کی نسبت زیادہ اچھا بولنے والا یا فصاحت میں بہتر ہو اور میں اس پر اعتبار کر کے فیصلہ کردوں، پس جس (فریق) کو دوسرے مسلم کا حق (اس طرح) ملا، تو وہ جہنّم کی آگ کا ایک ٹکڑا ہے، وہ چاہے تو اسے لے اور چاہے تو چھوڑ دے۔

اسی طرح مسند احمد میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((.....و إنّي لأرجو أن ألقى الله ولا يطلبني أحدٌ بِمَظْلِمَة ظلمتها إياه،في دم ولا مال))
.....اور میں اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملنا چاہتا ہوں کہ کوئی بھی شخص مجھ سے کسی ظلم کے عوض کا مطالبہ نہ کرے جو میں نے کیا ہو، نہ جان کا، نہ مال کا۔

اِن دلائل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ دو منصبوں پر فائز تھے؛ ایک نبوت ورسالت کا منصب، اور دوسرا مسلمانوں کے امیر کا جو اللہ کی نازل کردہ شریعت قائم کرتا ہے اور آپ ﷺ اِن دونوں منصبوں کی ذمہ داریوں کو اور اُن کے تقاضوں کو پورا کر رہے تھے۔ نیز یہ بھی واضح ہوا کہ آپ ﷺ کا ان میں ایک منصب پر جو طریقہ کار تھا، وہ دوسرے منصب کی ذمہ داریاں نبا ہنے کے طریقۂ کار سے مختلف تھا۔ مزید یہ کہ آپ ﷺ نے لوگوں سے بیعت لی جو کہ حکومت کی بیعت تھی نہ کہ نبوت کی بیعت، آپ ﷺ نے مردوں اور عورتوں سے بیعت لی لیکن نابالغ بچوں سے نہیں لی، جس سے یہ مزید ثابت ہو گیا کہ یہ بیعت حکومت ہی کی بیعت تھی نبوت کی نہیں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسالت کے نام اور اس کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں حضور ﷺ کو کبھی تنبیہ یا سرزنش نہیں کی، بلکہ اس کے برعکس ہمیشہ آپ ﷺ کی دل جمعی ہی فرمائی، مثلاً:

﴿فَلا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ﴾
پس ان کیلئے افسوس کرتے کرتے تمہاری جان نہ جاتی رہے (ترجمہ معانیٔ قرآن سورۂ فاطر: ۸)

﴿وَلا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلاَ تَكُن فِي ضَيقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ﴾
اور ان کیلئے غم نہ کھاؤ، اور نہ جو چالبازیاں وہ کرتے ہیں اس سے دل تنگ کرو (ترجمہ معانیٔ قرآن سورۂ نحل: ۱۲۷)

﴿إِنْ عَلَيْكَ إِلاَّ الْبَلاَغُ﴾
تم پر تو صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے (ترجمہ معانیٔ قرآن سورۂ شوریٰ: ۴۸)

اس کے برعکس اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو جہاں بھی ہلکی سی تنبیہ فرمائی ہے وہ اُن امور میں ہے جو حکومت کی ذمہ داریوں سے متعلق ہیں، جن کے احکام پہلے ہی نازل ہو چکے تھے اور تبلیغ بھی ہو چکی تھی۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَكُونَ لَهُ أَسْرىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الأَرْضِ﴾
کسی نبی کیلئے زیبا نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں، یہاں تک کہ وہ زمین میں خوں ریزی کرے
(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورہ انفال: ۶۷)

﴿عَفَا اللهُ عَنْكَ لِمَ أَذِنْتَ لَهُمْ﴾
اللہ نے تمہیں معاف کیا! تم نے انہیں اجازت کیوں دی، (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ توبہ: ۴۳)

اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ منصب امارتِ مسلمین، نبوت سے جدا ایک مستقل منصب ہے، اور یہ کہ یہ منصب امارت یا خلافت دنیوی منصب ہے نہ کہ اخروی۔ یعنی، خلافت سارے عالم کے مسلمانوں کی امارت عام ہے، یہ دنیوی منصب ہے نہ کہ روحانی کیونکہ یہ حکومت سے متعلق منصب ہے جس پر حضور ﷺ فائز تھے۔ حضور ﷺ اس منصب کو چھوڑ گئے اور یہ فرض کر دیا کہ اس پر ایک خلیفہ اُن کی یہ جگہ سنبھالے۔ چنانچہ خلافت حضور ﷺ کے اُس مقام پر فائز ہونا ہے جو حکومت سے متعلق ہے نہ کہ وہ جو نبوت سے متعلق ہے۔ بالفاظ دیگر، خلافت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی، مسلمانوں کی امارت کے معاملہ میں جانشینی ہے جو اسلام کے احکام کو نافذ کرتی ہے اور اس کی دعوت سارے عالم میں پہنچاتی ہے، یہ جانشینی وحی لینے میں یا اللہ تعالیٰ سے شریعت لینے میں نہیں ہے۔

جہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عِصمت و معصومیت یا خطاؤں سے پاک ہونے کا مقام ہے، تو وہ بسبب نبوت کے ہے نہ کہ حاکم ہونے کی حیثیت سے، کیونکہ عصمت اُن صفات میں سے ہے جن میں تمام انبیاء اور رسول شامل ہیں، قطع نظر اس سے کہ اُن نبیوں نے اپنی لائی ہوئی شریعت سے حکومت بھی کی یا وہ اپنی لائی ہوئی شریعت کی محض تبلیغ کے مکلّف تھے۔ جس طرح حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہم السلام معصوم تھے، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ و سلم بھی معصوم تھے۔ پس عصمت و معصومیت نبوت و رسالت کیلئے ہے نہ کہ حاکمیت کیلئے۔ جہاں تک اس حقیقت کا سوال ہے کہ آپ ﷺ سے کبھی کوئی حرام کام سرزد نہیں ہوا اور نہ ہی کوئی فرض ترک ہوا، تو یہ بھی آپ ﷺ کے بحیثیت نبی و رسول معصوم ہونے کے ہے نہ کہ بحیثیت حاکم کے۔ آپ ﷺ کے بحیثیت ایک حاکم افعال معصومیت کے متقاضی نہیں تھے، لیکن آپ ﷺ حقیقت میں معصوم تھے چونکہ آپ ﷺ نبی اور رسول تھے۔ اس امر میں قرآن حکیم بالکل واضح ہے:

﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ﴾

کہہ دو: ''میں تو محض تم ہی جیسا ایک بشر ہوں'' (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورہ کہف: ۱۱۰)

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضور ﷺ کے تمام انسانوں سے ممتاز ہونے کا سبب بھی بتا دیا، فرمایا:

﴿يُوحَىٰٓ إِلَيَّ﴾

میری طرف وحی آتی ہے (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورہ کہف: ۱۱۰)

لہٰذا حضور ﷺ کا امتیاز اُن پر وحی کا آنا ہوا، یعنی نبوت کا؛ اس کے علاوہ آپ ﷺ ایک بشر تھے جیسے تمام بشر ہیں۔ اس طرح جب آپ ﷺ حکومت کرتے، تو آپ ﷺ دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان ہوتے، لہٰذا جو کوئی آپ ﷺ کا جانشین یا خلیفہ ہوگا وہ بھی بے شک دوسرے انسانوں کی طرح انسان ہی ہوگا، کیونکہ وہ حضور ﷺ کا حکومت میں جانشین ہے نہ کہ نبوت و رسالت میں، اسی لئے خلیفہ کیلئے معصومیت کی شرط نہیں ہوتی؛ حکومت معصومیت کا تقاضہ نہیں رکھتی بلکہ معصومیت تو نبوت کا تقاضہ

ہے۔جبکہ خلیفہ ایک حاکم ہوتا ہے،اس میں معصومیت کو شرط بنانے کی کوئی گنجائش نہیں، بلکہ اس کو شرط بنانا جائز نہیں۔معصومیت نبوت کیلئے خاص ہے اور اس کا کسی غیر کیلئے شرط ہونا جائز نہیں۔دین کی تبلیغ ایک نبی یا رسول میں معصومیت کا تقاضہ کرتی ہے، یہ معصومیت دین کی تبلیغ میں کسی بھی حرام کے ارتکاب سے بچنے کی ضمانت ہوتی ہے، کیونکہ کسی کی معصومیت، اس وقت تک پوری نہیں ہوتی جب تک کہ وہ اسے حرام سے نہ بچالے۔لہٰذا صفتِ معصومیت دین کے ابلاغ یا پہنچا دینے کیلئے لازمی ہے، نہ کہ لوگوں کی تصدیق یا عدم تصدیق کیلئے، یا اُس میں کچھ بڑھا دینے یا اُس میں سے کچھ کم کر دینے کیلئے، یا جھوٹ کہہ کر وہ بات شامل کرنے کیلئے جو اللہ نے نہ کہی ہو، یا اُس میں غلطی سے وہ بات تبلیغ کرنے کیلئے جو اللہ نے نہ کہی ہو۔یہ تمام باتیں تبلیغ دین کے اور رسول ہونے کے تقاضوں کے خلاف ہیں؛ رسول کی بہر حال تصدیق کی ہی جانا ہوگی۔اس لئے یہ ضروری ہوا کہ رسول تبلیغ دین میں صفتِ معصومیت رکھے۔اسی کے ضمن میں محرمات سے بچنے کی معصومی آتی ہے؛ نیز انبیاء کے محرمات سے بچنے کے معاملے میں علماء اختلاف رکھتے ہیں؛ بعض کا یہ موقف ہے کہ انبیاء صرف کبائر کے ارتکاب سے معصوم ہوتے ہیں، اور یہ ممکن ہے کہ اُن سے چھوٹی غلطیاں سرزد ہو جائیں؛ بعض علماء کا موقف یہ ہے کہ انبیاء کبائر اور صغائر دونوں ہی سے معصوم ہیں۔علماء کے موقف میں یہ فرق اس بنیاد پر ہے کہ کیا دین کے ابلاغ یا پہنچائے جانے میں نبی کے افعال اثر انداز ہوتے ہیں یا نہیں۔یا یوں کہا جائے کہ اگر دین کی تبلیغ میں نبی کے افعال اثر انداز ہوتے ہیں، تو نبی کی صفتِ معصومیت میں محرمات سے معصومیت کی صفت بھی شامل ہوگی، اور اگر دین کی تبلیغ اس بات پر منحصر نہیں، تو صفتِ معصومیت میں محرمات سے معصومی شامل نہیں۔ایسے میں نبی محرمات کے ارتکاب میں معصوم نہ ہوگا، کیونکہ اُس حالت میں، اِس صفت کے بغیر تبلیغ مکمل ہو رہی ہوگی۔چنانچہ مسلمانوں میں اس بات پر کوئی اختلاف نہیں ہے کہ رسول اُن امور میں معصوم نہیں، جو امور دین کے مکمل پہنچا دئے جانے کے علاوہ ہوں۔لہٰذا صفتِ معصومیت تبلیغ کیلئے خاص ہے، اور یہ صرف انبیاء اور رسولوں کیلئے مخصوص ہے، یہ قطعاً جائز نہیں کہ یہ کسی اور کیلئے ہو۔

البتہ معصومیت کی یہ دلیل ایک عقلی دلیل ہے نہ کہ نصوص سے ماخوذ، کیونکہ یہ نصوصِ شرعیہ میں وارد نہیں ہوئی؛ یہ صفت کسی کیلئے، نہ انبیاء کیلئے اور نہ رسولوں کیلئے اور نہ ہی کسی اور کیلئے، نہ تو قرآن حکیم میں اور نہ ہی احادیث میں ملتی ہے۔یہ عقل ہی کا تقاضا ہے کہ نبی اور رسول دین کی تبلیغ میں معصوم عن الخطاء ہوں، کیونکہ یہ نبوت اور رسالت کا تقاضا ہے، اس کے بغیر کوئی نبی یا رسول نہیں ہوگا۔نتیجتاً یہ عقل ہی طے کرتی ہے کہ جو اللہ کی طرف سے رسالت یا نبوت نہ رکھتا ہو، ہو نہیں سکتا کہ وہ معصوم ہو، کیونکہ وہ بشر ہے جس کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے خطا اور بھول کا عنصر رکھا ہے، اور کیونکہ وہ نبوت کا مکلّف نہیں ہے لہٰذا اس میں معصومیت کا کوئی تقاضا بھی نہیں ہے۔اگر کوئی اپنی معصومیت کا دعویٰ کرتا ہے تو یہ مانا جائیگا کہ وہ اللہ

تعالیٰ کی طرف سے نبوت پر مکلّف ہے اور یہ جائز نہیں، کیونکہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلٰكِن رَّسُولَ اللهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾

بلکہ وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورہ احزاب: ۴۰)

یعنی معصومیت کے دعوے کا مطلب ہی نبوت کا دعویٰ ہے؛ کیونکہ جب رسول نے، بشر (یعنی خطا اور بھول کی فطرت کے ساتھ) ہوتے ہوئے، اللہ کے دین کی تبلیغ کی، تو اللہ کے پیغام کو تبدیلی اور تغیر سے محفوظ رکھنے کیلئے، یہ ناگزیر تھا کہ رسول خطا اور بھول سے معصوم ہوں۔ صرف یہی وہ سبب ہے جو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ رسول کی صفات میں معصومیت کی صفت ہو۔ اب کسی اور کیلئے معصومیت کا دعویٰ کئے جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ رسالت پر مکلّف ہے، لہٰذا خلیفہ کیلئے معصومیت کی شرط جائز نہیں، کیونکہ اس شرط کا مطلب یہ ہوگا کہ خلیفہ نبوت پر مکلّف ہے اور اس کی اجازت نہیں۔

ان دلائل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ خلیفہ محض ایک انسان ہے اور یہ ممکن ہے کہ وہ خطا کرے؛ جیسے کسی اور انسان سے بھول ہو سکتی ہے، اس سے بھول ہو؛ جھوٹ، خیانت یا معصیت سرزد ہو جائے کیونکہ وہ بشر ہے نہ کہ نبی یا رسول۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے خود ہمیں بتایا ہے کہ امام سے غلطی ہو جانے کا امکان ہے، یہ بھی بتایا کہ ممکن ہے کہ امام سے ایسے ظلم اور گناہ سرزد ہوں کہ عوام اس سے ناراض ہو جائیں اور اس پر لعنت کریں؛ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ بھی ممکن ہے کہ اُس سے کھلا ہوا کفر سرزد ہو جائے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مسلم شریف میں حدیث نقل کی ہے:

((إنَّمَا الإمامُ جُنَّة يُقَاتَلُ مِن وَرائهٖ و يتقى به، فإن أمر بتقوى الله عز وجلّ و عدل كان له بذلك أجر و إن يامر بغيره كان عليه منه۔))

بے شک امام ایک ڈھال ہے جس کے پیچھے لڑا جائے اور اپنی حفاظت کی جائے، پس اگر وہ اللہ کے تقوے کا حکم دے، تو اسے اس کا اتنا ہی اجر ملیگا اور اگر اس کے خلاف حکم دے، تو اتنا ہی اس کے خلاف ہوگا۔

اس سے ظاہر ہوا خلیفہ معصوم نہیں ہوتا اور یہ کہ اس بات کا امکان ہے کہ وہ تقوے سے ماسوا کا حکم دے، مسلم شریف میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((ستكون بعدي أثرة و أمور تنكرونها قالوا: يا رسول الله كيف تامر من ادرك منا ذلك؟ قال: تؤدون الحق الذي عليكم، و تسألون الله الذي لكم))

میرے بعد خود غرضی کے معاملات ہونگے اور ایسے امور ہونگے جن سے تم نفرت کروگے، صحابہ نے پوچھا کہ ہم میں سے جو اس کو پہنچے تو اس کیلئے کیا حکم ہے؟ فرمایا: جو تم پر حق ہے وہ دیتے رہو اور جو تمہارا حق ہے، اللہ سے مانگو۔

مسلم شریف ہی میں حضرت عوف ابن مالکؓ سے حضور ﷺ کی حدیث نقل ہے:

((خيار أيمتكم الذين تحبونهم و يحبونكم،و تصلّون عليهم و يصلون عليكم،و شرار أيمتكم الذين تبغضونهم و يبغضونكم،و تلعنونهم و يلعنونكم،قيل يا رسول الله أفلا ننابذهم باسيف فقال:لا،ما أقاموا فيكم الصلاة وإذا رأيتم مِن ولاتكم شيئاً تكرهونه،فاكرهوا عمله،ولا تنزعوا يداً من طاعة))

تمہارے بہترین امام وہ ہیں جو تم سے محبت کریں اور تم اُن سے محبت کرو،تم اُن کیلئے دعا کرو وہ تمہارے لئے دعا کریں،اور سب سے برے امام وہ ہیں جو تم سے نفرت کریں اور تم اُن سے نفرت کرو،اور وہ تمہارے لئے بددعا کریں اور تم اُن کیلئے،(آپ ﷺ سے) پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ کیا ہم اُن سے جنگ نہ کریں؟ فرمایا:نہیں،جب تک کہ وہ تم میں صلاۃ قائم کرتے رہیں۔اور اگر تم اپنے والیوں میں کچھ ایسا دیکھو،جو تمہیں ناگوار ہو،تو انکے(اس)عمل سے نفرت کرو(لیکن)اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچو۔

((دخلنا على عباده بن صامت ؓ وهو مريض قلنا أصلحك الله حدّث بحديث ينفعك الله به سمعته من النبي ﷺ قال:دعانا النبيؐ فبايعناه،فقال:فيما أخذ علينا أن بايعنا على السمع و الطاعة في منشطنا ومكرهنا،و عسرنا و يسرنا،و أثرة علينا، و أن لا ننازع الأمر أهله،قال:إلا أن تروا كفراً بواحاً عندكم من الله فيه برهان۔))

ہم حضرت عبادہ بن صامتؓ کے گھر گئے جب وہ بیمار تھے،اور اُن سے کہا کہ اللہ آپ کو شفا دے،ہمیں آپ کوئی ایسی حدیث سنایئے جو آپ نے نبی ﷺ سے سنی ہو،اللہ آپ کو اس کا اجر دیگا،حضرت عبادہ بن صامتؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بلایا اور ہم نے،اپنی خوشحالی میں اور سخت حالت میں،اپنی مشکلات میں اور اپنی آسودہ حالی میں،اور اپنے(مفاد کے)برخلاف بات اور صاحب اقتدار سے اس کے امر میں سننے اور اطاعت کرنے کی بیعت کی،تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ"جب تک کہ تم کوئی واضح کفر نہ دیکھ لو جس کے بارے میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلیل ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا:

((ادرأوا الحدود عن المسلمين ما استطعتم،فإن كان له مخرج فخلوا سبيله۔ فإن الإمام أن يخطئ في العفو خير من أن يخطئ في العقوبة۔))(ترمذي)

حتی الامکان مسلمانوں کو سزاؤں سے بچاؤ،اور اگر اُن کیلئے کوئی راستہ ہو،تو وہ راستہ ان کے لئے چھوڑ دو،امام

(خلیفہ) کیلئے یہ بہتر ہے کہ اُس سے ایسی غلطی ہو کہ معافی مل جائے بجائے اس کے کہ ایسی غلطی ہو کہ سزا ملے۔

ان احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ یہ خلیفہ سے خطا، بھول اور گناہ ہونا ممکن ہے، اور اس کے باوجود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ پھر بھی اس کی اطاعت کرو جب تک کہ وہ اسلام نافذ کرے اور اس سے کھلا ہوا کفر سرزد نہ ہو اور وہ معصیت کا حکم نہ دے۔ اب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے خبردار کرنے کے بعد کہ خلفاء میں ایسی باتیں بھی ہونگی جنہیں لوگ ناپسند کرینگے، اور اس کے باوجود آپ ﷺ کا یہ حکم کہ اُن کی اطاعت کی جائے، کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ خلیفہ کیلئے معصوم ہونا واجب ہے؟ کیونکہ بہرحال وہ ایک انسان ہے۔ لہٰذا ریاستِ خلافت ایک انسانی یا بشری ریاست ہے نہ کہ کوئی روحانی ریاست۔

۶-اسلام میں قیادت انفرادی ہے نہ کہ اجتماعی

قیادت، ریاست، اور امارت ہم معنی الفاظ ہیں اسی طرح قائد، رئیس اور امیر بھی ہم معنی الفاظ ہیں۔ خلافت، گو کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی امارت ہے، لیکن لفظ 'خلافت' امارت کی طرح عام نہیں بلکہ اس کے مخصوص معنی ہیں جس طرح لفظ 'خلیفہ' کے معنی امیر کی طرح ہونے کے مخصوص ہیں۔ لہٰذا ایک 'امارت' خلافت بھی ہوسکتی اور اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہوسکتی ہے؛ مثلاً فوج کی امارت، ولایت کی امارت یا جماعت کی امارت؛ لفظ 'امارت' خلافت کی طرح مخصوص نہیں بلکہ عام اصطلاح ہے۔ اسی طرح ایک امیر، خلیفہ بھی ہوسکتا ہے، یا کسی ولایت کا امیر یعنی والی بھی ہوسکتا ہے، فوج کا امیر ہوسکتا ہے، جماعت کا امیر ہوسکتا ہے یا سفر کا امیر ہوسکتا ہے، کیونکہ یہ خلیفہ کی طرح مخصوص نہیں ہوتا، اس طرح لفظ خلافت ایک معین معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے جبکہ لفظ امارت کا اطلاق ہر امیر پر ہوسکتا ہے۔

اسلام میں یہ بات حتمی ہے کہ رئیس، امیر اور قائد ایک معاملے میں ایک ہی ہو، اور اس بات کی گنجائش نہیں کہ ایک سے زیادہ ہوں۔ اسلام میں اجتماعی قیادت (Collective Leadership) یا اجتماعی صدارت (Collective Presidentship) کا تصور نہیں ہے، اسلام میں قیادت صرف فردی ہے، چنانچہ یہ لازمی ہے کہ قائد، رئیس یا امیر ایک ہی ہو نہ کہ ایک سے زیادہ۔ اس کی دلیل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث اور افعال ہیں۔ مسند احمد میں عبداللہ ابن عمروؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((لا يحلّ لِثلاثة نفر يكونون بأرض فلاة إلا أمروا عليهم أحدهم))

یہ جائز نہیں کہ تین لوگ کھلی زمین پر ایک امیر کے بغیر رہیں۔

((إذا خرج ثلاثة في سفرٍ فليؤمروا أحدهم))

اگر تین لوگ بھی سفر پر نکلیں، تو ایک کو اپنا امیر بنالیں۔ (ابوداؤد: ابی سعید الخدریؓ)

((إذا كانوا ثلاثة في سفرٍ فليؤمروا أحدهم))

اگر تین لوگ بھی سفر پر ہوں، تو ایک کو اپنا امیر بنالیں۔ (عبداللہ بن عمرؓ سے البزار کی روایت)

ان تمام احادیث کا مفہوم یہی ہے کہ امیر صرف ایک ہی ہو؛ ((إلا أمروا عليهم أحدهم)) ((فليؤمروا أحدهم))، ((فليؤمروا أحدهم)) ان سب احادیث میں لفظ 'احد' آیا ہے جس کا مطلب ایک ہوتا ہے، نہ کہ اس سے زیادہ۔ یہ بات اس کے مخالف معنوں (المفهوم المخالفة) سے بھی سمجھی جاسکتی ہے؛ کسی چیز کا مفہوم المخالفہ اُس چیز کے عدد اور صفت میں کسی نصِ شرعی کی غیر موجودگی میں معتبر ہوجاتا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ﴾

کہو: وہ اللہ یکتا ہے۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ اخلاص:۱)

یعنی اللہ کا کوئی ثانی نہیں۔ مفہوم مخالفہ، اُس وقت تک معطل نہیں ہوتا جب تک کہ اُسے معطل کرنے کیلئے کوئی نص نہ ہو، مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلا تُكْرِهُواْ فَتَيَٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّناً﴾

اور اپنی باندیوں کو کچھ دنیوی زندگی کے سامان کی طلب میں بدکاری پر مجبور نہ کرو جب کہ وہ پاک دامن رہنا بھی چاہتی ہوں۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ نور:۳۳)

اگر اس آیت کے مفہوم مخالفہ کو دیکھیں تو یہ لگتا ہے کہ اگر باندیاں شادی کرنا نہ چاہیں تو اُنہیں بدکاری پر مجبور کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ مفہوم مخالفہ ایک اور آیت سے معطل ہو جاتا ہے:

﴿وَلاَ تَقْرَبُواْ الزِّنَىٰ إِنَّه كَانَ فَاحِشَةً وَ سَاءَ سَبِيلاً﴾

اور زنا میں مُلوث نہ ہو؛ وہ ایک برا فعل اور بری راہ ہے (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ بنی اسرائیل:۳۲)

لہٰذا اگر کوئی نص مفہوم مخالفہ کو معطل نہ کر رہی ہو تو ایسا مفہوم مخالفہ معتبر ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿الزَّانِيَةُ وَ الزَّانِي فَاجْلِدُواْ كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾

زانیہ عورت اور زانی مرد، ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ نور:۲)

اس آیت میں کوڑوں کے عدد متعین کر دئے گئے ہیں یعنی سو کوڑے، اس طرح متعین کر دینا اس بات کی دلیل ہے کہ سو کوڑوں سے زیادہ جائز نہیں۔ اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے قول ((إلا أمروا عليهم أحدهم)) ((فليؤمروا أحدهم))، ((فليؤمروا أحدهم))؛ اس کے مفہوم مخالفہ کی دلیل ہوئی کہ ایک سے زیادہ شخص کو امیر بنانا جائز نہیں۔ اس طرح یہ بات اپنی قطعیت کو پہنچی کہ قیادت یا امارت ایک ہی شخص کی ہو سکتی ہے اور احادیث کے معانی اور الفاظ یعنی مفہوم اور منطوق سے ثابت ہوا کہ ایک شخص سے زیادہ کا امیر ہونا قطعاً جائز نہیں۔ اس بات کی تائید حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل سے ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے جب بھی کسی کو امیر بنایا تو ایک ہی شخص کو بنایا، کبھی ایک ہی جگہ دو افراد کو امیر مطلقاً نہیں بنایا۔

وہ حدیث کہ آپ ﷺ نے حضرت معاذ ابن جبل اور حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہم کو یمن بھیجا اور اُن سے فرمایا:

((يَسِّرا وَ لَا تُعَسِّرا و بَشِّرَا وَلا تُنَفِّرَا وَ تطاوعا))

لوگوں کیلئے آسانیاں پیدا کرو، مشکل میں نہ ڈالو؛ اُنہیں بشارتیں دو، متنفر نہ کرو اور ایک دوسرے کا ساتھ دو۔

حضور ﷺ نے دونوں صحابہ کو یمن کے مختلف علاقوں پر مقرر فرمایا تھا نہ کہ ایک ہی مقام پر۔ بخاری شریف میں ایک حدیث دو مختلف الفاظ میں روایت کی گئی ہے ایک حدیث میں آتا ہے کہ دونوں کو دو علیحدہ جگہوں پر بھیجا گیا تھا:

((حدثنا موسى، حدثنا ابو عوانة عن ابى بردة قال: بعث رسول اللهؐ أبا موسى و معاذ

ابن جبل إلى اليمن قال: و بعث كل واحد منهما على مخلاف،قال:واليمن مخلافان،ثم قال:يَسِّرا وَ لَا تُعَسِّرا و بَشِّرَا وَلا تُنَفِّرَا،فانطلق كل واحد منهما على عمله.....))

موسیؓ روایت کرتے ہیں ابوعوانہ سے اور وہابی بردہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضورﷺ نے ابوموسیؓ اور معاذ ابن جبلؓ کو یمن بھیجا، اور دونوں کو الگ الگ صوبوں کی ذمہ داری دی اور فرمایا کہ یمن دو حصوں پر مشتمل ہے اور پھر فرمایا کہ لوگوں کیلئے آسانیاں پیدا کرو، مشکل میں نہ ڈالو؛ اُنہیں بشارتیں دو، تنفر نہ کرو اور ایک دوسرے کا ساتھ دو۔؛ پھر وہ دونوں اپنے اپنے کام پر نکل گئے۔

لہٰذا یہ حرام ہے کہ کسی بھی ایک معاملے یا جگہ پر دو امیر ہوں، بلکہ یہ لازم ہے کہ ایک ہی قائد اور امیر ہو۔

بعض مسلم ممالک میں جو اجتماعی امارت موجود ہے، جن کو مجلس یا کمیٹی کہا جاتا ہے اور جن کے پاس صدر کے اختیارات ہوتے ہیں، یہ شرعی قانون کے سراسر خلاف ہے۔ لیکن اگر یہ مجلسیں اور کمیٹیاں وغیرہ کچھ ذمہ داریوں پر مامور ہوں، یا بعض معاملات پر بحث و گفتگو کیلئے ہوں یا مشورے کیلئے یہ مجلسیں قائم کی گئی ہوں تو البتہ یہ جائز ہوگا کیونکہ یہ طریقہ اسلامی ہوا، مسلمانوں کی تعریف کی گئی ہے کہ اُن کے معاملات آپس میں مشوروں سے طے ہوتے ہیں۔ ان مجلسوں اور کمیٹیوں کی رائے قابل توجہ ہوگی جیسا کہ اس کتاب میں بحث کی گئی ہے۔

معاونین خلیفہ

معاونین (Deputies/Assistants) وزیر ہوتے ہیں جنہیں خلیفہ حکومت کی ذمہ داریوں اور مختلف امور کی انجام دہی میں اپنی معاونت کیلئے مقرر کرتا ہے۔ خلافت کی ذمہ داریاں بہت کثیر ہوتی ہیں، خاص کر جیسے جیسے ریاست بڑھتی جاتی ہے، خلیفہ کی ذمہ داریاں بڑھتی جاتی ہیں چنانچہ اِن ذمہ داریوں کو نباہنے کیلئے ایسے لوگ درکار ہوتے ہیں جو خلیفہ کو اسکی ذمہ داریاں نباہنے میں مدد کریں۔ معاونین کا تقرر کیا جانا عملِ مباح ہے۔

معاونین دو قسم کے ہوتے ہیں:

وزراء تفویض (Delegated Assistants) اور وزراء تنفیذ (Executive Assistants)۔

معاون تفویض (Delegated Assistants):

معاون تفویض کو خلیفہ حکومت اور اقتدار کی ذمہ داریوں میں مدد کرنے کیلئے مقرر کرتا ہے۔ معاون تفویض کو حکومت کے امور اپنی رائے اور اجتہاد سے طے کرنے کیلئے سونپ دئے جاتے ہیں، جن میں وہ شریعت کے احکام کا پابند ہوتا ہے۔

معاون کی تقرری مباح عمل ہے، خلیفہ کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں اور کاموں کی انجام دہی کیلئے معاون مقرر کرے۔ حاتم اور ترمذی شریف میں ابی سعید الخذریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا:

((وَزِيراي مِن السَماء جبريل و ميكائيل، ومن أهل الأرض أبو بكر و عمر))

آسمان پر میرے دو وزیر جبریل اور میکائیل ہیں اور زمین والوں میں (حضرت) ابوبکرؓ اور عمرؓ۔

اس حدیث میں لفظ وزیر سے مراد مددگار کی ہے، قرآن حکیم میں بھی یہ لفظ اسی لغوی معنے کے ساتھ آیا ہے:

﴿وَأْجْعلْ لّي وَزِيراً مِنْ أَهْلِي﴾

اور میرے لئے میرے اپنے گھر والوں میں سے ایک ہاتھ بٹانے والا مقرر کر دے (ترجمہ معانیٔ قرآن سورۂ طٰہٰ: ۲۹)

یہاں بھی لفظ وزیر مددگار کے معنوں میں آیا ہے۔ حدیث میں یہ لفظ مطلق معنوں میں استعمال ہوا ہے، جس سے مراد کسی بھی معاملے میں ہر طرح کی مدد، جس میں خلیفہ کی حکومتی ذمہ داریوں میں مدد بھی شامل ہے۔ ابی سعید الخذریؓ سے روایت حدیث صرف حکومتی ذمہ داریوں کیلئے مخصوص نہیں ہے کیونکہ اس میں جبرئیلؑ اور میکائیلؑ کو آسمانوں میں وزیر بتایا گیا ہے جن کا حکومتی معاملوں میں کسی قسم کا دخل عمل نہیں ہے۔ لہٰذا لفظ 'وَزِيراي' کے معنے صرف وہی ہوئے جو اس کے لغوی معنی ہیں، یعنی 'میری مدد کرنے والے'، اور کسی شخص کیلئے یہ مباح ہے کہ وہ کسی بھی کام کیلئے معاون کی مدد لے، لہٰذا کسی کو وزیر مقرر کرنا ایک مباح عمل ہے۔ جہاں تک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو وزیر بنایا جانا ہے، تو یہ لفظ وزیر کے لغوی معنوں کے دائرے میں ہی آتا ہے، کیونکہ یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ اِن دونوں حضرات کی وزارت کسی بھی طرح حکومت یا اقتدار

کے کاموں تک محدود تھی۔ البتہ ان حضرات کا وزیر بنایا جانا فی نفسہٖ اُنہیں یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ ہر معاملے میں، بشمول حکومت و اقتدار کے امور میں، معاونت کریں۔ مزید یہ کہ اِن حضرات کا وزیر بنایا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ خلیفہ جسے چاہے، حکومت کے کاموں میں اپنی معاونت کیلئے وزیر بنا سکتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ بننے کے بعد انہوں نے حضرت عمرؓ کو اپنا وزیر مقرر کیا، اور حضرت عمر کا وزیر کے عہدے پر رہنا اس قدر واضح تھا کہ بعض صحابہؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ ''ہمیں یہ نہیں معلوم کہ خلیفہ آپ ہیں یا (حضرت) عمرؓ''۔ جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو آپؓ نے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو وزیر مقرر کیا، البتہ اِن دونوں حضرات کا وزیر ہونا عام طور پر اتنا عیاں نہیں تھا اور یہ حضرات خلیفہ کی حکومتی معاملات میں معاونت نہیں کرتے تھے، اِن کی حیثیت ایسی تھی جیسی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی حضور ﷺ کے وزیر کی تھی۔ حضرت عثمان کے دور خلافت میں حضرت علیؓ اور مروان بن الحکم خلیفہ کے معاونین تھے۔ حضرت علیؓ بعض معاملات اپنی مرضی کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے ناخوش تھے اسلئے اُنہوں نے ایک فاصلہ بنائے رکھا، البتہ مروان بن الحکم کا وزیر ہونا بالکل عیاں تھا۔

جب خلیفہ کسی کو حکومتی ذمہ داریوں کے لئے اپنا وزیر مقرر کرتا ہے تو اسے معاملات کے انتظام کرنے کا اختیار نیابت کر دیتا ہے اور اس طرح نیابت دئے جانے سے وہ مقرر کردہ شخص، خلیفہ کا وزیر و معاون تفویض بن جاتا ہے، اور اسکے اختیارات خلیفہ ہی کی طرح ہو جاتے ہیں، البتہ وہ اِن اختیارت کا خلیفہ کی طرح مالک نہیں ہوتا، بلکہ خلیفہ کی طرف سے وزارت اور نیابت کی سند ہونے کے سبب یہ اختیارات اُسے حاصل ہوتے ہیں۔ خلیفہ کسی شخص کو اپنا وزیر بنانے کیلئے مثلاً یہ کہے: ''میں نے فلاں کو اپنا وزیر مفوض یا معاون مفوض بنایا'' یا ''میری ذمہ داریوں میں میری نیابت کرو'' یا اس قسم کے الفاظ، تو اُس مقررہ شخص کو خلیفہ کے نائب ہونے کی حیثیت سے وہ سارے اختیارات مل جاتے ہیں۔ الماوردیؒ نے اپنی کتاب **احکام السلطانیۃ** میں اسے وزارۃ التفویض سے تعبیر کیا ہے اور یہ تعریف بیان کی ہے: ''وزارتِ تفویض سے مراد یہ ہے کہ امام کسی شخص کو وزیر مقرر کرے اور معاملات کا انتظام اپنی رائے سے کرنے کی نیابت اور، اُن پر اپنے اجتہاد سے عمل درآمد یا نفاذ کرنے کا مجاز بنائے''۔

یہ معاون تفویض کی صحیح حیثیت ہوئی کہ وہ خلافت کے ہر کام میں خلیفہ کا معاون ہے اور اسے اختیار ہے کہ وہ خلافت کے ہر کام کی انجام دہی کرے، خواہ خلیفہ نے وہ کام اس کے سپرد کیا ہو یا نہ کیا ہو، کیونکہ وہ عام نیابت کا مجاز ہے۔ البتہ وہ اس بات کا پابند ہے کہ ہر کام جسے وہ انجام دے، اُس سے خلیفہ کو مطلع رکھے، کیونکہ وہ خلیفہ کا معاون ہے خود خلیفہ نہیں۔ لہٰذا وہ خود مختار نہیں بلکہ ہر معاملہ سے خلیفہ کو آگاہ کرتا رہے، خواہ وہ چھوٹا کام ہو یا بڑا، کیونکہ فی الحقیقت معاملات کی نگہداشت بہر حال خلیفہ کی ذمہ داری ہے۔

معاون تفویض یا وزیر کی شریعت میں یہ حیثیت جمہوری نظام کے وزیر سے سراسر مختلف ہے۔ جمہوری نظام میں وزارت ہی حکومت ہوتی ہے، جس میں وزارت یا کابینہ بحیثیت افراد کے ایک مجموعہ کے اقتدار کی مالک ہوتی ہے۔ وہاں اقتدار ایک جماعت کا ہوتا ہے نہ کہ کسی فرد واحد کا، یعنی اجتماعی قیادت ہوتی ہے، نہ کہ فردی۔ لہٰذا وزراء کی کابینہ ہی سارے اقتدار کی مالک

ہوتی ہے، اور اُن وزراء میں سے کوئی بھی وزیر بحیثیت فرد، اقتدارِ مطلق نہیں رکھتا۔ جہاں تک ایک وزیر کی بات ہے تو وہ کسی ایک معاملہ میں اختیار رکھتا ہے جو اسے کابینہ سونپتی ہے، اور رہے وہ معاملات جو اِس وزیر کو نہیں سونپے گئے، تو ایسے وزیر کا اُن میں عمل دخل نہیں ہوتا، اور اِس معاملے کے اختیارات کابینہ ہی کا پاس رہتے ہیں۔ مثلاً وزیر عدل کے پاس اپنی وزارت کے اختیارات ہوتے ہیں، لیکن اپنی ہی وزارت میں کچھ ایسے امور ہوتے ہیں جن پر اُس کا اختیار نہیں ہوتا، بلکہ کابینہ ہی اُن معاملات میں فیصلے کر سکتی ہے۔ یہ نظام جمہوریت میں وزیر کی حیثیت ہوئی۔ اس سے جمہوری نظام اور اسلامی نظام کی وزارات کے درمیان فرق بالکل واضح ہوجاتا ہے اور لفظ وزیر یا معاون کے اسلامی مفہوم اور جمہوریت میں وزیر کا تصور بھی مکمل طور سے عیاں ہوجاتا ہے۔ اسلامی نظام میں وزیر، معاون یا وزارت کی حیثیت خلافت کے ہر کام میں بغیر کسی استثناء کے خلیفہ کی معاونت کے ہیں، جنہیں وزیر انجام دیتا ہے اور خلیفہ کو اُن کاموں میں پیش رفت سے مطلع رکھتا ہے، اس میں اختیار فردی ہوتا ہے اور اگر ایک سے زیادہ بھی معاون تفویض ہوں تو بھی اُنہیں یہ اختیارات ایک فرد کی حیثیت سے ہونگے نہ کہ اجتماعی حیثیت سے۔ اس کے برخلاف جمہوریت میں وزارت ایک جماعت کا نام ہے نہ کہ فرد کا اور ایک وزیر کے اختیارات کسی ایک مخصوص معاملہ یا محکمہ تک ہی محدود ہوتے ہیں۔ اس طرح وزیر یا وزارت کے اسلامی اور جمہوری تصور میں فرق پوری طرح واضح ہوجاتا ہے۔

بہرحال حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں لفظ وزیر یا وزارت کے جو مفہوم چسپاں ہیں وہ وہی ہیں جو نظام جمہوری میں اِن الفاظ کے ہوتے ہیں، اور جب بھی یہ نام استعمال کئے جائیں، لوگوں کے ذہنوں میں اِن الفاظ کے بارے میں وہی جمہوری مفہوم کا تصور ابھرتا ہے۔ لہٰذا کسی قسم کا ابہام (Confusion) لوگوں کے ذہنوں میں نا رہے اور ٹھیک ٹھیک اسلامی تصور ذہن نشیں رہے، اس لئے بغیر کسی قید کے لفظ وزیر اور وزارت استعمال کیا جانا صحیح نہیں ہوگا، بلکہ لفظ معاون کا اطلاق ہی صحیح ہوگا اور اِسی سے حقیقی تصور ذہنوں میں رہیگا۔ یا پھر یہ کیا جائے کہ لفظ وزیر یا وزارت کے ساتھ کوئی بندش وابستہ رہے جس سے ان الفاظ کے جمہوری مفہوم کا ازالہ ہو اور خالص اسلامی تصور ہی ملحوظ رہے۔

لہٰذا معاون وہ شخص ہے جس کی نیابت میں ریاست کا ہر علاقہ اور ہر معاملہ شامل ہوتا ہے، اسلئے کہا جاتا ہے کہ خلیفہ معاون کو عام نیابت دیتا ہے۔ چنانچہ معاون کی حیثیت و رتبہ یہ ٹھہرا کہ وہ خلیفہ کا نائب ہوا اور اس کی نیابت، ریاست کے تمام معاملات پر عام ہوئی یعنی وہ معاون حاکم ہوا۔

معاون تفویض کیلئے شرائط:

معاون تفویض کیلئے وہی شرائط ہیں جو خلیفہ کیلئے ہیں، یعنی وہ مرد، آزاد، مسلمان، بالغ، عاقل، عادل ہو اور جو کام اسے سونپے گئے ہوں اُن کو انجام دینے کا اہل ہو۔

اِن شرائط کے دلائل بھی وہی ہونگے جو خلیفہ کی شرائط کے دلائل ہیں۔ مثلاً اسکے مرد ہونے کی شرط کی دلیل حضور ﷺ

کا یہ قول ((لن یفلح قوم ولّوْا أمرھم امرأة))یعنی،وہ قوم جو اپنے امور پر عورت کو والی یا حاکم بنالے، ہرگز کامیاب نہیں ہو گی۔(بخاری شریف،راوی:ابی بکرہؓ)۔اس کے آزاد ہونے کی دلیل یہ ہے کہ جو شخص اپنے اوپر ہی تصرف نہ رکھے،اس کیلئے یہ کیسے ممکن ہے کہ دوسرے کے معاملات وامور کا اہتمام کر سکے۔بالغ ہونے کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول ہے:((رُفع القلم عن ثلاثة:عن الصبي حتى يبلغ؛وعن النائم حتى يستيقظ؛ و عن المعتوه حتى يبرأ.)) یعنی تین قسم کے لوگوں کا محاسبہ نہیں ہوگا:لڑکا،جب تک کہ وہ سن بلوغ کو نہ پہنچے؛سویا ہوا شخص،جب تک کہ وہ نیند سے نہ جاگ جائے؛اور مجنون(دیوانہ)جب تک کہ وہ ٹھیک نہ ہوجائے۔عاقل ہونے کی دلیل حضور ﷺ کا قول:((.....و عن المعتوه حتى يبرأ.))یعنی،.....اور مجنون(دیوانہ)جب تک کہ وہ ٹھیک نہ ہوجائے؛یا ایک دوسری روایت میں ہے:((.....عن المجنون المغلوب على عقله حتى يفيق)) یعنی،.....مجنون جسکی عقل درست نہیں،جب تک کہ وہ ٹھیک نہ ہوجائے.....۔اس کے عادل ہونے کی شرط کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ﴾ اور اپنے میں سے دو صاحبِ عدل آدمیوں کو گواہ بنالو۔(ترجمہ معانیٔ قرآن:طلاق:۲)چنانچہ عادل ہونا،جب ایک گواہ کیلئے لازمی ہے تو یہ بات خلیفہ کے معاون کیلئے اور زیادہ لازم ہوگی۔معاون کیلئے اُس میں اہلیت کا ہونا بھی شرط ہے،تا کہ وہ خلافت کی ذمہ داریوں،اور حکومت واقتدار میں خلیفہ کی معاونت کر سکے۔

معاون تفویض کی تقرری کی شرائط:

معاون کے تقرر کئے جانے میں دو باتیں ضروری ہوتی ہیں؛ایک یہ کہ اس کو اشراف عام(General Charge) حاصل ہو اور دوسری خلیفہ کی نیابت(Deputy)۔لہٰذا خلیفہ اس کا تقرر کرتے وقت یہ کلمات ادا کرے:''میں تمہیں مُیرے نائب کی حیثیت سے وہ سپرد کرتا ہوں جو میری ذمہ داری ہے''۔یا ان جیسے الفاظ جن میں اشراف عام اور نیابت شامل ہو۔اگر اس طرح تقرری نہیں ہوئی تو وہ شخص معاون نہیں ہوگا اور نہ اُسے معاون کے اختیارات ہونگے تاوقتیکہ تقرری اس طرز پر نہ ہوجائے۔

اس کی دلیل خود معاون کے کام کی نوعیت ہے،کیونکہ معاون خلیفہ کا نائب ہے اور نیابت ہی یہاں عقد یا معاہدہ ہے۔یہ اصول ہے کہ کوئی بھی معاہدہ اس وقت تک صحیح نہیں ٹھہرتا جب تک کہ اُس کی شرائط صراحت سے بیان نہ کر دی گئی ہوں۔اس لئے یہ لازم ہے کہ معاون کو مقرر کئے جانے میں نیابت یا اُس جیسا کوئی لفظ ہو۔پھر یہ کہ معاون حکومت میں وہ تمام اختیارات رکھتا ہے جو خلیفہ کے ہوتے ہیں،لہٰذا اس کی تقرری میں یہ ضروری ہے کہ اشراف عام یا اس جیسا کوئی اور فقرہ شامل ہو اور یہ تقرری ریاست کے ہر معاملہ کا احاطہ کرے۔مثلاً خلیفہ کہے:''میں نے جو اپنے اختیارات ہیں وہ بحیثیت نائب تمہیں سونپے''؛یا کہے:''میں نے تمہیں اپنی نیابت میں وزیر بنایا''یا اس قسم کے دیگر کلمات۔پس اگر اس تقرر کئے جانے میں 'اشراف عام' تو کر دیا لیکن نیابت کا کلمہ نہیں ہے،تو یہ وزارت کا عقد نہ ہو کر ولیعہدی کا عقد ہوجائیگا جو کہ باطل ہے لہٰذا یہ بھی باطل تسلیم کیا

جائیگا؛اس کے برخلاف اگر نیابت کا کلمہ تو ادا کیا لیکن 'اشراف عام' کی صراحت نہیں کی، تو یہ غیر واضح یا مبہم ہوگا، یعنی یہ عام بھی ہوسکتا ہے اور مخصوص بھی، مقرر کیا جانے والا شخص معاون تفویض بھی ہوسکتا ہے اور معاون تنفیذ بھی؛ لہٰذا یہ تقرری صحیح نہیں مانی جائیگی۔ اگر یہ الفاظ ادا کئے جائیں: ''تم قضاۃ کے معاملات میں میرے نائب ہوئے'' یا ''تم پولیس کے معاملات میں میرے نائب ہوئے'' یا ''تم تعلیم کے معاملات میں میرے نائب ہوئے'' وغیرہ، تو اس سے بھی معاون تفویض کا انعقاد نہیں ہوگا، چنانچہ یہ لازم ہے کہ مقرر کئے جانے والے شخص کی وہ حیثیت بیان کی جائے؛ یعنی کہ وہ خلیفہ کا نائب ہوگا، اور خلیفہ کے تمام اختیارات اس کو بھی حاصل ہوں گے۔ لہٰذا یہ لازم ہے کہ تقرری کے الفاظ میں یہ دونوں شرطیں صراحت سے ادا ہوں: پہلی 'اشراف عام' اور دوسری نیابت، اگر یہ دونوں صراحت سے نہیں شامل کی گئیں تو معاون تفویض کا انعقاد نہیں ہوگا۔

معاونین کی تعداد خلیفہ کیلئے ایک مباح معاملہ ہے، یہ اُس کیلئے جائز ہے کہ وہ ایک معاون مقرر کرے یا اُس سے زیادہ۔ اگر وہ ایک سے زیادہ معاونین مقرر کرتا ہے تو بھی ہر ایک کے اختیار میں ہر معاملہ شامل ہوگا جیسا کہ خلیفہ کیلئے ہے، یہ جائز نہیں کہ چند لوگوں کو بحیثیت جماعت مقرر کر دیا جائے اور اُن کے اختیارات بھی بحیثیت اجتماعی ہوں، کیونکہ ولایت اور حکومت فردی معاملات ہیں، لہٰذا ایسی تقرری باطل ہوگی۔ مزید یہ کہ یہ امیر کی تقرری کا معاملہ ہے اور حضور ﷺ کے قول: ((فَلْيُؤمِّرُوا أَحَدَهُم)) یعنی ''پس وہ اپنے اوپر اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں'' اور: ((إلا أمَّرُوا عَلَيهِمْ أَحَدَهُم)) یعنی ''سوائے اس کے کہ وہ اپنے اوپر اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں''۔ چنانچہ یہ امارت کے صحیح ہونے کی شرط ہوگی۔

معاون تفویض کے فرائض:

معاون تفویض کے لئے ضروری ہے کہ وہ جن کاموں کو انجام دینے کا قصد کرے، اُن کاموں کو وہ خلیفہ کے سامنے پیش کرے جس سے یہ واضح ہو کہ معاون نے فلاں معاملہ میں کیا اقدامات کئے ہیں اور کیا انجام دئے ہیں نیز یہ بھی کہ معاون نے کیا کیا تقرریاں کی ہیں۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ معاون خلیفہ کا نائب ہے نہ کہ خلیفہ۔ لہٰذا اس کا کام یہ ہوا کہ وہ امور پر اپنا تبصرہ خلیفہ کو پیش کرے اور پھر اگر خلیفہ معاون کو کسی کام سے رک جانے کا حکم نہ دے تو اُن امور کو نافذ کرے۔

اس کی دلیل خود معاون کی خلیفہ کا نائب ہونے کی حیثیت ہے۔ ایک نائب کسی کام کو اُس شخص کی جانب سے انجام دیتا ہے جس کی وہ نیابت کر رہا ہو یعنی خلیفہ کی نیابت؛ وہ بذاتِ خود کوئی مستقل یا آزاد حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ ہر کام سے خلیفہ کو باخبر رکھتا ہے۔ یہی احوال حضرت عمرؓ کے ساتھ تھا جب وہ حضرت ابوبکرؓ کے وزیر یا معاون تھے، حضرت عمرؓ خلیفہ یعنی حضرت ابوبکرؓ کو ہر کام سے آگاہ رکھتے تھے اور اپنی صوابدید سے کاموں کو انجام دیتے تھے۔ معاون کا خلیفہ کو مطلع رکھنا اس بات پر تعبیر نہیں ہوتا کہ وہ ہر فروعی بات میں خلیفہ کی اجازت کا پابند ہے، کیونکہ یہ تو معاون کے کام کی نوعیت کے ہی خلاف ہوگا، بلکہ محض خلیفہ کو امور سے آگاہ اور باخبر رکھنا ہے؛ مثلاً کسی ولایت (صوبے) میں لائق والی کی تقرری، یا بازاروں میں اشیاء

خوردنی کی قلت کی شکایت کا ازالہ کرنا وغیرہ۔ معاون کیلئے یہ کافی ہے کہ وہ خلیفہ کے سامنے تمام مجوزہ افعال کا خاکہ، خلیفہ کی اطلاع کیلئے پیش کرے، تاکہ پھر وہ اُن امور کو مزید کسی صریح اجازت کے انجام دینا شروع کر سکے۔ البتہ اگر اِن پیش کردہ افعال پر خلیفہ روک لگا دے تو معاون کیلئے پھر اُن کا انجام دنیا جائز نہیں ہوگا۔ لہٰذا معاون کی جانب سے خلیفہ کو باخبر رکھنے کیلئے مطلع کرنا، یا ذکر کرنا، اُن کاموں کیلئے خلیفہ کی اجازت طلب کرنا نہیں ہوتا، بلکہ معاون اُنہیں نافذ کر سکتا ہے اِلا یہ کہ خلیفہ معاون کو ان معاملات کی انجام دہی سے روک دے۔

خلیفہ کیلئے یہ لازم ہے کہ وہ معاون کے کام اور امور کے اہتمام کا جائزہ لے اور معائنہ کرے تاکہ وہ اُن کاموں میں جو کچھ مناسب ہو اُسے قبول کرے اور جو غلطی ہو اس کا تدارک کر سکے، کیونکہ بہرحال امت کے معاملات کی نگہداشت کی ذمہ داری خلیفہ پر ہے اور خلیفہ ہی کے اجتہاد سے انجام پاتی ہے۔ اس کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے:

((الإمام راعٍ و مسؤول عن رعيته))

امام سرپرست، اور اپنی رعایا کا ذمہ دار ہے۔

لہٰذا عوام اور اُن کے معاملات کا اہتمام، یعنی حکومت، خلیفہ کی ذمہ داری ہوئی، نہ کہ معاون تفویض کی، بلکہ معاون تو محض اُن امور کا ذمہ دار ہے جنہیں وہ انجام دے، اور عوام کی ذمہ داری صرف خلیفہ ہی کی جوابدہی ہوگی، اسلئے خلیفہ کیلئے لازمی ہے کہ وہ معاون کے کام پر نگرانی کرے اور نظر رکھے، تاکہ وہ اپنی ذمہ داری، یعنی عوام کے امور کی نگہداشت صحیح ڈھنگ سے کر سکے۔ مزید یہ کہ اس بات کا امکان ہے کہ معاون سے غلطی سرزد ہو جائے، جس کا تدارک کیا جانا ضروری ہوگا، چنانچہ یہ خلیفہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاون کے ہر کام کی نگرانی کرتا رہے۔ لہٰذا خلیفہ کیلئے یہ لازمی ٹھہرا کہ وہ معاون کے کام پر نظر رکھے تاکہ دو باتیں ملحوظ رہیں: اول یہ کہ خلیفہ کی عوام کی نگہداشت کی ذمہ داری پوری ہو اور دوسری یہ کہ معاون سے سرزد ہونے والی کسی بھی ممکنہ خطا کا تدارک کیا جا سکے۔

جب معاون کسی معاملے میں کوئی فیصلہ کر لے اور خلیفہ اُس کو قبول کر لے یعنی اُس کام سے معاون کو نہ روکے، تو معاون اسے اُسی طرح بغیر کسی کمی بیشی کے انجام دے۔ لیکن اگر خلیفہ، معاون کے کسی کام کو جو انجام پا چکا ہو، مسترد کر دے تو معاملہ کی حقیقت کو دیکھا جائیگا؛ اگر صورتِ حال یہ ہے کہ کسی فیصلہ کو کما حقہ نافذ کیا گیا ہو، یا رقم کسی صحیح مصرف میں خرچ کی گئی ہو، تو معاون کی رائے ہی نافذ رہیگی، کیونکہ فی الحقیقت وہ خلیفہ کی رائے تھی، اور خلیفہ کو حق نہیں کہ وہ اپنے کسی فیصلہ کو تبدیل کرے خواہ وہ رقوم سے متعلق ہو؛ لیکن برخلاف اس کے اگر معاملہ کی نوعیت مثلاً فوج کی تیاری، یا والی کے تقرر کی ہو، تو خلیفہ کو حق ہے کہ وہ معاون کے فیصلہ کو مسترد کر کے اپنی رائے نافذ کرے۔ کیونکہ خلیفہ کو اپنے خود کے کئے ہوئے اقدامات تبدیل کرنے کا حق ہے، لہٰذا اُسے معاون کے اقدامات کو بدلنے کا بھی حق ہوا۔

معاون کے کام اور اُس پر خلیفہ کی نگرانی یا نظر ثانی کی یہ نوعیت ہوگی۔اس کی بنیاد یہ تھی کہ خلیفہ کن کاموں پر نظر ثانی کر کے تبدیل کر سکتا ہے اور کہاں ایسے کاموں میں تبدیلی کا حق نہیں رکھتا، کیونکہ معاون تفویض کے ذریعہ انجام پائے گئے افعال خلیفہ ہی کے افعال تصور کئے جاتے ہیں۔مثال کے طور پر معاون خود حکم صادر کر سکتا ہے، حکام کی تقرری کر سکتا ہے، ٹھیک اُسی طرح جیسے خلیفہ، کیونکہ معاون کو یہ اختیارات دئے گئے ہیں؛ معاون مظالم کی شکایات پر بھی عمل کر سکتا ہے کیونکہ یہ اختیار بھی اُسے سونپا گیا ہے؛ وہ جہاد پر بھی تصرف رکھتا ہے یا کسی کو یہ تصرف دے سکتا ہے، کیونکہ جنگ کے اختیارات بھی اُسے حاصل ہیں؛ معاون کسی بھی امور جس پر اُس نے فیصلہ لیا ہو عمل درآمد کر سکتا ہے یا کسی اور کو اُن امور پر عمل درآمد کیلئے مقرر کر سکتا ہے، کیونکہ اُسے اپنی رائے اور امور کے اہتمام کا اختیار سونپا گیا ہے۔لیکن اس سب کا یہ قطعاً مطلب نہیں کہ معاون جو کچھ بھی انجام دیدے یا نافذ کر دے، خلیفہ اُسے اس بنیاد پر کہ اسے اطلاع دی جا چکی ہے، منسوخ نہیں کر سکتا، بلکہ محض یہ کہ گو معاون کے اختیارات خلیفہ جیسے ہی ہوتے ہیں، لیکن بحیثیت نائبِ خلیفہ، نہ کہ خود مختار اور خلیفہ سے جدا معاون کی اپنی کوئی مستقل حیثیت سے۔خلیفہ کو بہر حال یہ اختیار ہے کہ وہ معاون کے کا انجام دئے ہوئے کسی بھی کام سے اختلاف کرے اور اسے مسترد کر دے۔البتہ جہاں تک انجام پا چکے کاموں کے مسترد کئے جانے کا سوال ہے، تو یہ اُن ہی حدود میں ممکن ہے، جن میں خلیفہ خود اپنے ذریعہ انجام دئے گئے کاموں کو مسترد کرنے کا حق رکھتا ہے۔پس اگر معاون نے کوئی حکم کما حقہ نافذ کیا، یا رقوم صحیح مصرف میں خرچ کیں ہوں اور خلیفہ اِن کے انجام پا جانے کے بعد اُس پر اعتراض کرے تو یہ اعتراض قابل قبول نہ ہوگا، بلکہ معاون کا فیصلہ ہی نافذ ہوگا اور خلیفہ کی رائے اور اعتراض مسترد ہو جائیگی، کیونکہ جو انجام پا چکا، وہ تو فی الحقیقت خلیفہ ہی کی رائے ہوئی۔اس قسم کے حالات میں خلیفہ کیلئے یہ صحیح نہیں کہ وہ اپنی رائے سے ہٹ جائے یا جو انجام پا چکا ہو اُسے منسوخ کرے، اور اپنے معاون کے ذریعے انجام دیا کام مسترد کر دے۔لیکن اگر معاون نے مثلاً ایک والی یا کوئی ملازم مقرر کیا ہو، یا فوج کا سربراہ وغیرہ مقرر کیا ہو، یا مثلاً اقتصادی پالیسی وضع کی ہو، فوجی اسکیم تیار کی ہو یا صنعتی اسکیم تیار کی ہو وغیرہ، تو خلیفہ کیلئے اِن کا منسوخ کیا جانا جائز ہوگا، کیونکہ اِن کو خلیفہ کی اپنی رائے تصور کئے جانے کے باوجود، خلیفہ اگر خود بھی یہ افعال انجام دے، تو اس کیلئے یہ جائز ہے کہ وہ اِن سے پیچھے ہٹ جائے یا اُنہیں ترک کر دے۔لہٰذا اِن حالات میں خلیفہ اپنے معاون کے انجام دئے ہوئے افعال منسوخ کر سکتا ہے۔ان دونوں حالتوں کی بنیاد یہ قاعدہ ہے کہ: خلیفہ کیلئے اپنے ذریعہ انجام دئے ہوئے جن افعال کو منسوخ یا ردّ کرنا جائز ہو، وہ اپنے معاون کے ذریعہ کئے گئے ایسے ہی افعال منسوخ یا ردّ کر سکتا ہے؛ اور ہر وہ چیز جو خود خلیفہ نے انجام دی ہو اور اس کو منسوخ کرنا خلیفہ کیلئے جائز نہ ہو، تو خلیفہ اپنے معاون کے ذریعے کئے گئے ایسے افعال منسوخ یا ردّ نہیں کر سکتا۔

معاون تفویض کیلئے یہ صحیح نہیں کہ کسی مخصوص دائرے یا محکمہ تک اسے محدود کیا جائے مثلاً اُسے صرف تعلیم کا محکمہ دیا جائے، یا کسی مخصوص شعبہ تک اُسے محدود کر دیا جائے جیسے فوج کی تیاری یا فوج کو اسلحہ سے لیس کرنا وغیرہ، کیونکہ اُسے اشراف عام

دے کر مقرر کیا گیا ہے۔اسی طرح وہ محض انتظامی امور تک محدود نہیں کیا جاسکتا بلکہ خلیفہ کی طرح معاون تمام انتظامی امور پر نگراں ہوتا ہے۔مزید یہ کہ اگر معاون کو مقرر کرتے وقت ہی اسکی تقرری مخصوص امور تک محدود رکھی جاتی ہے اور اشراف عام نہیں دیا جاتا تو معاون کی تقرری کا انعقاد ہی صحیح نہیں ہوگا، کیونکہ معاون کیلئے اشراف عام شرط ہے۔رہی مثال قاضی القضاۃ کی ،تو وہ خلیفہ کا قضاء کے معاملات میں معاون نہیں ہوتا بلکہ اُسکی تقرری بحیثیت والی کے ہوتی ہے جسے ایک خاص امر یعنی قضاء کا شعبہ دیا جاتا ہے جو کہ حکومت سے جدا ہے،اسی طرح فوج کی قیادت،صدقات کی امارت وغیرہ کا معاملہ ہے،اور اُن کی تقرری والی کی طرح ہوتی ہے، نہ کہ معاون تفویض کی طرح۔قاضی القضاۃ اپنے دائرے کا امیر ہوتا ہے جو قاضیوں کا تقرر،قضاء کے معاملات پر نگرانی اور لوگوں کے تنازعات حل کرنے پر مامور ہوتا ہے؛ قاضی القضاۃ کی حیثیت نائب کی طرح نہیں ہوتی۔لہٰذا معاون تفویض کو کسی دائرے میں محدود کر دینا صحیح نہیں ہوتا،اور اگر ایسا کر دیا جائے تو معاون کی تقرری باطل ہو جاتی ہے، کیونکہ معاون کی تقرری کیلئے ضروری ہے کہ عقد یا معاہدہ کیا جائے یعنی صراحت سے دونوں شرطیں ادا کی جائیں: اشراف عام اور نیابت۔اب کسی دائرے میں معاون کی تخصیص اِن شروط میں نقص کے مترادف ہوگی جس سے اس کی تقری کا عقد باطل ہو جائیگا۔رہی بات معاون کو امور انتظامی تک محدود کرنے کی ،تو جو لوگ انتظامی امور سنبھالتے ہیں وہ ملازمین ہوتے ہیں نہ کہ حاکم؛ جبکہ معاون تفویض حاکم ہوتا ہے نہ کہ ملازم۔معاون تفویض کا کام امور کا اہتمام کرنا ہے نہ کہ وہ کام جن کیلئے ملازمین کا تقرر کیا جاتا ہے۔

لہٰذا معاون تفویض محض انتظامی امور پر مامور نہیں ہوسکتا، گو کہ وہ انتظامی امور بھی انجام دے سکتا ہے کیونکہ اس کے اختیار میں اشراف عام ہے۔

معاون تنفیذ:

معاون تنفیذ ،خلیفہ کا وہ وزیر ہوتا ہے جسے خلیفہ معاملات کے نفاذ ،اُن پر پیش رفت سے باخبری اور اُن کی تعمیل کیلئے تعینات کرتا ہے۔معاون تنفیذ ،خلیفہ اور ریاست کے تمام محکمات اور اداروں کے مابین ایک واسطہ (Link) ہوتا ہے، نیز وہ خلیفہ اور عوام کے درمیان اور بیرونی ممالک سے رابطوں میں واسطہ ہوتا ہے مزید یہ کہ وہ معاملات کے نفاذ میں خلیفہ کا معاون ہوتا ہے،لیکن اسے بذاتِ خود احکام جاری کرنے کا اختیار نہیں ہوتا، نہ ہی معاملات اُسکی صوابدید سے نفاذ کیلئے اس کے سپرد کئے جاتے ہیں۔لہٰذا معاون تنفیذ کے کام کی نوعیت انتظامی ہے نہ کہ حاکمیت کی۔معاون کا دائرہ عمل خلیفہ کے صادر کردہ احکامات کو اُن کے داخلی اور خارجی محکمات تک پہنچانا اور اِن محکمات سے جاری تحریریں (Correspondence/Records) خلیفہ تک پہنچانا ہے۔چنانچہ معاون تنفیذ ،خلیفہ اور باقی شعبوں کے درمیان رابطہ کا کام کرتا ہے۔

خلیفہ ایک حاکم ہے جس کی ذمہ داریوں میں حاکمیت،احکام کا نفاذ اور تمام امور کی نگہداشت ہوتی ہے۔اِن تمام افعال کیلئے ایک انتظامیہ یا اداری ڈھانچہ درکار ہوتا ہے جس کا تقاضہ ہے کہ خلیفہ کے پاس ایک مخصوص ادارہ ہو جو اِن ذمہ داریوں کو

ادا کر سکے۔ لہٰذا یہ ضروری ہوا کہ خلیفہ اپنا معاون مقرر کرے جو خلیفہ کی انتظامی امور میں مدد کرے نہ کہ حاکمیت میں۔ معاون تنفیذ کی ذمہ داریوں میں کوئی حاکمیت کا کام نہیں ہوتا جیسا کہ معاون تفویض کرتا ہے؛ معاون تنفیذ نہ تو والیوں کا تقرر کرتا ہے نہ عاملوں کا اور نہ ہی عوام کے امور کا اہتمام معاون تنفیذ کی ذمہ داریوں میں سے ہے، بلکہ اُس کا کام انتظامی امور سے متعلق ہے کہ خلیفہ یا معاون تفویض کے صادر کردہ احکامات کی تنفیذ کرنا ہے، یہی معاون تنفیذ کے عہدہ کے نام کا سبب ہے۔ فقہاء نے اس عہدہ کو "وزیر تنفیذ" کہا ہے، جو معاون تنفیذ کے ہم معنی ہے، کیونکہ لفظ "وزیر" معاون کے مترادف ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ: "یہ وزیر؛ خلیفہ، رعایا اور والیوں کے درمیان واسطہ ہے، یہ اُن کاموں کی تعمیل کرتا ہے جو اُسے حکم دیا جائے یا اُسے بتایا جائے، اُن امور کی تنفیذ کرتا ہے جو اُسے حکم دئے جائیں، والیوں کی تقرری سے ہر متعلقہ فرد یا ادارے کو باخبر رکھتا ہے، فوج یا عسکری دستوں کی تیاری اور بندوبست سے خلیفہ کو آگاہ رکھتا ہے اور اُن کی ضروریات سے باخبر کرتا ہے۔ نئے حالات سے خلیفہ کو باخبر رکھتا ہے تاکہ حسبِ ضرورت خلیفہ اُن کے مطابق احکام جاری کر سکے۔ لہٰذا معاون تنفیذ معاملات کے نفاذ میں مدد کرنے والا ہے نہ کہ اُن پر حاکم اور نہ ہی امور معاون تنفیذ کی سپردگی میں دئے جاتے ہیں۔

معاون تنفیذ، کا خلیفہ سے براہِ راست تعلق رہتا ہے جس طرح معاون تفویض کا ہوتا ہے اور معاون تنفیذ، خلیفہ کے رفقائے خاص میں ہوتا ہے نیز یہ کہ گو معاون تنفیذ کا کام انتظامی نوعیت کا ہے، وہ حاکمیت سے جڑا ہوا رہتا ہے، چنانچہ یہ جائز نہیں کہ وہ عورت ہو، کیونکہ عورت حاکم نہیں ہو سکتی۔ حضور ﷺ کا قول بخاری شریف میں ابی بکرہؓ سے روایت ہے: ((**لن یفلح قوم ولّوا امرأة**)) یعنی وہ قوم فلاح یاب نہیں ہو سکتی جس پر عورت حاکم ہو۔ اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ معاون تنفیذ کافر ہو، بلکہ یہ لازمی ہے کہ وہ مسلمان ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يٰا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنوا لا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِن دُونِكُمْ لَا يَالُونَكُمْ خَبَالاً وَدُّوا مَاعَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ البَغْضَآءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ اكْبَرُ﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اپنے سوا دوسروں کو اپنا محرم راز نہ بناؤ؛ وہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے؛ جتنی بھی تم زحمت میں پڑو انہیں محبوب ہے۔ ان کا بغض تو ان کے منہ سے ظاہر ہو چکا ہے، اور جو کچھ ان کے سینے میں چھپائے ہوئے ہیں وہ تو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ آل عمران: ۱۱۸)

اس آیت میں یہ صریح کر دیا گیا کہ خلیفہ کے رفقائے خاص میں غیر مسلم نہ ہوں، چنانچہ یہ جائز نہیں کہ معاون تنفیذ کافر ہو، اس کا مسلم ہونا لازمی ہے، کیونکہ وہ خلیفہ کے رفقاء میں سے ہے، اور معاون تفویض کی طرح خلیفہ کے ساتھ ہے۔ نیز یہ بھی جائز ہے کہ معاون تنفیذ بہ اعتبار ضرورت ایک سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ جن امور میں معاون تنفیذ واسطہ ہو سکتا ہے وہ یہ چار امور ہیں:

۱-ریاست کا ہیکل (Structure)

۲-افواج

۳-امت (رعایا)

۴-امور خارجہ

یہ معاون تنفیذ کے کام کی حقیقت ہوئی کہ وہ ایک واسطہ ہونے کے سبب خلیفہ تک معاملات پہچانے اور خلیفہ سے دوسروں تک پہچانے کا وسیلہ ہے۔اس میں تمام محکمات کے کام کاج کی پیش رفت پر نظر رکھنا بھی شامل ہے۔

خلیفہ ہی کیونکہ اصل حاکم ہوتا ہے، اور خود ہی حکومت کرتا ہے، احکام کا نفاذ کرتا ہے، عوام کے معاملات کی نگہداشت کرتا ہے؛ اور ان سب کیلئے لازم ہے کہ وہ ہر وقت حکومت کے مختلف محکموں سے تعلق میں رہے، بین الاقوامی حالات سے واقف رہے، اور امت سے منسلک رہے۔خلیفہ ہی احکامات صادر کرتا ہے، فیصلے کرتا ہے، عوامی امور کی نگہداشت اور حکومتی ڈھانچے کی حالت سے، ان کے کام میں دقتوں سے، اُن کی ضروریات سے واقفیت رکھتا ہے، امت کے تمام معاملات اور شکایات کی خبر اور بیرونی حالات پر نظر رکھتا ہے۔معاون تنفیذ حقیقتاً اِن تمام معاملات میں ایک واسطہ ہوتا ہے، جو خلیفہ تک معاملات پہنچاتا ہے اور خلیفہ سے باقی اداروں یا محکموں کو۔ظاہر ہے کہ خلیفہ کے فیصلے جو محکمات تک پہچائے گئے، یا محکمات سے معاملات جو خلیفہ تک پہچائے گئے، اُن کی بہتر کارکردگی کیلئے ضروری ہے کہ ان معاملات اور فیصلوں کی تعمیل کی پیش رفت پر نظر رکھی جائے، اور تعمیل کی پیش رفت پر نظر رکھنا معاون تنفیذ کا ہی کام ہے، جب تک کہ تعمیل مکمل نہ ہو جائے۔اس طرح معاون تنفیذ خلیفہ کے پاس معاملات کی نیز مختلف محکمات کے پاس معاملات کی پیش رفت پر نظر رکھتا ہے تاوقیکہ کہ خود خلیفہ ہی اسے ایسا کرنے سے روک دے، اب معاون تنفیذ پر حکم کے مطابق اس نگرانی (Follow-up) سے رک جاتا ہے کیونکہ بہرحال خلیفہ ہی حاکم ہے اور اسی کا حکم قابل نفاذ ہوتا ہے۔

فوجی معاملات اور بین الاقوامی تعلقات سے متعلق امور چونکہ صیغہ رُاز میں ہوتے ہیں، اسلئے معاون ایسے معاملات کی تعمیل اور ان کی پیش رفت (Follow-up) پر نظر نہیں رکھتا، تاوقیکہ خلیفہ از خود معاون تنفیذ سے یہ مطالبہ کرے، ایسی صورت میں معاون صرف ان ہی معاملات میں تعمیل کی پیش رفت پر نظر رکھ سکتا ہے جس کیلئے خلیفہ نے معاون سے مطالبہ کیا ہو۔

رہے وہ معاملات جو امت سے متعلق ہیں جیسے امت پر ظالم وغیرہ یہ سب خلیفہ یا اس کے نائب کے کام ہیں اور معاون تنفیذ کا ان میں دخل نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ خلیفہ کے حکم پر معاون ان معاملات کی خبر گیری کرے، ان معاملات میں معاون کا کام کم محض تعمیل ہے نہ کہ اُن کی پیش رفت پر نظر، یہ کاموں کی نوعیت پر منحصر ہوتا ہے۔

امیر جہاد

امیر جہاد ریاستِ خلافت میں وہ شخص ہے جسے خلیفہ ٔ ریاست، امور خارجہ (Foriegn Affairs)، فوجی اور جنگی امور (Military Affairs)، داخلی امن (Internal Security)، اور صنعت (Industries) کا امیر مقرر کرتا ہے تاکہ اِن معاملات کی نگرانی اور انتظام واہتمام کیا جا سکے۔

امیر جہاد ان چار امور پر امیر و نگراں ہوتا ہے، کیونکہ یہ چاروں امور جہاد سے متعلق ہیں؛ لہٰذا امور خارجہ، حالتِ جنگ وامن میں جہاد کے تقاضوں سے وابستہ ہوتے ہیں؛ امور حربی جہاد سے جڑے ہوتے ہیں جن میں فوج کا جہاد کیلئے مستعد رہنا، اس کا ساز و سامان سے لیس اور مسلح ہونا وغیرہ شامل ہے؛ داخلی امن میں ریاست کی حفاظت وحمایت کرنا، اس میں امن اور قانون کی بالادستی برقرار رکھنا، بغاوتوں سے نمٹنا، پولیس جو جہاد کیلئے تیار فوج ہی کا حصہ ہے، اسکی مدد سے راستوں کو ڈاکوؤں سے محفوظ رکھنا؛ صنعت، جس کے وسیلہ سے جہاد کی تیاری کیلئے جنگی اسلحہ اور ساز وسامان تیار کیا جاتا ہے، یہ سب امور جہاد سے وابستہ معاملات ہیں اور جو شخص ان امور پر نگران وامیر مقرر ہو وہ امیر جہاد کہلاتا ہے۔

حالانکہ امیر جہاد حاکم نہیں ہوتا لیکن اسے امیر جہاد کہا جاتا ہے کیونکہ اسکے کام کی نوعیت کے سبب اسے دن رات متعدد احکامات صادر کرنا ہوتا ہے۔ درحقیقت لفظ 'امیر' 'ا مُر' کے فاعل یعنی 'آ مر کا 'فعیل' کے وزن پر صیغہ ٔ مبالغہ ہے، اس کی مثال بالکل لفظ 'رحیم' کے مترادف ہے جو کہ 'رحم' کے فاعل 'راحم' کا صیغہ ٔ مبالغہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے رحم کی کوئی انتہا نہیں۔

امیر جہاد کا دائرہ ٔ کار ان چار محکمات پر محیط ہوتا ہے:

۱- محکمہ ٔ خارجی۔ (Foreign Affairs)

۲- محکمہ ٔ حربی (جنگی اور فوجی)۔ (Military Affairs)

۳- محکمہ ٔ داخلی امن۔ (Internal Security)

۴- محکمہ ٔ صنعت۔ (Industries)

امیر جہاد ان چاروں محکمات پر نگرانی اور ان کا انتظام واہتمام کرتا ہے۔

اسلام میں جہاد وہ طریقہ ہے جس سے اسلام کی دعوت سارے عالم میں پہنچائی جاتی ہے، بلکہ ریاستِ اسلامی کیلئے اپنی حدود میں اسلام کو مکمل طور سے نافذ وجاری کر دینے کے بعد، دعوتِ اسلام کو تمام دنیا تک پہنچانا ہی اصل کام ہے۔ لہٰذا جہاد کے احکام میں جنگ وامن کے احکام کے ساتھ ساتھ صلح وجنگ بندی کے احکام، بیرونی ممالک اور اداروں سے تعلقات کے احکام بھی شامل ہوتے ہیں۔ اسی کے ساتھ فوجی ضابطے، فوج کی تیاریاں اور فوجیوں کی تربیت، فوجی قیادت کا تیار کرنا، فوج کے پرچم اور نشان فوج کیلئے اسلحہ، جنگی مصنوعات اور اُس کی دیگر ضروریات جن سے فوج کی جنگی تیاری مکمل ہوتی ہو اور جو کھلے ہوئے اور چھپے ہوئے

دشمن کو زیر کرنے کیلئے کافی ہو، یہ تمام امور جہاد کے احکام میں شامل ہوتے ہیں۔ان امور کے علاوہ ریاست کے اندر قانون کی بالادستی قائم رکھنا، اُس میں بغاوت کو روکنا، سرکوبیوں سے نمٹنا، سڑکوں اور شاہراہوں کو محفوظ رکھنا، داخلی امن کو ہر خطرے سے محفوظ رکھنا اور ریاست کی رعایا کے خلاف جرائم کو روکنا بھی جہاد کے احکام کا جزو ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اور آپ ﷺ کے بعد خلفاء نے جہاد سے متعلق امور خود اپنے ہی ہاتھ میں رکھے۔آپ ﷺ اور خلفاء بعض اشخاص کو جہاد کے مخصوص یا تمام کاموں پر متعین کیا کرتے تھے جن میں فوج کی تیاری، اصل معرکہ آرائی، جنگ بندی یا صلح کے عہد، یا بیرونی ممالک سے رابطے اور باغیوں اور مرتدوں سے قتال شامل ہے۔

خلیفہ کو اس کا اختیار رہتا ہے کہ جو کام وہ خود کرتا ہو، اُس کیلئے وہ کسی اور کو اپنی طرف سے نامزد کر سکتا ہے، اس قاعدے کے مطابق امیر جہاد اور اُس کیلئے ایک مخصوص محکمہ قائم ہونے کی شکل پیدا ہوتی ہے۔

امیر جہاد کا محکمہ کیونکہ جہاد اور اُسکے احکام سے متعلق ہے، لہٰذا یہ لازمی ہوا کہ اُس میں بیرونی ممالک سے رابطے اور تعلقات بھی شامل ہوں، کیونکہ بیرونی روابط ہی اس بات پر مبنی ہیں کہ اسلام کی دعوت اور اس کے پیغام کو سارے عالم تک پہنچایا جائے، پھر اس محکمہ میں جنگی پہلو بھی ہے، کیونکہ جہاد اللہ تعالیٰ کے راستہ میں قتال کا نام ہے جس سے اللہ کا کلمہ بلند کرنا مقصود ہو، نیز قتال کیلئے فوج، پھر اس کی تیاری، اسکی مناسب قیادت، سپاہی اور افسران، اُن کی تربیت، پھر اُن کو ساز و سامان سے لیس کرنا اور اُن کی ضروریات کو بہم پہنچانا شامل ہوتا ہے۔

مزید یہ کہ فوج کیلئے اسلحہ بھی ضروری ہے جس کیلئے صنعت کاری درکار ہوتی ہے، چنانچہ صنعت فوج اور جہاد کیلئے ضروری ہوئی۔اسلئے یہ ضروری ہے کہ ریاست کی صنعتیں، جنگی صنعت کاری کی بنیاد پر قائم ہوں اور یہ کہ تمام صنعتیں جہاد اور امیر جہاد کے تابع ہوں۔

فوج ایک طرف اسلام کی دعوت پہنچانے کیلئے جہاد کرتی ہے، دوسری طرف ریاست کی حفاظت کرتی ہے جس میں باغیوں اور ڈکیتوں کی سرکوبی، فوج کی ذمہ داریوں میں شامل ہے، چنانچہ ریاست کا داخلی امن امیر جہاد کے تابع ہوا۔اس طرح محکمۂ امیر جہاد کے چار دفاتر قرار پاتے ہیں: بیرونی تعلقات، جنگ، داخلی امن اور صنعت۔

دفتر امورِ خارجہ

ریاستِ خلافت کے بیرونی ممالک سے ہر قسم کے تعلقات و روابط دفتر امور خارجہ کے ضمن میں آتے ہیں خواہ ان معاملات کی نوعیت کیسی بھی ہو، چاہے یہ سیاسی معاملات ہوں، یا معاہدات اور جنگ بندی و صلح سے متعلق ہوں، گفتگو ہو یا ایک دوسرے کے سفیروں کا تقرر ہو، پیام رسانی کیلئے کارندوں اور وفود کی آمد و رفت ہو، سفارت خانوں اور قونصل خانوں کا قیام ہو؛ یا پھر معاملات اقتصادی نوعیت کے ہوں، زراعت سے متعلق ہوں، تجارتی ہوں، ڈاک (Post) کے مواصلات سے متعلق ہوں، یا اسلکی

مواصلات (Electronic Communication) وغیرہ، تمام امور جو ریاست اور بیرونی ممالک کے درمیان ہوں وہ دفترِ خارجہ کی ذمہ داریوں کا حصہ ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے دوسرے ممالک اور علاقوں سے تعلقات قائم کئے تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قریش سے بات چیت کیلئے بھیجا تھا اور آپ ﷺ خود قریش کے قاصدوں سے بات چیت کرتے تھے، بادشاہوں کو خطوط روانہ فرماتے تھے اور بادشاہوں اور امیروں کے پیام بروں سے ملاقات کرتے، اُن سے مصالحت اور معاہدات کرتے تھے۔ آپ ﷺ کے بعد خلفاء نے بھی بیرونی ممالک سے سیاسی تعلقات قائم کئے اور اس کام کیلئے لوگوں کا تقرر بھی کیا۔ یہ تقرر اس بناء پر ہوتا ہے کہ کوئی شخص جو کچھ خود کرتا ہو، اسے ایسے کام کیلئے کسی اور کو نامزد کرنے کا اختیار ہے جو وہی کام اس شخص کے عوض کرے۔

دفترِ حرب (جنگ کا دفتر)

دفترِ حرب کے ذمہ ہر وہ کام ہوتا ہے جو افواجِ مسلح سے متعلق ہو، خواہ یہ مسلح افواج، فوج ہوں پولیس ہو، اُن کا ساز سامان ہو، اسلحہ ہوں، یا اسی قسم کی کوئی اور چیز، یا پھر عسکری کالج (Military Academies) ہوں، یا پھر فوج میں اسلامی ثقافت کی تربیت یا کوئی بھی ایسی چیز جو جنگ یا جنگ کی تیاری سے متعلق ہو۔

دفترِ حرب ان تمام امور کو انجام دیتا ہے اور نگراں ہوتا ہے، اِس کا نام جنگ اور قتال سے مترادف ہوتا ہے۔ جنگ کیلئے فوج ناگزیر ہے جس کیلئے ضروری ہے کہ اُسے تربیت دیجائے، اس کیلئے قیادت، افسران، اور سپاہی رکھے جائیں اور اُن کو تیار کیا جائے۔

فوج کے پرچم اور علَم (Flags & Banners) ہوتے ہیں، فوج کی ترتیب، جسمانی تربیت اور فنّی مہارت (Technical Expertise)، جس میں جنگی فنون کی تربیت اور مختلف اسلحہ کو چلانے کی مشق شامل ہوتی ہے، جو نئی ایجادات اور ٹکنیک کے مطابق ہو۔ لہٰذا معرکہ آرائی کے نئے طور طریقوں اور نئے قسم کے اسلحہ کی تربیت (Training) بھی ضروریات میں شامل ہیں۔ چونکہ یہ فوج اسلامی ہے جو کہ ریاستِ خلافت کی فوج ہے، جس کا کام اسلام کی دعوت کو عام کرنا ہے، چنانچہ اس فوج کیلئے لازمی ہے کہ اس کی تربیت اسلامی تمدن اور اسلامی تہذیب پر ہو۔ خاص طور پر اسلامی تہذیب کے اُن پہلوؤں پر جو قتال اور احکام قتال سے متعلق ہیں، صلح، جنگ، جنگ بندی اور معاہدات سے، نیز اُن کی تفاصیل سے متعلق ہیں۔ لہٰذا فوجی اسکول اور کالج محکمہ حرب ہی سے متعلق ہونگے۔

داخلی امن کیلئے فوج کا ایک حصہ مخصوص ہوگا، جو کہ شرطہ (Police) کہلائیگی۔ فوج اور پولیس کیلئے یہ لازمی ہے کہ اُنہیں ہر قسم کے اسلحہ اور ساز و سامان سے لیس رکھا جائے اور اُن کی دیگر ضروریات بھی پوری کی جائیں، جو اُن کی ذمہ داریوں کی تکمیل کیلئے ناگزیر ہوں۔

اس طرح محکمہ حرب سے متعلق ذمہ داریوں کا احاطہ ہوتا ہے۔

محکمہ امن داخلی:

محکمہ امن داخلی کی ذمہ داریوں میں ہر وہ معاملہ آتا ہے جو داخلی سلامتی سے متعلق ہو۔ یہ محکمہ اس کی انجام دہی فوج اور خاص طور سے پولیس کے ذریعہ کرتا ہے۔ یہ محکمہ جس طرح اور جس وقت چاہے پولیس کو استعمال کر سکتا ہے اور اسکے حکم پر فوراً تعمیل ہونا ہوتا ہے۔ لیکن جب داخلی امن کو برقرار رکھنے کیلئے اس محکمہ کو فوج کی مدد درکار ہو تو یہ ضروری ہے کہ یہ محکمہ خلیفہ سے فوجی امداد طلب کرے۔ اب یہ خلیفہ کی صوابدید پر ہے کہ وہ یا تو فوج کو اس محکمہ کی امداد کا حکم دے، یا فوج (کی کچھ ٹکڑیاں) اس محکمہ کو وقتی طور پر سپرد کرے یا کسی اور طرح اس محکمہ کی امن برقرار رکھنے میں مدد کرے یا پھر اس محکمہ کی طلب کو سرے سے مسترد کر دے اور اُسے حکم دے کہ وہ صرف پولیس ہی کے ذریعہ اپنی ذمہ داری پوری کرے۔

محکمہ امن داخلی پر ریاست میں امن قائم رکھنے کی مکمل ذمہ داری ہوتی ہے۔ جن چیزوں سے ریاست کے داخلی امن کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے وہ یہ ہیں: اسلام سے ارتداد، ریاست سے بغاوت، جیسے ہڑتالوں، تخریبی (Sabotage) کارروائیاں، ریاست کے اہم مراکز پر قبضہ، عوام کے مال و متاع، یا حکومت کے اثاثوں اور ملکیت، یا عوامی ملکیت کے اثاثوں پر حملہ۔

ریاست سے بغاوت میں یہ بھی شامل ہے کہ اسلحہ استعمال کر کے لڑا جائے۔ ایسے اور افعال جن سے داخلی امن کو خطرہ ہو سکتا ہے، اُن میں 'راہزنی، لوگوں سے اس طرح تعرض کرنا کہ اُن کی جانوں یا اموال کو خطرہ ہو۔ مزید وہ باتیں جن سے داخلی امن کو نقصان پہنچ سکتا ہے اُن میں لوگوں پر حملہ، چوری، لوٹ، ڈکیتی، دھوکہ دھڑی یا غبن، اس طرح تعرض کرنا کہ لوگوں کی جان کو نقصان پہنچے، زخمی ہوں، قتل، لوگوں کے بارے میں جھوٹ پھیلانا، جھوٹی الزام تراشی اور زنا۔ یہ تمام باتیں ریاست کے داخلی امن کو متاثر کر سکتی ہیں، اور محکمہ امن داخلی ان تمام حادثات میں ریاست اور عوام کی حمایت و مدد کرتا ہے۔ چنانچہ مثلاً اگر ایک شخص مرتدّ ہوتا ہے اور پھر توبہ کر کے اسلام میں رجوع نہیں کرتا اور اُس کو قتل کا حکم ہوتا ہے تو محکمہ امن داخلی ہی اس قتل کے حکم کو نافذ کرتا ہے۔ البتہ اگر ایک شخص کے بجائے ایک گروہ مرتدّ ہو جاتا ہے، تو پھر ریاست ان سے رجوع کرنے کو کہتی ہے، اگر وہ مان لیتے ہیں تو معاملہ ختم ہو جاتا ہے اور اگر وہ مرتدّ ہونے پر اڑے رہتے ہیں تو پھر ان سے مقابلہ کیا جائیگا، اگر یہ گروہ چھوٹا ہے تو پھر صرف پولیس ہی کے ذریعہ، اور اگر گروہ بڑا ہے اور پولیس اکیلے ان سے مقابلہ نہیں کر سکتی، تو پھر محکمۂ امن داخلی خلیفہ سے فوجی مدد طلب کریگا اور اگر یہ مدد بھی کافی نہ ہو، تو خلیفہ سے مزید مدد طلب کی جائیگی۔

یہ تو معاملہ تھا مرتدین کے ساتھ، اور جہاں تک بغاوت کا معاملہ ہے، تو اگر یہ بغاوت غیر مسلحہ ہے، اور یہ ہڑتال، سبوتاژ اور مظاہروں تک محدود رہتا ہے، اور ایسے لوگ ذاتی، حکومتی یا عوامی املاک (Public Properties) اور اثاثوں پر حملہ آور ہوتے ہیں اور انہیں نقصان پہنچاتے ہیں، یا اہم نوعیت کے حکومتی مراکز پر قابض ہو جاتے ہیں، تو ایسی صورت میں محکمۂ امن داخلی ان تخریب کاریوں کی روک تھام کیلئے پولیس پر اکتفاء کریگی، اور اگر پولیس ایسا نہیں کر پاتی ہے تو پھر خلیفہ سے فوجی امداد طلب

کی جائیگی تاکہ ان تخریبی کاروائیوں کو روکا جاسکے جو باغی کررہے ہوں۔

اس کے برعکس اُس صورتِ حال میں کہ باغی ہتھیار اُٹھالیں، اور ایک مقام پر جم جائیں کہ محکمۂ امن داخلی کیلئے یہ ممکن نہ ہو کہ محض پولیس کی مدد سے اُن پر قابو پاسکے، تو پھر محکمۂ امن داخلی خلیفہ سے یا تو پولیس کی مدد کیلئے کچھ فوجی ٹکڑیاں طلب کرسکتا ہے یا ضرورت کے مطابق فوج طلب کرسکتا ہے تاکہ ایسے باغیوں کی سرکوبی کی جاسکے۔ اس حالت میں بھی محکمۂ امن داخلی کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ باغیوں سے پیغام رسانی کرکے یہ بات یقینی کرلے کہ وہ چاہتے کیا ہیں اور یہ کہ اُنہیں دوبارہ اطاعت کی طرف بلائیں، تاکہ وہ جماعت میں شامل ہوں اور ہتھیار ڈال دیں۔ اگر باغی اس پر راضی ہوجاتے ہیں، تو اُن سے معارضہ نہیں کیا جائیگا لیکن اگر وہ انکار کریں اور اپنی بغاوت پر قائم رہیں، تو پھر اُن سے لڑا جائیگا، لیکن اُنہیں محض زیر کرکے اطاعت و جماعت میں لانے کی غرض سے نہ کہ اُنہیں تباہ اور ختم کرنے کیلئے، تاکہ وہ بغاوت سے باز آجائیں اور اطاعت قبول کرلیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی طرح خوارج کے ساتھ معاملہ کیا تھا کہ پہلے اُنہیں دعوت دی کہ وہ اطاعت قبول کرلیں، اور بغاوت سے باز آجائیں، تاکہ اُن پر کوئی کارروائی نہ کی جائے؛ پھر بھی جب وہ بغاوت سے باز نہ آئے تو اُن سے اِس غرض سے قتال کیا گیا کہ وہ اطاعت قبول کرلیں، بغاوت نہ کریں اور ہتھیار ڈال دیں۔

ایسے باغی جو راہزنی کریں، جو لوگوں پر حملے کریں، شاہراہوں پر رکاوٹیں کھڑی کریں اور لوگوں کا قتل کریں تو محکمۂ امن داخلی اُن کا پولیس کے ذریعہ مقابلہ کریگی اور اُن کو سزا دی جائیگی، جو قتل، یا ہاتھ اور پیر کاٹنے کی ہوتی ہے یا انہیں کسی اور جگہ محصور کردیگی جیسا کہ قرآن حکیم میں آیا ہے:

﴿إِنَّمَا جَزَؤُاْ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللهَ وَ رَسُولَهُ وَ يَسْعَوْنَ فِي الأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُواْ أَوْ يَصَلَّبُواْ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَ أَرْجُلُهُمْ مِن خِلَفٍ أَوْ يُنفَوْاْ مِنَ الأَرْضِ﴾

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑتے ہیں، اور زمین میں بگاڑ پیدا کرنے کیلئے تگ و دو کرتے ہیں، ان کا صلہ بس یہی ہے کہ بری طرح قتل کئے جائیں، یا سولی پر چڑھائے جائیں، یا ان کے ہاتھ اور ان کے پیر مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا انہیں ملک سے نکال دیا جائے۔ (ترجمہ معانی قرآن کریم: المائدہ: آیت ۳۳)

ایسے لوگوں سے قتال اُن لوگوں سے قتال سے مختلف ہے جو ریاست سے بغاوت کریں اور ہتھیار اُٹھائیں۔ اُن باغیوں سے قتال اُنہیں اطاعت میں لانے کی غرض سے کیا جاتا ہے جبکہ اِس قسم کے ڈکیتوں سے قتال اُنہیں قتل کرنے اور سولی پر چڑھانے کیلئے ہوتا ہے۔ یہ لوگ مقابلہ کریں یا بھاگ کھڑے ہوں اُن سے لڑا جاتا ہے جیسا کہ آیت میں وارد ہوا۔ اِن میں سے جو قتل اور مال لوٹنے کا مرتکب ہو، وہ قتل بھی کیا جائیگا اور سولی پر بھی چڑھایا جائیگا؛ جو قتل کرے لیکن مال لوٹنے کا مرتکب نہ ہو، تو وہ قتل کیا جائیگا لیکن سولی پر نہیں چڑھایا جائیگا؛ جو مال لوٹے لیکن قتل کرنے کا مرتکب نہ ہو، اس کا، یا تو داہنا ہاتھ اور باہنا پیر، یا پھر

باہنا ہاتھ اور داہنا پیر کاٹ دیا جائیگا اور وہ قتل نہیں کیا جائیگا؛ اور جو ہتھیار اُٹھائے اور لوگوں کو ڈرائے دھمکائے، لیکن قتل اور مال لوٹنے کا ارتکاب نہ کرے، تو وہ نہ قتل کیا جائیگا، نہ سولی چڑھایا جائیگا نہ ہی اُس کے ہاتھ پیر کاٹے جائینگے بلکہ اُسے اُس شہر سے دوسرے شہر میں رہنے پر مجبور کیا جائیگا یعنی شہر بدر کر دیا جائیگا۔

محکمۂ امنِ داخلی ریاست میں امن قائم رکھنے کیلئے اُس وقت تک صرف پولیس پر اکتفاء کرتی ہے، اور جب پولیس امن بقرار رکھنے سے قاصر ہو تب ہی محکمۂ امنِ داخلی خلیفہ سے فوجی دستہ کی مدد یا فوجی مدد، جیسی ضروری ہو طلب کرتا ہے۔

لوگوں کے اموال سے تعرض کے معاملے جیسے چوری، لوٹ اور لوگوں کی جان سے تعرض جیسے کسی کو زخمی یا قتل کر دینا، یا لوگوں کے خلاف جھوٹی باتیں اُڑانا، جھوٹے الزام لگانا یا زنا، تو محکمۂ امنِ داخلی ایسے واقعات و حادثات کو نگرانی (Vigilance) اور گشت (Patrolling) سے روکتا ہے، اور اِن جرائم کے مرتکب لوگوں کے خلاف عدالتی احکامات کا نفاذ کرتا ہے۔ اِن سب کیلئے محکمۂ امنِ داخلی صرف پولیس ہی پر اکتفاء کرتا ہے۔

محکمۂ صنعت:

اس محکمہ کا احاطہ ہر قسم کی صنعت کے معاملات پر ہوتا ہے؛ خواہ وہ بڑی صنعتیں ہوں جیسے گاڑیوں اور مشینوں کی صنعت؛ گاڑیوں کے ڈھانچے (Vehicle Body) کی صنعت کاری؛ یا الیکٹرونکس کے ساز و سامان اور پرزوں کی صنعت کاری؛ یا پھر چھوٹی صنعتیں، کارخانے جو کہ عوامی ملکیت کے ہوں؛ یا چھوٹے کارخانے جو ذاتی ملکیت کے ہوں، اور جنگی صنعت سے متعلق ہوں یا وہ صنعتیں جن کو قائم کرنا جنگی حکمتِ عملی کے پیشِ نظر ضروری ہو۔ جہاد اور قتال کیلئے فوج ضروری ہوتی ہے اور فوج کیلئے اسلحہ ناگزیر ہوتا ہے۔ پھر یہ اسلحہ بہترین نوعیت کا ہو اور ہر وقت فوج کو میسر رہے، اس کیلئے ضروری ہے کہ اسلحہ اور ساز و سامان کی صنعت ریاست ہی کے اندر ہو۔ اس لئے جنگی صنعت کا جہاد سے گہرا اور مضبوط تعلق ہوتا ہے۔

اس غرض سے کہ ریاست اپنے معاملات میں خود مختار ہو اور دوسرے ممالک کے اثرات سے محفوظ رہے، یہ لازمی ہے کہ ریاست خود ہی اِن اسلحہ کو تیار بھی کرے اور اُن میں ترقی اور جدّت کر کے اُنہیں زیادہ فعال بنائے، تاکہ وہ ہمیشہ خود کفیل اور آزاد رہے، اور ہمیشہ اُس کے پاس جدید ترین اور سب سے طاقتور ہتھیار دستیاب رہیں، خواہ اُن میں کتنی بھی ترقی اور جدّت آتی رہے، اور ہر کھلا دشمن یا ممکنہ دشمن خوفزدہ رہے، جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الخَيلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ آخَرِينَ من دُونِهِم لَا تَعْلَمُونَهُم اللهُ يَعْلَمُهُمْ﴾

اور جو بھی تم سے ہو سکے ان کیلئے طاقت اور بندھے گھوڑے تیار رکھو تاکہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں اور انکے علاوہ اور دوسروں پر بھی اپنی ہیبت قائم کر سکو جنہیں تم نہیں جانتے، اللہ ان کو جانتا ہے۔ (ترجمہ معانیٔ قرآنِ کریم: انفال: آیت ۶۰)

اسی طرح یہ ریاست اپنی منشاء کی مالک رہ سکتی ہے، کہ خود اپنی ضرورت کا اسلحہ تیار کرے، اس اسلحہ کو زیادہ ترقی دے کر فعال اور مؤثر بنائے جس سے اُسے ہمیشہ بہترین اسلحہ دستیاب ہوتا کہ کھلے ہوئے یا ممکنہ دشمن خوفزدہ رہیں۔ اس لئے لازمی ہے کہ ریاست ایسا اسلحہ اور مواد خود بنائے، اور دوسرے ممالک سے اسلحہ کی خرید پر منحصر نہ رہے کیونکہ ایسا کرنے سے دوسرے ممالک اسلامی ریاست کے اسلحہ، اسکے قتال، جنگ اور یہاں تک کہ اُس کے ارادے پر حاوی ہو جائینگے۔

اسلحہ بیچنے والے ممالک خریدنے والے ملک کو ہر اسلحہ، خاص طور پر جدید اور مؤثر اسلحہ نہیں بیچتے، اور جو بیچتے بھی ہیں تو اُس پر اپنی شرطیں لگاتے ہیں، جن میں اِن اسلحہ کے استعمال کی شرائط شامل ہوتی ہیں۔ نیز ایسے ممالک صرف اتنی ہی مقدار فراہم کرتے ہیں جتنی وہ مناسب سمجھیں، نہ کہ خریدنے والے ملک کی ضرورت کی مناسبت سے۔ اس طرح اسلحہ بیچنے والے ممالک کو خریدنے والے ملک پر اثر ورسوخ حاصل ہو جاتا ہے جس سے وہ اسلحہ خریدنے والے ملک پر اپنی مرضی تھوپ سکتا ہے، خاص طور پر جب کہ ایک ملک حالتِ جنگ میں ہتھیار خرید رہا ہو جس وقت کہ اسے ساز وسامان اور پُرزوں کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی ضرورت کے وقت اسلحہ خریدنے والا ملک بیچنے والے ملک پر منحصر اور زیادہ جھکنے پر مجبور ہوگا، اُسکی اِس کمزوری کے سبب ہتھیار بیچنے والے ممالک اُس پر زیادہ سے زیادہ کنٹرول کرنے کی پوزیشن میں ہونگے اور خریدنے والے ملک کو اُن کے مرہونِ منّت ہونا پڑیگا اور اُس کی جنگ بھی متاثر ہوگی۔

اِن تمام وجوہات کی بناء پر یہ لازمی ہوتا ہے کہ ریاست اپنے لئے اسلحہ خود ہی بنائے، نیز جنگی مشینیں اور اُن کے لئے ضروری اضافی پُرزے (Spare Parts) بھی تیار کرے۔ ریاست کیلئے یہ سب اُسی وقت ممکن ہے جب کہ وہ اپنی صنعت ثقیلہ (Heavy Industry) بنائے جس میں جنگی اور دیگر اشیاء تیار ہوتی ہوں۔ اُس کے پاس ایٹمی ہتھیار سازی کیلئے صنعت ہو، ہوائی جہاز بنائے جاسکیں، میزائیل کی صنعت ہو، مصنوعی سیاروں (Satellites) کیلئے مناسب صنعتی سہولیات میسر ہوں، بکتر بند گاڑیوں (Armoured Vehicles/Tanks) کی صنعت کاری ہو، جنگی جہاز سازی ہو اور ہمہ قسم کے ثقیل و خفیف اسلحہ سازی کے کارخانے (Heavy & Light Weapons Factories) ہوں۔ ریاست کے پاس اپنے کارخانے ہوں جن میں ہر قسم کے آلات، موٹریں، مواد اور الیکٹرونکس کے منتوجات (Products) بنائے جائیں۔ اسی کے ساتھ عوامی ملکیت سے متعلق اشیاء کیلئے صنعت، اور جنگی ساز وسامان بنانے کے چھوٹے پیمانے کے کارخانے بھی ہوں۔ یہ تمام صنعتیں وہ ہیں جن کا قائم کرنا اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے بموجب مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے:

﴿وَأَعِدُّواْ لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّن قُوَّةٍ﴾

اور جو بھی تم سے ہو سکے ان کیلئے طاقت اور بندھے گھوڑے تیار رکھو (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: انفال: آیت ۶۰)

کیونکہ اسلامی ریاست پیغامِ اسلام کو سارے عالم میں دعوت و جہاد کے ذریعہ پہنچانے کی مکلّف ہے، اس

لئے یہ ریاست دائمی طور پر جہاد کیلئے مستعد رہتی ہے، اسلئے اس کا تقاضا ہے کہ اس ریاست میں ثقیل وخفیف (Heavy & Light) دونوں قسم کی صنعت ہو جیسی کہ اسکی جنگی پالیسی ہے، تاکہ ضرورت کی حالت میں اِن کارخانوں کو جنگی ساز و سامان بنانے کیلئے مخصوص کر لیا جائے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ریاست کی جنگی پالیسی کے بموجب تمام صنعت کاری ریاست ہی میں ہو۔ نیز یہ کہ اسی جنگی پالیسی کے تحت ہی وہ کارخانے بنائے جائیں جن میں ثقیل یا خفیف اشیاء تیار ہوتی ہوں، تاکہ ضرورت پڑنے پر ایسے کارخانوں کو جنگی اشیاء بنانے کیلئے تیار کیا جا سکے۔

فوج

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مسلمانوں کو سارے عالم کیلئے اسلام کے پیغام کی دعوت کی ذمہ داری سونپ کر اُن پر اپنا کرم فرمایا ہے، اور اس پیغام کو پہنچانے کا طریقہ بھی طے کر دیا ہے کہ یہ دعوت و جہاد کے ذریعہ پہنچائی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جہاد کو فرض کر دیا ہے اس لئے جنگی تربیت مسلمانوں پر لازم قرار پاتی ہے۔

لہٰذا ہر مسلمان پر جو پندرہ سال کی عمر کو پہنچے، جہاد کی تیاری کیلئے جنگی تربیت (Military Training) فرض ہوتی ہے، البتہ فوجی سپاہی بننا فرض علی الکفایہ ہے۔

اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ:

﴿وَ قٰتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَ يَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ﴾

انسے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ ہی کیلئے ہو جائے (ترجمہ معانی قرآن کریم انفال: آیت ۳۹)

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا:

((جَاهِدوا المُشْرِكِينَ بِاموالِكُم و أنفُسِكُم وَ السِنَتِكُم))

اور اپنے مالوں، اپنی جانوں اور اپنی زبان کے ذریعہ مشرکوں سے جہاد کرو۔ (روایت ابوداؤد: راوی حضرت انسؓ)

اور آج کے دور میں قتال کیلئے لازمی ہے کہ اُس کیلئے خاص جنگی تربیت حاصل کی جائے تاکہ شریعت کے مطابق دشمن پر غلبہ حاصل ہو اور ملک فتح ہوں۔ اس لئے جنگی تربیت جو جہاد کیلئے لازمی ہے مسلمانوں پر فرض قرار پاتی ہے کیونکہ شریعت کا قاعدہ ہے کہ "جس چیز کے بغیر کوئی فرض مکمل نہ ہوتا ہو، تو وہ چیز بھی فرض ہو جاتی ہے"۔ نیز یہ کہ جنگی تربیت قتال کے تقاضوں میں سے ہے اور یہ قتال اللہ کے حکم کے مصداق عام ہے: ﴿وَ قٰتِلُوهُمْ﴾ یہ حکم عام ہے، پھر وہ عمل بھی جو اس قتال کو کرنے کیلئے لازمی اور ضروری ہو وہ بھی کرنے کا حکم ہے:

﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّن قُوَّةٍ﴾

اور جو بھی تم سے ہو سکے ان کیلئے طاقت اور بندھے گھوڑے تیار رکھو (ترجمہ معانی قرآن کریم: انفال: آیت ۶۰)

لہٰذا جنگ کی تربیت اور اعلیٰ جنگی مہارت بھی طاقت کی تیاری کا حصہ ہوئیں، کیونکہ ان کے بغیر جہاد ممکن نہیں۔ لہٰذا یہ تربیت طاقت کا ایسا ہی حصہ ہے جس طرح کہ جنگی مشقیں اور جنگی مہمات اس کا حصہ ہیں۔ رہی بات تجنید یعنی فوج میں داخلہ کی (Military Conscription)، تو یہ لوگوں کو دائمی طور پر ہتھیاروں سے مسلح کرنے کی ہے جس سے کہ مجاہدین عملی طور پر جہاد کیلئے تیار رہیں جو کہ جہاد کا تقاضا ہے۔ کیونکہ جہاد ایک ایسا فرض ہے جو ہمیشہ کیلئے ہے خواہ دشمن نے حملہ کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ لہٰذا تجنید جہاد ہی کے حکم میں شامل فرض ہے۔

فوج کی اقسام:

فوج دو قسم کی ہوتی ہے: پہلی قسم احتیاطی فوج(Reserve Force)، جو کہ مسلمانوں میں سے ہر اُس شخص پر مشتمل ہے جو ہتھیار اُٹھا سکتا ہو؛ اور دوسری قسم باقاعدہ اور مستقل سپاہیوں(Regular Force) کی ہے جو ریاست کے ملازمین کی طرح تنخواہ دار ہوں۔

فوج کی یہ اقسام جہاد کی فرضیت ہی سے ماخوذ ہیں، کیونکہ ہر مسلمان پر جہاد فرض ہے، نیز جہاد کیلئے تیار ہونا اور تربیت حاصل کرنا بھی فرض ہے، لہٰذا ہر مسلمان اسلامی ریاست کا احتیاطی سپاہی ہوتا ہے، کیونکہ اُن پر جہاد فرض ہے۔ فوج کی دوسری قسم جو کہ مستقل قسم ہے، اُس کے ہونے کی دلیل شریعت کے اس قاعدے سے ماخوذ ہے کہ: ''جس چیز کے بغیر کوئی فرض مکمل نہ ہوتا ہو، تو وہ چیز بھی فرض ہو جاتی ہے''(ما لا یتم الواجب الا بہٖ فھو واجب)۔ کیونکہ ایک مستقل اور باقاعدہ فوج کے بغیر جہاد جاری نہیں رکھا جا سکتا اور نہ ہی مسلمانوں کی کفار سے حفاظت وحمایت کی جا سکتی ہے اسی لئے خلیفہ پر یہ فرض ہے کہ ایک باقاعدہ اور دائمی نوعیت کی فوج رکھے۔

باقاعدہ اور مستقل فوجی سپاہیوں کا حکومت کے ملازمین کی طرح تنخواہ دار ہونا، ایسا ایک غیر مسلم کیلئے تو ایک واضح اور فطری بات ہے، کیونکہ اُس سے جہاد کا مطالبہ نہیں ہے لیکن اگر وہ جہاد کرے تو اسے اسکی اجرت دینا حدیث سے ثابت ہے۔ ترمذی شریف میں الزہری کی روایت ہے کہ:

((أن النبي ﷺ أسهم لقوم من اليهود قاتلوا معه))

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن یہودیوں کو(مالی) مدد دی جو آپ ﷺ کے ساتھ قتال میں شامل تھے۔

اسی طرح ابن ہشام کی روایت ہے:

((أن صفوان بن اميه خرج مع النبي ﷺ إلى حنين وهو على شركه، فأعطاه مع المؤلفة قلوبهم من غنائم حنين))

صفوان ابن امیہ اُس وقت آپ ﷺ کے ساتھ غزوہ حنین گیا جب کہ وہ مشرک تھا، اور آپ ﷺ نے اسے حنین کے مالِ غنیمت میں سے تالیف قلب کیلئے کچھ مال عطا کیا۔

اسی طرح سیرت ابن ہشام میں ہے:

((كان فينا رجلٌ أتيٌّ (أي غريب) لا يدرى ممن هو، يقال له قزمان، و كان رسول الله صلى الله عليه و سلم يقول إذا ذكر له:إنَّه لَمِن أهلِ النَّار، قال:فلما كان يوم أحد قاتل قتالاً شديداً فقتل وحده ثمانية أو سبعة من المشركين.....))

ہمارے درمیان ایک اجنبی شخص تھا، جسے کوئی نہیں جانتا تھا، اسے 'قزمان' کہتے تھے، جب اُس کا ذکر ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک وہ دوزخ والوں میں سے ہے۔ جنگ احد کے دن وہ اتنی شدت سے لڑا کہ اُس اکیلے نے ہی سات یا آٹھ مشرکوں کو قتل کر دیا۔

یہ روایتیں ایک کافر کے اسلامی فوج میں ہونے کی، اور اس لئے اسے تنخواہ دینے کی دلیل ہیں۔ پھر یہ کہ 'اجرت' کی تعریف کہ وہ کچھ عوض کے بدلے، کسی فائدے کیلئے، ایک معاہدہ ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ کسی کی خدمات کیلئے ایک شخص کو اجرت دی جائے، اور اس میں ایسا سپاہی بھی شامل ہے۔ یہاں اجرت دینے والے کیلئے نفع یا فائدہ قتال ہے۔ اس دلیل کے عام ہونے سے ایک کافر سپاہی کا قتال میں شریک ہونے کیلئے اجرت دینا ثابت ہوتا ہے۔ یہ تو معاملہ ہوا ایک غیر مسلم کا، رہی بات مسلم کی، تو اسی دلیل کے عام ہونے میں ایک مسلم بھی شامل ہے گو کہ جہاد اُسکے لئے ایک عبادت ہے، اور اجرت لینے والے کیلئے نفع بھی۔ بخاری شریف میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے:

((إنَّ أحق ما أخذتم عليه أجراً كتاب الله))

سب سے زیادہ بہتر وہ اجرت ہے جو تم نے اللہ تعالیٰ کی کتاب (سکھانے) کیلئے لی۔

(روایت بخاری شریف: روای حضرت عبداللہ ابن عباسؓ)

اللہ کی کتاب کی تعلیم دینا عبادت ہے، تو جیسے ایک مسلمان کا قران کی تعلیم کیلئے اجرت لینا جائز ہے، امامت واذان کیلئے، اجرت لینا جبکہ وہ عبادات ہیں، جائز ہے؛ اسی طرح جہاد کے لئے سپاہی بنا کر اسے اجرت پر رکھنا بھی جائز ہے۔ مزید یہ کہ ایک مسلمان کا جہاد کیلئے اجرت لینا، جبکہ جہاد اُس پر فرض ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے صراحتاً ثابت ہے:

((للغازي أجره و للجاعل أجره و أجر الغازي))

غازی کیلئے اجر ہے اور جاعل (وہ شخص جو کسی اور کو اپنی طرف سے یا اپنے علاوہ جہاد میں اجرت دے کر بھیجے) کیلئے اپنا اجر اور (مزید) غازی کا اجر ہے۔ (روایت ابوداؤد: راوی حضرت عبداللہ ابن عمروؓ)

قاموس المحیط میں 'جاعل' کے عمل یعنی 'جعالت' کی تعریف یہ بیان کی ہے کہ 'جعالت' وہ مال ہے جو کسی شخص کو کسی کام کے عوض دیا جائے۔ 'اجر' کا اطلاق اُس مالی نفع سے بھی ہے جو کہ 'اجرت' ہے اور اُس ثواب سے بھی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ اجر کے معنے اُس ثواب کے ہیں جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے بندے کو اُس کے صالح عمل پر عنایت فرمائے، اور 'اجارۃ' اس عمل کا نفع ہے جو ایک شخص دوسرے کیلئے انجام دے یعنی 'اجیر' کیلئے۔ دراصل اس طرح دونوں چیزوں میں تفریق کرنے کی کوئی سند یا دلیل نہیں ہے حالانکہ یہی تفریق معروف ہے۔ البتہ لغت جس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ 'اجر' کسی کام کا عوض ہے۔ یہی قاموس المحیط میں ہے۔ اس طرح اس حدیث کے معنے یہ ہوئے کہ غازی کیلئے اپنا ثواب ہے اور جاعل (یعنی وہ شخص

جو کسی اور کو اپنے عوض جہاد پر بھیجے) کیلئے اپنا ثواب اور اس پر اضافی اُتنا ثواب جتنا غازی کا ہے۔ یہاں لفظ 'غازی' اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ لفظ 'اجر' سے مراد ثواب ہے اور لفظ 'جاعل' سے بھی یہی اشارہ ملتا ہے کیونکہ یہ دونوں الفاظ اشارہ (قرینہ) ہیں جن سے مقصود اجر ہے۔ یہ بات اس حدیث سے واضح ہو جاتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مثل الذين يغزو من امتي و يا خذونَ الجُعل، و يتقوون على عدعهم مثل ام موسى ترضع ولدها و تاخذ أجرها))

میرے امتیوں میں سے جو جہاد کرتے ہیں اور اجرت (بھی) لیتے ہیں، اور خود کو دشمن کیلئے قوی بناتے ہیں، ان کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کی طرح ہے جو اپنے ہی بیٹے کو دودھ بھی پلا دیتی تھیں اور اسکی اجرت بھی اُنہیں مل جاتی تھی۔ (روایت: بیہقی: راوی جبیر ابن نفیرؓ)

یہاں 'اجر' سے مراد 'اجرت' ہے۔ مزید یہ کہ جہاد صرف اُن ہی لوگوں تک محدود نہیں ہے جو رضا کار (Volunteer) ہوں، لہٰذا اُنہیں اجرت دے کر رکھنا جائز ہے۔

مسلح افواج ایک قوت ہیں اور اُنہیں میں سے مخصوص گروہ منظّم کیا جاتا ہے جس کی مخصوص تربیت ہوتی ہے، یہ مخصوص گروہ شرطہ یا 'پولیس' کہلاتی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے مسلح قوات ترتیب دیں، جو کہ فوج تھی، اور اس میں مخصوص چن کر اُن کے ذمہ وہ کام کئے جو پولیس کے ہیں۔ آپ ﷺ نے فوج تیار کی، اس کی قیادت کی اور فوج کے امیر مقرر فرمائے۔ بخاری شریف میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ:

((أن قيس ابن سعد رضی اللہ عنہ كان يكون بين يَدَي النبي ﷺ بمنزلةِ صاحب الشُرَطِ من الأمير))

قیس بن سعد رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے ساتھ اس طرح رہتے تھے جیسے ایک امیر کے ساتھ شرطہ (پولیس) رہتا ہے۔

یہاں حضرت قیس سے مراد حضرت قیس بن سعد بن عبادہ الخزرجی الانصاری ہیں۔ اسی طرح ترمذی شریف میں روایت ہے کہ:

((كان قيس بن سعد رضی اللہ عنہ من النبی ﷺ بمنزلة صاحب الشرطة من الأميرِ قال الأنصاری: يعنی مما يلي من اموره))

قیس بن سعد رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے ساتھ اس طرح رہتے تھے جیسے ایک امیر کے ساتھ شرطہ (پولیس) رہتا ہے۔ الانصاری کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ امیر کے معاملات سنبھالا کرتے تھے۔

ابن حبان نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ مشرکین کے آپ ﷺ کے گھر میں داخل ہونے سے احتراز کیلئے تھا۔ مزید یہ کہ شرطہ (پولیس) فوج سے مقدم ہوتی ہے۔ الأزہری کہتے ہیں:

شرطة كل شيء خياره، و منه الشرط لأنهم نُخبة الجند، و قيل هم أول طائفة تتقدم الجيش و قيل سموا شرطاً لأن لهم علامات يعرفون بها في اللباس و الهيئة۔

کسی بھی چیز کا شرطہ ہونا اُس کا بہترین جزو ہونا ہے۔ فوج کا شرطہ ہونا اس کے مترادف ہے کہ شرطہ فوج کے چنندہ اور بہترین (سپاہی) ہیں۔ وہ پہلا فرقہ (Battalion) ہوتا ہے جو فوج سے آگے ہوتا ہے۔ اُنہیں شرطہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص لباس اور ہیئت سے پہنچانے جاتے ہیں۔

یہی معنے علامہ اصمعی نے اختیار کئے ہیں۔ یہ سب اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ شرطہ دراصل فوج ہی کا حصہ ہیں اور یہ کہ خلیفہ ہی اُن کا امیر مقرر کرتا ہے جس طرح کہ وہ فوج کا امیر مقرر کرتا ہے۔ البتہ خلیفہ کو اس بات کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ یہ طے کرے کہ شرطہ فوج کا حصہ رہے یا اس کی علیحدہ اور مستقل حیثیت ہو۔ حدیث سے جو مفہوم نکلتا ہے وہ یہ کہ امیر شرطہ اس لئے مقرر کیا جاتا ہے کہ امام یا حاکم کو جو کچھ پیش آئے وہ اُس کی مدافعت کرے اور اس کے حکم کی تعمیل کرے اور اس کی کسی بھی درپیش خطرے سے حفاظت کرے۔ لغت میں شرطہ فوج کا وہ فرقہ ہے جو فوج سے آگے ہو اور اس کی مخصوص علامت ہو۔ ظاہر ہے کہ جو شرطہ فوج سے متقدم ہو اور اُن کا چنندہ ہو، وہ بے شک فوج ہی کا حصہ ہے۔ لیکن وہ شرطہ جو حاکم کے ساتھ ہو، اُس کی نسبت دلیل نہیں ہے کہ وہ فوج ہی کا حصہ ہو، کیونکہ اس کا کام حاکم کے ساتھ رہنا ہے، البتہ یہ دلیل موجود ہے کہ وہ ریاست کی مسلح قوات (Armed Forces) کا حصہ ہوتا ہے، لہٰذا خلیفہ پر منحصر ہے کہ وہ اُنہیں فوج کا حصہ بنائے یا اُن کی علیحدہ حیثیت ہو۔ بہرحال کیونکہ تمام مسلح قوات، خلیفہ کی جانب سے تقرری اور اُس سے احکام حاصل کرنے کے حوالے سے، ایک ہی ہیئت سے رہے ہیں، لہٰذا اُنہیں منقسم کرنا، اس حالت میں کمزور کرسکتا ہے کہ اُنہیں ایک ہی ذخیرۂ اسلحہ سے رسد حاصل کرنا ہے۔ پھر شرطہ ہمیشہ حاکم کے عام احکام کی تعمیل میں رہتا ہے، لہٰذا ان دونوں کی تقسیم نہ ہو کر ایک ہی رہنا بہتر ہوگا، کیونکہ دونوں ایک ہی ذخیرۂ اسلحہ و ساز و سامان سے اپنی رسد حاصل کرسکیں گے اور دونوں ایک ہی نظام میں منظم ہو کر جہاد کی استعداد میں رہینگے۔ لہٰذا تمام مسلح قوات ایک ہی وحدت (Unit) ہوں جن میں سے شرطہ کیلئے کچھ وحدات منتخب کی جائیں جو پولیس کی ذمہ داریاں ادا کریں، پھر ایک متعین مدت کے بعد یہ پولیس وحدات، عام فوج میں واپس چلی جائیں اور اُن کی جگہ دوسری وحدات پولیس کیلئے منتخب کر کے اُن سے شرطہ کا کام لیا جائے۔ اس طرح فوج ہمیشہ جہاد کے کام کیلئے مستعد رہیگی۔

نظام اور قانون کا تحفظ اور داخلی امن کو قائم رکھنا یہ زحاکم کے تنفیذی امور کو نافذ کرنا پولیس کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ حضرت انسؓ سے مروی حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے قیس ابن سعدؓ کو اپنے شرطہ کا امیر مقرر کیا تھا اور وہ آپ ﷺ کے

ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ امیر شرطہ، حاکم کے ساتھ رہے اور جو بھی امر واقع ہو جو تنفیذ طلب ہو تو اسکو نافذ کرے تاکہ شریعت نافذ ہو، نظام کا تحفظ ہو اور امن قائم رہے۔ ساتھ ہی راتوں کو گشت کرے جس سے چوروں اور فسادی لوگوں کو روکا جا سکے۔ حضرت ابو بکرؓ کے دورِ خلافت میں گشت کی ذمہ داری حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی تھی، اور حضرت عمر بن الخطابؓ خود ہی یہ کام انجام دیا کرتے تھے جس میں اُن کے ساتھ کبھی اُن کا ملازم یا بعض اوقات حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ ہوتے تھے۔ لہٰذا یہ جو طریقہ بعض اسلامی ممالک میں رائج ہوا ہے کہ لوگ راتوں کو اپنے گھروں کی پہرے داری کیلئے پہرے دار رکھتے ہیں، یا حکومت اُن کے پہرے کا انتظام کرتی ہے اور اس کے مصارف اُن لوگوں سے وصول کرتی ہے، یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ دراصل یہ حکومت کا فرض اور پولیس کی ذمہ داری ہے۔

ریاستِ اسلامی کی مسلح قوات ایک متحدہ وحدت (Single Entity) ہے، جس کے متعدد لشکر، دستے، ٹکڑیاں اور پلٹنیں ہو سکتی ہیں۔ اِن اقسام کی شناخت کیلئے یا تو ہندسوں کا (نمبر) استعمال ہو سکتا ہے یا اُنہیں ریاست کی مختلف ولایات یا اضلاع کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے، جیسے جیش الشام، جیش مصر، جیش صنعاء وغیرہ۔

اسلامی فوج خاص خیموں (Camps) میں رکھی جاتی ہے، ہر کیمپ میں کچھ فوجی ہوتے ہیں، جو ایک پلٹن کے یا ایک سے زیادہ پلٹنوں پر مشتمل ہو سکتے ہیں۔ ایسے لشکر ریاست کی مختلف ولایات میں رکھے جا سکتے ہیں اور بعض فوجی اڈوں پر تعینات کئے جاتے ہیں۔ بعض لشکر ہمیشہ حرکت میں رہتے ہیں یعنی ایک مقام سے دوسرے مقام پر پڑاؤ ڈالتے رہتے ہیں، جس سے یہ لشکر ہمیشہ لڑائی کیلئے مستعد رہیں۔ ہر لشکر کا مخصوص نام ہوتا ہے مثلاً لشکر حبانیہ اور ہر لشکر کا مخصوص پرچم ہوتا ہے۔

فوج کی یہ ترتیب اور نظم اور اُن کے نام ولایات کے نام یا نمبر مقرر کرنا خلیفہ کے اجتہاد و صوابدید کا معاملہ ہوتا ہے، لیکن بہر حال اس نظم و ترتیب میں ریاست کی قوت اور اس سے ریاست کی حمایت مقصود رہتی ہے، مثلاً کسی لشکر کو کسی ولایت یا مختلف ولایات میں یا کسی اور جنگی اہمیت اور مصلحت کے مقام پر تعینات کرنا جو ریاست کے مفاد میں ہو۔

حضرت عمر بن الخطابؓ نے فوج کو ولایات پر منقسم کیا تھا، مثلاً فلسطین کی ٹکڑی، موصول (عراق) کی ٹکڑی اور وہ ایک لشکر ریاست کے صدر مقام پر اور ایک اپنے پاس رکھتے تھے جو ہمیشہ مستعد رہتا تھا کہ بس ایک اشارہ پا کر چل پڑے۔

فوج کے پرچم اور نشان:

فوج کیلئے پرچم اور نشان (Banners) دئے جاتے ہیں۔ فوج کا پرچم خلیفہ فوج کے قائد کو دیتا ہے جبکہ نشان فوجی سربراہ دیتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کی حدیث اسی طرف دلالت کرتی ہے، ابن ماجہ میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ:

((أن راية رسول اللهﷺ كانت سوداء، و لواؤه أبيض))

رسول اللہ ﷺ کے پرچم سیاہ رنگ کے ہوتے تھے اور نشان (Banners) سفید رنگ کے۔

ترمذی میں البراء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ ان سے رسول اللہ ﷺ کے پرچم کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:

((كانت سوداء مربعة من النمرة))

سیاہ، چوکھٹا (Square) نمرہ کا بنا ہوا۔

نمرہ ایک بہت موٹا اونی کپڑا ہوتا ہے، قاموس المحیط میں بھی یہی تعریف آتی ہے کہ یہ موٹا اونی کپڑا ہوتا ہے جسے عرب کے بدو استعمال کرتے ہیں۔ حضور ﷺ کا پرچم جس کا نام العقاب ہے وہ سیاہ رنگ کے اون سے بنا ہوتا تھا۔ حارث ابن حسان البکریؓ سے مسند احمد اور ابن ماجہ کی روایت ہے کہ:

((قدمنا المدينة فإذا رسول الله ﷺ على المنبر، و بلال قائم بين يديه متقلد السيف بين يدي الرسول ﷺ و إذا رايات سُودٌ، فسألت لا هذه الريات؟ فقالوا: عمرو بن العاص قَدِمَ من الغَزاة۔))

جب ہم مدینہ پہنچے تو حضور ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی تلوار لئے آپ ﷺ کے سامنے کھڑے تھے، ہم نے دریافت کیا کہ یہ کیسے پرچم ہیں تو لوگوں نے بتایا کہ حضرت عمرو بن العاص لڑائی سے لوٹے ہیں۔

ترمذی شریف میں روایت ان الفاظ سے نقل کی گئی ہے:

((قدمت المدينة فدخلت المسجد فإذا هو غاصٌ بالناس و إذارايات سُود تخفق و إذا بلال متقلد السيف بين يدي رسول الله ﷺ قلت ما شأن الناس؟ قالوا: يريد أن يبعث عمرو بن العاص وجهاً))

میں مدینہ پہنچا تو مسجد میں داخل ہوا جہاں بھیڑ ہو رہی تھی اور سیاہ جھنڈے ہَوا میں لہرا رہے تھے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے سامنے تھے اُن کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ میں نے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ تو لوگوں نے بتایا کہ حضور ﷺ حضرت عمرو بن العاص کو (کسی مہم پر بھیج) رہے ہیں۔

اسی طرح ابن ماجہ میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ:

((أن النبيَ ﷺ دخل مكة يوم الفتح و لواؤه ابيض))

جب حضور ﷺ فتح مکہ کے دن مکہ میں داخل ہوئے تو اُن کے بینر (Banner) سفید رنگ کے تھے۔

نسائی میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ:

((أن ابن ام مكتوم كانت معه راية سوداء في بعض مشاهد النبي ﷺ))

ابن ام مکتوم کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے بعض غزوات میں سیاہ پرچم ہوتے تھے۔

نسائی میں حضرت انسؓ سے ایک اور روایت ہے کہ:

((أنّه حين أمّر أسامه بن زيد على الجيش ليغزو الروم لواء ه بيده))

جب حضور ﷺ نے حضرت اسامہ ابن زید کو رومیوں سے مقابلے کیلئے روانہ فرمایا تو اپنا سیاہ نشان (Hand strip) اُن کے ہاتھ پر باندھا۔

نشان (Banner) پرچم سے مختلف ہوتے ہیں، ابوبکر ابن عربی کا قول ہے کہ جھنڈا تیر کے سرے پر باندھا جاتا ہے اور وہ ہوا میں لہراتا ہے جبکہ نشان یعنی بینر تیر سے باندھ کر لپیٹ دیا جاتا ہے۔ ترمذی نے بھی دونوں میں فرق کیا ہے اور بینر کے سلسلے میں حضرت جابرؓ کی روایت کردہ حدیث نقل کی ہے جبکہ جھنڈے کیلئے البراؓ سے روایت نقل کی ہے، یہ دونوں احادیث اوپر گزر چکی ہیں۔ جھنڈا جنگ کے دوران استعمال ہوا کرتا تھا جیسا کہ معرکہ مؤتہ کے سلسلے میں حدیث ہے:

((قتل زيد فأخذ الراية جعفر))

جب (حضرت) زیدؓ شہید ہو گئے تو (حضرت) جعفرؓ نے پرچم اُٹھالیا۔

جبکہ جھنڈا فوج کے خیمہ پر نصب کیا جاتا ہے اور وہ اسکی علامت ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت اسامہ ابن زید کو شام بھیجے جانے والی حدیث میں مذکور ہے:

((أنه صلى الله عليه و سلم عقد لواء ه بيده))

آپ ﷺ نے اپنا نشان اُن (حضرت اسامہؓ) کے ہاتھ پر باندھا۔

یعنی جب آپ ﷺ نے حضرت اسامہ ابن زید رضی اللہ عنہ کو فوج کا امیر مقرر کیا تھا۔ جھنڈے اور بینر کا فرق یہ ہے کہ بینر تیر کے سرے سے باندھا جاتا ہے اور لپیٹ دیا جاتا ہے اسی کو علَم بھی کہتے ہیں، یہ جھنڈے سے بڑا ہوتا ہے۔ یہ بینر یا 'لواء' فوج کے قائد کے مقام کی علامت ہوتا ہے اور اُسی کے ساتھ رہتا ہے۔ جھنڈا لواء سے چھوٹا ہوتا ہے اور تیر سے بندھنے کے بعد ہوا میں لہراتا رہتا ہے، یہ جنگ میں قائد کے سپرد رہتا ہے، اسے 'ام الحرب' کہتے ہیں اور یہ عموماً ایک ہی ہوتا ہے، جبکہ فوج کی ٹکڑیوں اور پلٹنوں کے اپنے الگ مخصوص جھنڈے ہوتے ہیں۔

سیاہ جھنڈے پر سفید رنگ سے کلمہ توحید 'لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ' لکھا ہوتا ہے، جبکہ سفید لواء پر سیاہ رنگ سے کلمہ توحید عبارت ہوتا ہے۔

اسلام کی تاریخ میں پہلا لواء، حضرت عبداللہ ابن جحش کا تھا، اور جھنڈا حضرت سعد بن مالک الازدي کا تھا جس پر سفید ہلال بنا ہوا تھا۔ ان تفصیلات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فوج کے لئے جھنڈے اور لواء کا ہونا لازمی ہے اور یہ کہ خلیفہ ہی جسے

فوج کا قائد یا امیر مقرر کرے اسے یہ لواء دیتا ہے، جبکہ جھنڈے خلیفہ یا فوج کا امیر و قائد دیتا ہے۔ خلیفہ کے لواء دینے کی دلیل بخاری اور مسلم شریف میں حضرت سلمہ بن الاکوعؓ سے روایت کی گئی حدیث سے ملتی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لأعطيّن الراية أو ليأخذنّ بالراية غداً رجلٌ يحبه الله و رسوله أو قال يحبّ الله و رسوله يفتح الله عليه فإذا نحن بعليّ وما نرجوه. فقالوا:هذا عليّ. فأعطاه رسول اللهؐ الراية ففتح الله عليه))

کل میں پرچم ایک آدمی کو دونگا، یا کل جو آدمی جھنڈا لے گا، اس سے اللہ اور اللہ کا رسول ﷺ محبت رکھتے ہیں؛ یا یہ فرمایا کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے محبت رکھتا ہے، اور اللہ اسے فتحیاب کریگا۔ پھر حضرت علیؓ آ گئے جب کہ ہمیں اُن کے آنے کی توقع نہیں تھی، لوگوں نے کہا یہ علیؓ آئے، رسول اللہ نے انہیں جھنڈا سونپا اور اللہ نے انہیں فتح بخشی۔

رہی بات جھنڈوں کے فوجی کمانڈروں کے ذریعہ دئے جانے کی، تو یہ مفہوم حضرت حارث بن حسان البکریؓ والی روایت سے ماخوذ ہے جس میں یہ الفاظ ہیں: ((و إذا رايات سود))یعنی، اور جب کئی سیاہ جھنڈے تھے۔ اس سے واضح ہوا کہ فوج کا ایک امیر (حضرت عمرو بن العاص) ہونے کے باوجود کئی جھنڈے ہو سکتے ہیں، خواہ لڑائی پر جاتے وقت یا لڑائی سے آتے وقت، بالفاظ دیگر ایک فوج میں مختلف ٹکڑیوں یا پلٹنوں اور بریگیڈ کے علیحدہ جھنڈے ہو سکتے ہیں۔ جب کہ یہ دلیل نہیں ملتی کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ جھنڈے دئے ہوں، لہٰذا یہی بات واضح ہوتی ہے کہ ایسے جھنڈے فوج کے قائد یا امیر مختلف ٹکڑیوں اور پلٹنوں کو دیتے ہیں۔ بہر حال خلیفہ کے لئے یہ امر مباح ہے کہ وہ یہ جھنڈے دینے کی ذمہ داری فوجی قائد کے سپرد کرے اور یہی تنظیمی نقطۂ نظر سے اولیٰ ہے۔

خلیفہ ہی فوج کا قائد اعلیٰ (Supreme Commander) ہوتا ہے:

خلیفہ ہی فوج کا قائد اعلیٰ رہتا ہے اور مختلف فوجی پلٹنوں اور بریگیڈ کیلئے کمانڈر مقرر کرتا ہے۔ فوج کی باقی تقرری فوج کے امیر یا قائد اپنی پلٹنوں اور بریگیڈ میں کرتے ہیں۔ فوجی قیادت میں تقرری کیلئے کسی شخص کی فوجی تربیت معیار ہوتی ہے اور یہ تقرری رئیس الارکان (Chief of Staff) کرتا ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ خلافت سارے عالم کے مسلمانوں کی عام امارت ہے جس سے شریعت کے احکام و قوانین نافذ و جاری ہوتے ہیں، اور سارے عالم میں ان احکامات و قوانین (دین) کی دعوت عام کی جاتی ہے۔ جہاد اس دعوت کے پہنچانے کا ذریعہ ہے لہٰذا یہ ناگزیر ہوا کہ خلیفہ ہی جہاد کی قیادت کرے، کیونکہ خلافت کے عقد ہی کی رو سے وہ اس بات کا پابند ہے، چنانچہ خلیفہ کے علاوہ یہ قیادت کسی اور کیلئے جائز نہیں ہے اور اسی طرح جہاد سے متعلق امور بھی خلیفہ ہی کیلئے خاص ہیں، حالانکہ جہاد تمام مسلمانوں پر عائد ہے اور وہ اسے انجام دیتے ہیں، لیکن جہاد میں شرکت کرنا ایک بات ہے اور جہاد کے

امور طے کرنا دوسری بات۔ جہاد تمام مسلمانوں پر فرض ہے لیکن جہاد کے معاملات طے کرنا صرف خلیفہ کا اختیار و ذمہ داری ہے۔ البتہ خلیفہ کیلئے یہ جائز ہے کہ وہ اس کام کیلئے کسی کو اپنا نائب مقرر کرے جو یہ کام خلیفہ کو مطلع رکھ کر اس کی نگرانی میں انجام دے، لیکن یہ جائز نہیں کہ اس کام کو سراسر خود مختاری دے دی جائے کہ کوئی شخص بغیر خلیفہ کو اطلاع دئے اور بغیر اس کی نگرانی کے انجام دے۔ یہاں کسی کو نائب مقرر کرنا ایسا نہیں ہے جیسا خلیفہ کے معاون کے سلسلے میں گزرا، بلکہ یہاں خلیفہ کو اطلاع دینے سے مراد، خلیفہ ہی کی نگرانی اور قیادت میں انجام دہی کے ہیں۔ فوج کی قیادت اسی تعریف میں آتی ہے، کہ فوج خلیفہ کی نگرانی میں رہتی ہے، اس لئے یہ جائز ہے کہ فوج کے کسی کمانڈر کو یہ اختیار دیا جائے جو خلیفہ کی مرضی سے ہوگا۔ لیکن یہ جائز نہیں کہ یہ کام خلیفہ کی قیادت و نگرانی کے بغیر انجام پائے اور خلیفہ محض برائے نام رہ جائے، کیونکہ خلافت کا بار خلیفہ پر شخصی طور سے ہوتا ہے۔ غیر اسلامی نظاموں میں جو یہ شکل ہوتی ہے کہ ریاست کا صدر فوج کا قائد اعلیٰ ہوتا ہے لیکن فوج کے کمانڈر فوجی کمان اپنی صوابدید پر سنبھالتے ہیں، یہ شکل اسلام میں باطل اور شریعت کے خلاف ہے۔ البتہ فنی اور اداری معاملات کیلئے خلیفہ کو یہ حق ہے کہ وہ کسی کو یہ اختیار دے جیسے کہ وہ والیوں کو دیتا ہے کہ ایسے مقرر کردہ افراد ان فنی اور اداری امور کی بغیر خلیفہ کی نگرانی کے بھی نگہداشت کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود بنفس نفیس فوج کی قیادتِ اعلیٰ سنبھالتے تھے، جنگ میں فوجوں کی کمان انہیںؐ کے ہاتھ میں رہتی تھی، اور جن ٹکڑیوں اور پلٹنوں کو آپ ﷺ قتال پر بھیجا کرتے، تو اُن کے امیر آپؐ خود ہی مقرر فرماتے تھے، چاہے ان مہمات پر آپ ﷺ بذاتِ خود نہ بھی تشریف لے گئے ہوں۔ بعض اوقات تو آپ ﷺ بغرضِ احتیاط ایک امیر کے قتل ہو جانے کی صورت میں پہلے سے ہی دوسرے امیر کو بھی نامزد کر دیا کرتے تھے جیسا کہ مؤتہ کے معرکہ میں ہوا۔ بخاری شریف میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت نقل کی ہے:

((أمَّرَ رَسُول الله صلى الله عليه و سلم فى غزوة مؤتة زيد بن حارثة رضی اللہ عنہ۔ فقال رسول اللهؐ إن قتل زيدٌ فَجَعفر، فإن قتل جعفر فعبدالله ابن رواحة))

غزوہ مؤتہ میں حضور ﷺ نے حضرت زید ابن حارثہ کو لشکر کا امیر مقرر کیا اور فرمایا کہ اگر زید رضی اللہ عنہ قتل کر دئے جائیں تو جعفر رضی اللہ عنہ امیر ہونگے اور اگر جعفر بھی قتل کر دئے جائیں تو پھر عبداللہ ابن رواحہ رضی اللہ عنہ امیر ہونگے۔

اس سے ثابت ہوا کہ خلیفہ ہی فوج کے کمانڈر مقرر کرتا ہے اور وہی فوج کے مختلف بریگیڈ کے امیر بھی مقرر کرتا ہے، انہیں جھنڈے سونپتا ہے اور پلٹنوں کے قائد مقرر کرتا ہے۔ جو فوج ملک شام بھیجی گئی تھی جیسے لواءِ مؤتہ یا لواءِ اسامہ، تو یہ دراصل لواء (بریگیڈ) ہی تھے، اسکی دلیل یہ ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت اسامہ کے ہاتھ پر اُس موقع پر لواء (نشان) باندھا تھا، یا جیسے حضرت سعد ابن ابی وقاص کا فرقہ (ٹکڑی) جسے مکہ کی جانب بھیجا گیا تھا، یا اور ٹکڑیاں جو جزیرہ نمائے عرب میں بھیجی جاتی تھیں دراصل فِرق (ٹکڑیاں) ہی تھیں۔ اس سے یہ دلیل ملتی ہے کہ خلیفہ ہی فوجی بریگیڈ کے قائد اور ٹکڑیوں کے امیر مقرر کرتا ہے۔ اس سے

اشارہ ملتا ہے کہ حضور ﷺ اپنی فوج کے نقیبوں (Captains) اور عریفوں (Corporal/ Sergeant) سے غزوات کے دوران مستقل طور پر رابطہ میں رہتے تھے اور انہیں سے فوجیوں کے احوال معلوم کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے فوج کے امیروں اور مہمات کے قائدوں کے سوا کسی اور کی تقرری کی ہو، جس سے اس کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ آپ ﷺ باقی لوگوں کی تقرری کا معاملہ فوج کے امراء پر چھوڑ دیا کرتے تھے۔ رہی بات رئیس ارکان (Chief of Staff) کی تو وہ فوج کے فنی (Technical) امور کا ذمہ دار ہوتا ہے اور فوج کے قائد کی طرح اس کی تقرری بھی خلیفہ ہی کرتا ہے، لیکن رئیس ارکان، خلیفہ کی قیادت میں رہتے ہوئے اپنی ذمہ داریاں انجام دیتا ہے، گو کہ اس کے لئے اِن تکنیکی معاملات سے خلیفہ کو باخبر رکھنا ضروری نہیں۔

فوج کی تربیت عسکری اور اسلامی ہوتی ہے:

یہ امر ضروری ہے کہ فوج کو اعلیٰ سطح کی تربیت دی جائے، جہاں تک ممکن ہو، اُن کی فکری سطح کو بلند کیا جائے اور مسلح افواج کے ہر شخص کی اسلامی ثقافتی تربیت (Training) کی جائے جس سے ہر فوجی کا اسلامی شعور و ادراک، وسیع معنوں میں نشوونما پائے۔

عسکری تعلیم و تربیت ہر فوج کی نہایت اہم ضرورت ہوتی ہے اور اس کے بغیر نہ کوئی جنگ لڑی جاسکتی ہے اور نہ کوئی معرکہ انجام دیا جاسکتا ہے، چنانچہ شرعی قاعدہ ہے کہ جس چیز کے بغیر کوئی واجب پورا نہ ہوتا ہو، تو وہ چیز بھی واجب ہو جاتی ہے، لہٰذا ایسی تربیت حاصل کرنا واجب ہے۔ رہی بات اسلامی افکار و تصورات کی تعلیم و تربیت کی، تو یہ اُس حد تک ہر شخص پر فرض ہے، جہاں تک اُسے اپنے اعمال و افعال کی انجام دہی کیلئے درکار ہو، اسکے ماسوا، یہ فرض علی الکفایہ ہیں۔ بخاری و مسلم شریف میں معاویہ ابن ابی سفیان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا:

((مَن يُرِد الله به خيراً يُفَقهه في الدين))

اللہ تعالیٰ جس کیلئے خیر چاہتا ہے، اُسے دین کا فہم عطا کر دیتا ہے۔

پھر یہ کہ اسلامی مسلح افواج وہ ہیں جو سارے عالم میں اسلام کے پیغام کو پہنچانے کی غرض سے ممالک فتح کرتی ہیں، یہ دعوت کو پہنچانے کا فریضہ گو کہ ہر مسلمان پر ہے لیکن افواج پر یہ ذمہ داری زیادہ ہے۔ یہاں افواج کی فکری سطح کو بلند کرنے سے مراد اُن میں دین کا صحیح فہم و ادراک پیدا کرنا ہے تاکہ اُن میں زندگی کے معاملات کی صحیح اسلامی سوچ آجائے، حضور ﷺ کا قول ہے:

((رُبَّ مُبَلَّغ أوعَى مِن سَامع))

ممکن ہے کہ جس کو بات پہنچائی جائے وہ پہنچانے والے سے بہتر حق ادا کرے۔

یعنی یہاں اہمیت و زور شعور و ادراک پر ہے۔ اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قول ہے:

﴿لِّقَومٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾

جو غور و فکر کریں (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: یونس: آیت ۲۴)

اور یہ قول:

﴿لَهُمْ قُلُوبٌ لاَ يَفْقَهُونَ بِهَا﴾

ان کے پاس دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: الاعراف: آیت ۱۷۹)

یہاں تمام زور فکر پر ہے۔

یہ ضروری ہے کہ ہر لشکر میں ایسے فوجیوں کی کافی تعداد ہو جن میں اعلیٰ عسکری مہارت اور جنہیں جنگی منصوبہ بندی (Planning) کا تجربہ ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے ارکان کی تعداد جس قدر زیادہ سے زیادہ ممکن ہو، ان لشکروں کو مہیا کرائی جائے۔

یہ چیز بھی اُسی شرعی قاعدے سے ماخوذ ہے کہ جس چیز کے بغیر کوئی واجب پورا نہ ہوتا ہو، تو وہ چیز بھی واجب ہو جاتی ہے، ایسی تربیت حاصل کرنا لازم ہے۔ لہٰذا یہ عسکری تعلیم نظریاتی طور پر ایک فوجی میں جذب ہونا چاہئے اور عملی طور پر اسکی مسلسل تربیت اور پھر اُس تربیت کا استعمال بھی ہونا چاہئے ورنہ یہ تعلیم ایک فوجی کو وہ تجربہ نہیں دے سکتی جو جنگ لڑنے اور اُس کی منصوبہ بندی (Planning) کرنے کیلئے لازمی ہے۔ اسی لئے اعلیٰ فوجی تعلیم فرض ہوئی۔ اسی طرح اس تعلیم کا مسلسل حاصل کرتے رہنا اور تربیت کا متواتر چلتے رہنا فرض ہے، تاکہ فوج جہاد کیلئے تیار اور ہر لمحہ لڑائی کیلئے مستعد رہے۔ چونکہ فوج مختلف لشکروں میں مقیم ہوتی ہے اور ہر لشکر کو ہمیشہ اس بات کے لئے تیار رہنا ہوتا ہے کہ فوراً لڑائی پر جا سکے، اسی لئے یہ لازمی ہوگا کہ ہر لشکر میں فوجیوں کی کافی تعداد رہے۔ یہ بات اُسی شرعی قائدے کا عملی پہلو ہے کہ جس چیز کے بغیر کوئی واجب پورا نہ ہوتا ہو، تو وہ چیز بھی واجب ہو جاتی ہے، ایسی تربیت حاصل کرنا واجب ہے۔

اسی طرح افواج کیلئے اسلحہ، مشینیں، ساز و سامان اور دیگر ضروریات مہیا کرانا واجب ہوگا جس سے کہ یہ افواج اپنی ذمہ داریوں کو بحیثیت اسلامی فوج ہونے کے ادا کر سکیں۔

یہ بات اللہ تعالیٰ کے قول سے ماخوذ ہے:

﴿وَ أَعِدُّواْ لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِن قُوَّةٍ وَ مِنْ رِّبَاطِ الخَيلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ ءَاخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لاَ تَعْلَمُونَهُمُ اللهُ يَعْلَمُهُمْ﴾

اور جو بھی تم سے ہو سکے ان کیلئے طاقت اور بندھے گھوڑے تیار رکھو تا کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں اور ان کے علاوہ اور دوسروں پر بھی اپنی ہیبت قائم کر سکو جنہیں تم نہیں جانتے، اللہ ان کو جانتا ہے۔

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: انفال: آیت ۶۰)

لہٰذا جہاد اور قتال کیلئے استعداد پیدا کرنا فرض ہے۔ یہ لازمی ہے کہ جہاد و قتال کیلئے کی جانے والی تیاری کھلی ہوئی

بھی ہو جس سے کہ دشمن اور شہریوں میں چھپے ہوئے منافقین خوفزدہ رہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے لفظ ﴿تُرْهِبُونَ﴾ فرمایا ہے جس کے معنی خوفزدہ کرنے کے ہیں۔ اس آیت میں جہاد وقتال کی تیاری کیلئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے علّت بھی بتادی ہے، لہٰذا یہ تیاری اُس وقت تک تکمیل کو نہیں پہنچتی جب تک کہ اس تیاری میں یہ علت پوری نہ ہو جائے جس کیلئے اس تیاری کو فرض کیا گیا ہے، یعنی دشمن ومنافقین خوفزدہ رہیں۔ یہاں سے فوج کیلئے اسلحہ، مشینیں اور ساز وسامان فراہم کئے جانے کی فرضیت ثابت ہوتی ہے تاکہ اس سے دشمن خوفزدہ ہوں۔ اس کیلئے یہ بات اولیٰ ہے کہ مسلح افواج اپنی ذمہ داریوں کو نباہنے یعنی دعوت اسلام کو پھیلانے کی پوری صلاحیت وقدرت رکھتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے جب ہمیں مخاطب کر کے جہاد وقتال کی تیاری رکھنے کا حکم دیا، تو اس میں اس تیاری کی علت ظاہر کر دی، کہ یہ کھلے اور چھپے دشمن دونوں کو خوفزدہ اور مرعوب رکھنے کی غرض سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ أَعِدُّواْ لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِن قُوَّةٍ وَ مِنْ رِّبَاطِ الخَيلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ ءَاخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لاَ تَعْلَمُونَهُمُ اللهُ يَعْلَمُهُمْ﴾

اور جو بھی تم سے ہو سکے ان کیلئے طاقت اور بندھے گھوڑے تیار رکھو تا کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں اور ان کے علاوہ اور دوسروں پر بھی اپنی ہیبت قائم کر سکو جنہیں تم نہیں جانتے، اللہ ان کو جانتا ہے۔

(ترجمہ معانی قرآن کریم: انفال: آیت ۶۰)

یہ نہایت ضروری ہے کہ اس آیت پر باریکی سے غور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے جہاد وقتال کی اس تیاری کو محض قتال کی غرض سے نہیں بتایا، بلکہ دشمن کو مرعوب وخوفزدہ کرنے کی منشاء رکھی، یہ بات زیادہ گہری اور وسیع ہے، کیونکہ دشمن کو جب مسلمانوں کی قوت کا علم ہوگا تو وہ اُن پر حملہ کرنے اور اُن کا مقابلہ کرنے سے باز رہیگا، اور یہ جنگ جیتنے کی بہترین حکمتِ عملی ہے۔

ریاستِ اسلامی دائمی طور پر جہاد کیلئے مستعد رہتی ہے:

اسلامی ریاست دائمی طور پر جہاد کیلئے مستعد رہتی ہے اور تمام امتِ مسلمہ اس بات کو محسوس کرتی ہے کہ اسکے اور دوسری قوموں اور ملکوں کے درمیان کبھی بھی جنگ چھڑ سکتی ہے۔ لہٰذا ریاست اسلامی کا پورا کا پورا فوجی ڈھانچہ، خواہ وہ عسکری ہو، یا صنعتی، دوسرے بڑے ممالک سے اعلیٰ وارفع ہونا چاہئے۔ صنعتی اور عسکری اعتبار سے جو بھی تغیرات ہوتے رہیں، وہ تمام اس فوج میں بدرجۂ اتم رونما ہوں، مالی اعتبار سے یہ مستحکم ہو اور ہمیشہ جہاد کیلئے تیار رہے۔

ریاستِ اسلامی فی الحقیقت ایسی ریاست ہے جو اسلامی عقیدے پر مبنی ہے اور اسلامی احکام کو نافذ وجاری کرتی ہے جو اُس سے یہ تقاضا کرتے ہیں کہ ان احکامات کی داخلی طور پر پوری طرح تطبیق ہونے کے بعد یہ ریاست اسلام کے پیغام کو سارے عالم میں پہنچائے۔ لہٰذا یہ ریاست اِس اعتبار سے سارے عالم کی ذمہ دار ہے کہ اس دعوت کی دنیا کے دور دراز علاقوں تک تبلیغ کرے، کیونکہ اسلام کا پیغام عالمی ہے، جو سارے بنی نوع انسان کیلئے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَاسِ بَشِيرًا وَ نَذِيرًا﴾

ہم نے تو تمہیں سارے ہی انسانوں کو جمع کرنے والا، بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ سبا: آیت ۲۸)

اور فرمایا:

﴿وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلا رَحْمَةً لِّلعَالَمِينَ﴾

ہم نے سارے جہان پر بس رحمت کی وجہ سے تمہیں بھیجا ہے۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: انبیاء: آیت ۱۰۷)

اور فرمایا:

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَاسُ إِنِّى رَسُولُ اللهِ إِلَيكُمْ جَمِيعًا﴾

کہو، اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ الاعراف: آیت ۱۵۸)

اس کے علاوہ بخاری اور مسلم شریف میں حضرت جابر ابن عبداللہؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا قول روایت ہے:

﴿..... و كان النبى يُبْعَثُ إلى قومه خاصة،وبعثت إلى الناس عامة﴾

نبی خاص اپنی قوم کیلئے بھیجے جاتے تھے، (لیکن) میں تمام لوگوں کیلئے بھیجا گیا ہوں۔

لہٰذا یہ لازمی ہوا کہ ریاستِ اسلامی اس دعوت کو سارے عالم میں پہنچائے۔ اسلام نے دعوت کو پہنچانے کا ذریعہ جہاد رکھا ہے اور کفار و منافقین سے قتال کا سبب کفر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قَاتِلُوا الذينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَ لَا بِاليَوْمِ الأَخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللهُ وَ رَسُولُهُ وَ لَا يَدِينُونَ دِينَ الحَقِّ مِنَ الذِينَ أُوتُوا الكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ﴾

وہ اہل کتاب جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ روزِ آخر پر اور نہ اللہ اور اس کے رسول کے حرام ٹھیرائے ہوئے کو حرام قرار دیتے ہیں اور نہ دین حق کی پیروی کرتے ہیں، ان سے لڑو یہاں تک کہ وہ اقتدار سے دست بردار ہو کر اور چھوٹے (ماتحت) بن کر جزیہ دینے لگیں۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن سورۂ توبہ: آیت ۲۹)

اور فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا النَبِىُّ جَاهِدِ الكُفَّارَ وَ المُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾

اے نبی ﷺ، کفار اور منافقین سے جہاد کرو، اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ؛ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ توبہ: آیت: ۷۳)

اور فرمایا:

﴿وَ قَاتِلُواْ أَوْلِيَآ ءَ الشَّيَاطِينِ﴾

پس تم شیطان کے ساتھیوں سے لڑو (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ نساء: آیت ۷۶)

اور فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الذينَ ءَ امَنُواْ قَاتِلُواْ الذينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الكُفَّارِ﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ان کافروں سے لڑو جو تمہارے قریب ہیں، (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ توبہ: آیت:۱۲۳)

اور فرمایا:

﴿وَ قَاتِلُواْ المُشْرِكِينَ﴾

اور مشرکین سے جنگ کرو (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ توبہ: آیت:۳۶)

اسی طرح اسلام نے قرآن اور حدیث کی نص سے جہاد کو فرض قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ القِتَالُ﴾

تم پر جنگ فرض ہوئی (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ البقرہ: آیت ۲۱۶)

اور فرمایا:

﴿انفروا خِفَافًا وَ ثِقَالاً وَ جَاهِدُواْ بِأَمْوَالِكُمْ وَ أَنْفُسِكُمْ﴾

ہلکے اور بوجھل نکل پڑو! اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرو (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ توبہ: آیت ۴۱)

اور فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الذينَ ءَ امَنُواْ قَاتِلُواْ الذينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الكُفَّارِ﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ان کافروں سے لڑو جو تمہارے قریب ہیں، (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ توبہ: آیت:۱۲۳)

اور فرمایا:

﴿إِلاَّ تَنْفِرُواْ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا﴾

اگر تم نہ نکلو گے، تو وہ تمہیں دردناک عذاب دے گا۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ توبہ: آیت:۳۹)

سنن ابوداؤد میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا:

((جاهدوا المشركين بأموالكم و أنفسكم و ألسنتكم))

مشرکوں سے جہاد کرو، اپنے مال سے، اپنی جانوں سے اور اپنی زبان سے۔

لہٰذا ریاست اسلامی دائمی طور پر حالتِ جہاد میں رہیگی حتیٰ کہ اسلام ساری دنیا میں عام ہو جائے۔ بخاری و

مسلم شریف میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا:

((أمرت أن أقاتل الناس حتى يشهدوا أن لا إله إلا الله و أن محمداً رسول الله، و يقيموا الصلاة، و يؤتوا الزكٰوة، فإذا فعلو عصموا مني دماء هم و أموالهم إلا بحق الإسلام و حسابهم على الله۔))

مجھے حکم ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑوں جب تک کہ وہ اس بات کی شہادت نہ دے دیں کہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، اگر وہ ایسا کریں تو ان کا خون اور اُن کا مال میرے لئے حرام ہوگا، سوائے اس کے کہ اسلام میں اسکی اجازت ہو، اور اُن کا حساب اللہ پر ہوگا۔

اسی طرح سنن ابوداؤد میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا:

((.....والجهاد ماض منذ بعثني الله إلى أن يقاتل آخر أمتي الدجال لا يبطله جور جائر ولا عدل عادل))

جب سے اللہ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے، تب سے جہاد مسلسل اور متواتر ہے اور اُس وقت تک رہیگا جب تک میرا آخری امتی دجّال سے قتال کرے، اسے نہ تو ظالم کا ظلم ختم کرسکتا ہے اور نہ عادل کا عدل۔

یہی بات اللہ تعالیٰ کے قول میں آتی ہے:

﴿وَ قَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَ يَكُونَ الدِينُ كُلُّهُ لِلهِ﴾

تم ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہ جائے اور دین اللہ کیلئے ہوجائے (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ البقرہ :آیت ۱۹۳)

اور فرمایا:

﴿وَ قَاتِلُواْ الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً﴾

اور مشرکین سے جنگ کرو تم سب کے سب جس طرح وہ سب کے سب تم سے جنگ کرتے ہیں

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ توبہ: آیت ۳۶)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست قائم کرنے کے بعد اپنی ساری زندگی جہاد میں گزاری، یہاں تک کہ نزاع کی حالت میں بھی آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مطالبہ کیا کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی فوج کو بلا تاخیر روانہ کریں جسے آپ ﷺ نے رومیوں سے لڑائی کیلئے خود تیار کیا تھا۔ البتہ یہ وضاحت ضروری ہے کہ جہاد و قتال اُس وقت تک نہیں ہوسکتا، جب تک کہ کفار تک اسلام کی دعوت کو پہنچا نہ دیا جائے، اور اُن سے دین میں داخل ہونے کا کہہ نہ دیا جائے، پھر اگر وہ نہ آئیں، تو اُن سے صرف ریاستِ اسلامی کے تابع ہونے اور جزیہ دینے کیلئے کہا جائیگا۔ اب بھی اگر وہ اسلام

میں آنے، جزیہ دینے یا اسلامی ریاست کے تابع ہونے سے منع کریں تو ایسی حالت میں قتال کیا جائیگا۔ مسلم شریف میں سلیمان ابن بریدہؓ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں:

((كان رسول اللهؐ إذا أمَّر أميراً على جيش،أو سريَّة أوصاه في خاصته بتقوى الله، و من معه من المسلمين خيراً ثم قال:اغزوا باسم الله،في سبيل الله قاتلوا مَن كفر بالله، اغزوا ولا تَغُلّوا، ولا تغدُروا ولا تُمثلوا،ولا تقتلوا وليداً و إذا لقيت عدوك مِن المشركين فادعهم إلى ثلاث خصال،أوخِلال،فأيتهنَّ ما أجابوك فاقبل منهم،و كفّ عنهم ثم ادعُهُم إلى الإسلام،فإن أجابوكَ فاقبل منهم،و كف عنهم..... إلى أن قال: فإن هُم أبَوْا فسلهم الجزية، فإن أجابوك فاقبل منهم، وكفّ عنهم،فإن هم أبَوْا فاستعن بالله و قاتلهم.....))

جب بھی کبھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کسی فوج یا مہم کیلئے کسی کو امیر مقرر فرماتے، تو اُسے اللہ سے تقویٰ اختیار کرنے کی اور اپنے ساتھ مسلمانوں سے اچھائی کی تلقین کرتے، پھر فرماتے کہ اللہ کے راستہ میں اللہ کے نام سے اُن لوگوں سے لڑو جو اللہ کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔ حملہ کرو، لیکن سخت کلامی یا گالی مت دو، دھوکہ مت دو، جسم کا عضو مت کاٹو، نومولود کو نہ مارو۔ اور جب تمہارا دشمنوں سے یعنی مشرکین سے سامنا ہو تو اُنہیں تین باتوں کی طرف بلاؤ یا اُن میں سے ایک کی طرف؛ پھر اگر وہ مان لیں، تو اسے قبول کرلو اور اُن سے لڑائی مت کرو: (پہلے) اُنہیں اسلام کی دعوت دو، اگر وہ قبول کرلیں تو مان لو اور اُن سے نہ لڑو..... یہاں تک کہ پھر فرمایا: اگر وہ یہ بات نہ مانیں، تو اُن سے جزیہ کا مطالبہ کرو، اگر وہ تسلیم کر لیں، تو تم قبول کرلو اور اُن سے مت لڑو، اگر وہ (یہ بھی) قبول نہ کریں، تو اللہ سے مدد و نصرت طلب کرو اور ان سے لڑو۔

لہٰذا یہ لازم ہے کہ قتال سے پہلے اسلام کی طرف دعوت مقدم ہو، اور پھر ریاستِ اسلامی کی تابع داری کی دعوت اور جزیہ ادا کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔ اس کے بعد قتال تو تیسرا مرحلہ ہے۔

ان اسباب سے اسلامی ریاست دائمی جہاد کی حالت میں رہتی ہے اور امتِ مسلمہ اس بات کا احساس رکھتی ہے کہ وہ سارے عالم کو اسلام کی دعوت دینے پر مکلّف ہے، کفار سے اُن کے کفر کے سبب قتال کی پابند ہے اور اس قتال پر اس وقت تک مکلّف ہے جب تک کہ کفّار لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ نہ کہہ دیں، یا تابعدار ہو کر جزیہ نہ دیں۔ امتِ مسلمہ یہ احساس بھی رکھتی ہے کہ کفر اور کفّار دونوں اسلام کے اور امتِ مسلمہ کے دشمن ہیں، اور اسلام اور مسلمانوں سے شدید نفرت رکھتے ہیں، اور مسلمانوں کو مارنے کا کوئی بھی موقع نہیں گنواتے۔ اس احساس کے سبب امتِ مسلمہ کو یہ شعور رہتا ہے کہ اسکے اور دوسری کفر قوموں کے درمیان جنگ کبھی بھی ہو سکتی ہے، کیونکہ دعوت کی ذمہ داری اور کفّار کی اسلام اور امتِ مسلمہ سے دشمنی ہمیشہ جنگ کی متقاضی ہوتی ہیں۔

چونکہ ریاستِ اسلامی ہمیشہ جہاد کیلئے مستعد رہتی ہے اور امتِ مسلمہ اس بات کا ادراک رکھتی ہے کہ دوسرے ممالک سے جنگ کسی بھی وقت ہوسکتی ہے، چنانچہ یہ لازم ہے کہ ریاست اور امتِ مسلمہ دونوں ہمیشہ مستعد رہیں اور جنگ کی زندگی جئیں جیسی زندگی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے گزاری اور آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے گزاری۔ اس کا تقاضا ہے کہ ریاستِ اسلامی کے تمام ادارے اور وسائل خواہ وعسکری ہوں یا صنعتی، وہ تمام دوسرے ممالک سے برتر واعلیٰ ہونا چاہئے۔ اس میں سائینسی علوم کے متعدد ادارے ہونا چاہئے جہاں سے لاکھوں کی تعداد میں انجینئر، موجدین، کاریگر اور ٹکنولوجی کے ماہرین فارغ ہوکر نکلیں اور ریاست ہمیشہ ترقی اور عروج پر ہوتا کہ وہ اس قدر جہادی استعداد جمع کر پائے جو کھلے اور چھپے دشمن کو مرعوب اور خوفزدہ رکھنے کیلئے ضروری ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

﴿وَ أَعِدُّواْ لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِن قُوَّةٍ وَ مِنْ رِّبَاطِ الخَيلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ ءَاخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لاَ تَعْلَمُونَهُمُ اللهُ يَعْلَمُهُمْ﴾

اور جو بھی تم سے ہو سکے ان کیلئے طاقت اور بندھے گھوڑے تیار رکھو تا کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں اور ان کے علاوہ اور دوسروں پر بھی اپنی ہیبت قائم کر سکو جنہیں تم نہیں جانتے، اللہ ان کو جانتا ہے۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم انفال: آیت ۶۰)

ان مقاصد کا تقاضا ہے کہ امتِ مسلمہ جنگی حالات کے اقتصاد کے اعتبار سے زندگی گزاریں جس سے وہ ایسی برتر مالی استطاعت کی حالت کو پہنچیں، جہاں اس قدر اموال میسّر ہوں جتنا ایک ایسی ریاست کو درکار ہے جو بہترین اسلحہ سازی اور ترقی یافتہ صنعت کے ذریعہ دنیا بھر کی سب سے متقدم اور ترقی یافتہ ریاست بننا چاہتی ہو۔

والی

والی وہ شخص ہوتا ہے جسے خلیفہ ریاست کی کسی ولایت کا حاکم وامیر مقرر کرے۔

ریاستِ اسلامی اپنی ریاست کو مختلف وحدات (Units) میں منقسم کرتی ہے اور ہر حصہ ایک ولایت کہلاتا ہے۔اسی طرح ہر ولایت مزید حصوں میں منقسم ہوتی ہے اور ہر ایک حصہ عمالہ کہلاتی ہے۔وہ شخص جو کسی ولایت پر حاکم و امیر متعین کیا جاتا ہے 'والی' کہلاتا ہے اور وہ شخص جو کسی عمالہ پر متعین ہوتا ہے عامل وحاکم ہوتا ہے۔

لہٰذا والی حاکم ہوتے ہیں اور ولایت حکم یا حکومت؛ قاموس المحیط میں ولایت کے معنے اقتدار وسلطان (بمعنی حکم) بتائے جبکہ وِلایت کے واؤ کے تحت زیر ہو۔ولایت کیلئے ضروری ہے کہ خلیفہ یا خلیفہ کا نائب اسے مقرر کرے،اس کے بغیر والی نہیں ہوسکتا۔ولایت وامارت یا والی کی اصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے، کہ آپ ﷺ نے ولایات کے والیوں کا تقرر کیا جو اپنے علاقے پر حاکم ہوتے تھے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت معاذ ابن جبلؓ کو الجَند (یمن)، زیاد ابن لبیدؓ کو حضرموت (یمن) اور حضرت ابوموسیٰ الأشعریؓ کو زَبید اور عدن کا والی مقرر فرمایا تھا۔

والی خلیفہ کا نائب ہوتا ہے اور وہ کام انجام دیتا ہے جن پر اُسے نائب مقرر کیا گیا ہو۔شریعت میں ولایت کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، پس خلیفہ والی کو حکومت کے جن معاملات یا امور پر متعین کرے، وہ شخص ان امور میں والی ہوگا۔اس کا دارومدار تعین کیلئے کئے گئے الفاظ پر منحصر ہوتا ہے۔البتہ کسی کی ولایت والی کو اُس علاقہ تک محدود رکھتی ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کو والی مقرر فرماتے تو اُسے علاقہ خاص تک محدود کرتے تھے۔

ولایت کی دو اقسام ہوتی ہیں: ولایتِ عام اور ولایتِ خاص۔ولایت میں کسی ولایت یا صوبے کے حکومت سے متعلق تمام امور شامل ہوتے ہیں۔اس کا تقرر (Appointment) اس طرح ہوتا ہے کہ خلیفہ کسی کو پورے صوبے یا اقلیم کا، اس کے تمام افراد کا اور ان کے تمام امور پر نگرانی کیلئے مقرر کرے۔لہٰذا والیٔ عام کی نگہداشت (Supervision)، وہاں کے تمام امور پر ہوتی ہے۔جبکہ ولایتِ خاص میں والی کے کام تقسیم ہوجاتے ہیں لہٰذا والیٔ خاص، اُس علاقہ میں، مثلاً فوجوں کے انتظام، عوام کی دیکھ بھال، علاقہ کی حفاظت، عورتوں کی حفاظت میں سے کسی پر محدود ہوتا ہے۔والیٔ خاص وہاں کی قضاء یا خراج وصدقات کے امور میں دخل اندازی نہیں کرتا۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عام اور خاص دونوں قسم کے والی مقرر فرمائے تھے؛ مثلاً عمرو بن الحزمؓ کو یمن کا والی عام اور حضرت علی ابن ابی طالب کو یمن میں ایک مخصوص معاملہ (یعنی قضاء) کا والی مقرر فرمایا تھا۔آپ ﷺ کے بعد خلفاء اسی طرز پر قائم رہے اور ان دونوں اقسام کے والی مقرر کئے گئے، مثلاً حضرت عمرؓ نے معاویہ ابن ابی سفیان کو والی عام مقرر کیا اور حضرت علیؓ نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کو بصرہ کا والی خاص مقرر کیا جس میں مالی امور شامل نہیں تھے، پھر حضرت زیادؓ کو وہاں کے مالی امور پر والیٔ خاص مقرر کیا۔

قرون اولیٰ میں ولایت کی دو قسمیں رہی ہیں؛ ولایت الصلاۃ اور ولایت خراج۔ چنانچہ تاریخ کی کتابوں میں والیوں کی ان دونوں طرح سے تعبیر کی گئی ہے؛ پہلی امارت علی الصلاۃ اور دوسری امارت الصلاۃ والخراج، یعنی والی یا تو صلاۃ وخراج کا والی ہوگا، یا صرف صلاۃ کا۔ یہاں والیٔ صلاۃ سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ صرف لوگوں کی نماز میں امامت کرے، بلکہ والیٔ صلاۃ وہ ہوتا ہے جو سوائے مالیاتی امور کے، ہر چیز پر والی ہو۔ اس پہلو سے صلاۃ سے یہاں مراد حکومت کے ہر معاملے سے ہے سوائے اموال یا محصول کی وصولی کے۔ لہٰذا جب ان دونوں کو جمع کر دیا جائے تو وہ شخص والیٔ صلاۃ وخراج یعنی والیٔ عام ہوتا ہے اور اگر صرف والیٔ صلاۃ یا صرف والیٔ خراج ہو تو وہ والیٔ خاص ہوتا ہے۔ بہر حال یہ انتظامی امور ہیں جو خلیفہ کی صوابدید پر منحصر ہوتے ہیں کہ وہ کسی کو والیٔ خراج مقرر کرے، یا کسی کو صرف امور قضاء تک محدود کرے یا کسی کو امورِ مالیات، قضاء یا عسکری معاملات کے سوا دیگر معاملات تک، جیسا خلیفہ ریاست یا ولایت کے انتظامی معاملات کی مصلحت سمجھے مقرر کرے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شریعت نے والی کیلئے نہ تو کام متعین کئے ہیں اور نہ یہ پابندی رکھی ہے کہ وہ تمام امور پر ہی مقرر کیا جائے، محض یہ طے ہے کہ اس کا کام حکومت ہے اور وہ خلیفہ کا نائب ہے اور یہ تحدید کی ہے کہ وہ کسی علاقہ خاص پر مقرر کیا جائے، یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل تھا۔ البتہ شریعت نے خلیفہ کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ کسی کو والیٔ عام یا والیٔ خاص جیسی اس کی مصلحت ہو مقرر کرے اور یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ لہٰذا سیرت ابن ہشام میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فروۃ بن مُسَیک کو قبائل مراد، زبید اور مذحج پر مقرر فرمایا تھا اور ساتھ میں خالد بن سعید بن العاص کو اُن قبائل پر صدقات کا والی مقرر کیا تھا۔ اسی کتاب میں ہے کہ آپ ﷺ نے زیاد بن لبید الانصاری کو حضرموت کے صدقات پر اور حضرت علیؓ کو نجران کے صدقات اور جزیہ کی وصولی پر مقرر فرمایا تھا۔ اسی طرح حاکم کی روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ کو یمن کا قاضی مقرر فرمایا تھا۔ استیعاب کی روایت میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے معاذ ابن جبلؓ کو الجند پر مقرر کیا تھا کہ وہ وہاں لوگوں کو قرآن اور اسلام کے احکام سکھائیں، اور ساتھ ہی اُنہیں یمن کے علاقہ میں جو عمال مقرر کئے گئے تھے، اُن سے صدقات وصول کرنے کی ذمہ داری دی تھی۔ سیرت ابن ہشام ہی میں روایت ہے کہ آپ ﷺ نے غزوۂ احد جاتے وقت ابن ام مکتوم کو مدینہ میں صلاۃ پر والی مقرر فرمایا تھا۔

والیوں کا تعیّن اور اُن کی برطرفی:

والیوں اور عمال کا تعین خلیفہ کی جانب سے ہوتا ہے، اگر خلیفہ نے اُنہیں یہ اختیار دیا ہو تو والی بھی عمال کا تعین کر سکتے ہیں۔ معاونین کیلئے جو شرائط ہیں وہی والیوں اور عمال کیلئے بھی ہیں۔ اُن کیلئے یہ لازم ہے کہ وہ مرد ہوں، مسلم، آزاد، بالغ عاقل، عادل ہوں، جو کام اُن کے سپرد کئے جائیں اس کے اہل ہوں، اولیٰ یہ ہے کہ وہ اہل تقویٰ اور اہل اثر میں سے ہوں۔

لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلّم والیوں اور شہروں کے امیروں کا تعین خود ہی فرماتے تھے، کبھی ایک شخص کو مکمل صوبے پر والی مقرر کرتے جیسا کہ عمرو بن حزم کو یمن پر مقرر فرمایا تھا تو کبھی ایک ہی صوبے کے مختلف حصوں پر علیحدہ والی مقرر فرماتے جیسا

کہ حضرت معاذ ابن جبلؓ اور حضرت ابوموسیٰؓ کو یمن کے دو الگ الگ حصوں پر والی مقرر کیا تھا اور اُن سے فرمایا:

((یَسِّرا وَ لَا تُعَسِّرا و بَشِّرَا وَلا تُنَفِّرَا))

آسانیاں پیدا کرو، مشکلیں (پیدا) نہ کرو؛ بشارتیں دو، نہ کہ متنفر کرو۔ (بخاری شریف)

ایک روایت میں یہ لفظ اضافی آیا ہے: (و تطاوعا) یعنی ایک دوسرے سے تعاون کرو۔ رہی بات والی کے عاملین متعین کرنے کے اختیار کی، تو یہ اس پر منحصر ہے کہ خلیفہ والی کا تقرر کرتے وقت اس کو یہ اختیار دے۔ والی کیلئے وہی شرائط کا ہونا جو معاونین کیلئے ہوتی ہیں اس وجہ سے ہے کہ والی بھی معاون کی طرح حکومت میں خلیفہ کا نائب ہوتا ہے۔ والی حاکم ہوتا ہے لہٰذا اُس میں حاکم کی شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، جیسا کہ معاون کیلئے بھی خلیفہ کی شرائط کا ہونا لازمی ہے۔ والی کیلئے مرد ہونا لازمی ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لن یفلح قوم ولّوا أمرهم امراة))

وہ قوم فلاح یاب نہیں ہوسکتی جس کے امور عورت کے سپرد ہوں۔ (راوی ابی بکرۃ؛ بخاری)

یہاں ولایت سے مراد حکومت ہے کیونکہ ولایت کا موضوع 'امرھم' آیا ہے۔ جب اس لفظ کے قرینہ پر ولایت کو دیکھیں تو یہ ولایت حکومت واقتدار سے متعلق ہے۔ پھر والی کیلئے آزاد ہونے کی شرط ہے، کیونکہ ایک غلام خود اپنے اوپر مختار نہیں ہوتا پھر وہ حکومت کس طرح کرسکتا ہے۔ اُس کیلئے مسلم ہونا شرط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَلَنْ يَّجْعَلَ ٱللهُ لِلكَافِرِينَ عَلَى ٱلمومنينَ سَبِيْلاً﴾

اور اللہ کبھی کفار کو اہل ایمان کے مقابلہ میں کوئی راہ نہیں دیگا۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: نساء:۱۴۱)

پھر اس کیلئے عاقل ہونا شرط ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((رُفع القلم عن ثلاثة:عن الصبي حتى يبلغ؛وعن النائم حتى يستيقظ؛ و عن المعتوه حتى يبرأ))

تین قسم کے لوگوں کا محاسبہ نہیں ہوگا: لڑکا، جب تک کہ وہ سن بلوغ کو نہ پہنچے؛ سویا ہوا شخص، جب تک کہ وہ نیند سے نہ جاگ جائے؛ اور مجنون (دیوانہ) جب تک کہ وہ ٹھیک نہ ہوجائے۔ (ابوداؤد)

اسی طرح والی کیلئے عادل ہونا شرط ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک گواہ کیلئے جب عادل ہونے کی شرط مقرر کی ہے تو یہ شرط ایک حاکم و والی کیلئے اور ضروری اور اولیٰ ہوجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الذينَ ءَ امَنُوا إن جَآ ءَ كُم فَاسِقٌ بنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لیکر آئے، تو اس کی تحقیق کرلیا کرو،

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: سورہ حجرات: آیت:۶)

یہاں ایک فاسق کی دی ہوئی خبر پر تحقیق و تصدیق کا حکم ہے، پھر ایک حاکم کی خبر تو بغیر تحقیق کے تسلیم کر لی جاتی ہے، لہٰذا ایسا شخص حاکم ہو نہیں سکتا جس کی بات ماننے کیلئے تحقیق ضروری ہو جبکہ وہ حکم دے۔ والی کیلئے یہ شرط بھی ہے کہ اس میں اُس حکومتی کام کی اہلیت ہو جو اُسے سونپا جا رہا ہے، کیونکہ جب حضرت ابوذرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اُنہیں والی بنائے جانے کی فرمائش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((إني أراك ضعيفاً.....))

میں تمہیں کمزور پاتا ہوں۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((يا أبا ذر إنَّك ضعيف و إنهَا أمانة))

اے ابوذر تم کمزور ہو، اور یہ (ولایت) ایک امانت ہے۔

یہ دونوں روایات مسلم شریف کی ہیں اور راوی خود حضرت ابوذرؓ ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہیں کہ کمزور شخص، یعنی وہ جو اُس کام کے سنبھالنے سے عاجز ہو، اسے والی نہیں بنایا جا سکتا۔

حضور ﷺ اپنے والیوں کو بہتر لوگوں میں سے منتخب فرمایا کرتے تھے، جن میں علم اور تقویٰ ہو۔ آپ ﷺ ولایت کیلئے ایسے اشخاص کو پسند فرماتے جو اپنے کام میں ماہر ہوتے، لوگوں کو ایمان کی طرف راغب کرتے اور اُن کے دلوں میں ریاست کیلئے احترام پیدا کرتے۔ سلیمان ابن بریدہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں:

((كان رسول اللهؐ إذا أَمَّرَ أميراً على جيش أو سرية أوصاه خاصة بتقوى الله، و من معه مِن المسلين خيراً))

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو فوج یا کسی مہم کا امیر مقرر فرماتے، تو اسے اللہ سے تقویٰ اختیار کرنے اور اپنے ساتھی مسلمانوں سے بھلائی کی تلقین فرماتے تھے۔ (مسلم شریف)

والی چونکہ امیر ہوتا ہے، چنانچہ وہ بھی اسی حدیث کے ذیل میں آتا ہے۔

والی کا معزول کیا جانا خلیفہ کی صوابدید پر ہوتا ہے، یا جب اُس ولایت کے لوگ یا اُن کے نمائندے اُس سے اپنی ناراضی اور غصہ ظاہر کریں تو خلیفہ ہی والی کو معزول کر سکتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ ابن جبلؓ کو بغیر کسی سبب کے، یمن کے والی کی حیثیت سے معزول فرمایا تھا اور العلاء بن الحضرمی کو بحرین کے عامل کی حیثیت سے اُس وقت برطرف کر دیا تھا جب عبد قیس کے وفد نے اُن کے خلاف شکایت کی تھی۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ والیوں کو کسی سبب سے اور بغیر کسی سبب کے بھی معزول کر دیا کرتے تھے؛ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے زیاد ابن ابی سفیان کو معزول کیا اور کوئی سبب نہیں

بتایا، حضرت سعد ابن ابی وقاص ؓ کو معزول کیا کیونکہ لوگوں نے شکایت کی تھی اور فرمایا: ((إنی لم أعزله عن عجز ولا عن خیانة)) میں نے انہیں اُن کی کسی کمزوری یعنی نااہلیت یا خیانت کے سبب معزول نہیں کیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خلیفہ کو یہ اختیار ہے کہ وہ کسی والی کو جب چاہے معزول کر سکتا ہے اور یہ کہ اُس ولایت کے لوگوں کی شکایت پر بھی معزول کر سکتا ہے۔

والی کے اختیارات:

والی کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ خلیفہ کا نائب ہونے کی حیثیت سے اپنی ولایت میں حکومت اور وہاں کے مختلف محکمات کی نگرانی کرے۔ اسکے دائرہ کار میں فوج، قضاء اور مالیات کے علاوہ سبھی محکمات اور امور آتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی ولایت کے لوگوں کا امیر ہوتا ہے اور اُن سے متعلق ہر معاملہ پر اس کی نظر ہوتی ہے، البتہ شرطہ یعنی پولیس پر اس کی قیادت انتظامی معاملات پر نہیں بلکہ نفاذ کے تعلق سے ہوتی ہے۔

اس کا یہ سبب ہے کہ والی اپنی ولایت میں خلیفہ کا نائب ہوتا ہے اور اس کے اختیارات خلیفہ ہی کی طرح ہوتے ہیں۔ والی کی ولایت اگر عام ہے تو وہ معاون ہی کی طرح ہوتا ہے، یعنی اپنی ولایت میں اُسے ہر چیز پر نگرانی رکھنا ہوتی ہے۔ اگر والی کی ولایت، ولایتِ خاصہ ہے، تو اس کی نگرانی صرف اُنہیں امور تک محدود ہوتی ہے جن پر اس کا تقرر کیا گیا ہو، اس کے علاوہ دیگر امور اس کے دائرہ اقتدار سے باہر رہتے ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بعض والیوں کو ولایتِ مطلقہ پر متعین فرماتے، یعنی جن کے حکومتی اختیارات غیر محدود ہوں، بعض کو ولایتِ عام دیتے اور بعض کی ولایت کو محدود کر اُسے کسی خاص معاملہ میں والی مقرر فرماتے۔ چنانچہ حضرت معاذ ابن جبلؓ کو یمن کی ولایت دی اور اُنہیں اُن کے کام کے بارے میں سمجھایا۔ چنانچہ بیہقی، مسندِ احمد اور ابوداؤد میں حضرت معاذؓ سے روایت ہے:

((أن رسول الله ﷺ لما بعث معاذاً إلى اليمن،قال له:كيف تقضي إذا عرض لك قضاء،قال:أقضي بكتاب الله،قال: فإن لم تجده في كتاب الله، قال:أقضي بسنة رسول الله،قال:فإن لم تجده في سنة رسول الله، قال:أجتهد برأيي،لا آلو،قال:فضرب بيده في صدري و قال: الحمد لله الذي وفق رسول الله لما يرضي رسول الله.))

جب اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت معاذ ؓ کو یمن کا والی بنا کر بھیجا تو اُن سے دریافت کیا: اگر تمہارے سامنے کوئی معاملہ آئے تو تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ حضرت معاذ ؓ نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ کی کتاب سے، فرمایا کہ اگر اُس میں نہ ملا تو؟ معاذ ؓ نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ کی سنت سے، پھر آپ ﷺ نے پوچھا کہ اگر اس میں بھی نہ ملا تو؟ حضرت معاذؓ نے جواب دیا کہ پھر میں خود اپنی رائے سے اجتہاد کرونگا اور اس میں کوئی کسر نہ چھوڑونگا۔ حضرت معاذؓ

فرماتے ہیں کہ اس پر آپ ﷺ نے اُنکے (حضرت معاذؓ کے) سینے پر اپنا دست مبارک رکھا اور فرمایا: الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی مدد اس بات پر کی جس سے اللہ کا رسول ﷺ خوش ہو۔

اسی طرح جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی ابن ابی طالبؓ کو یمن بھیجا تو کیونکہ آپ ﷺ حضرت علیؓ کے علم اور صلاحیت سے واقف تھے، چنانچہ اُنہیں یہ نصیحت دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ حضرت معاذ ابن جبلؓ کو والی صلاۃ و صدقہ مقرر کیا تھا، اور فروۃ بن مُسَیک کو قبائل مراد، مُذحج اور زبید پر مقرر فرما کر اُن کے ساتھ خالد ابن علی کو صدقات پر مقرر فرمایا تھا۔ اِن تفصیلات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ والی کے اختیارات تمام حکومتی امور پر محیط ہوتے ہیں، جیسا کہ آپ ﷺ نے حضرت معاذ ابن جبلؓ کو سمجھایا اور حضرت علیؓ کیلئے اس کی ضرورت نہیں سمجھی، اسی طرح یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ولایت عام بھی دی یعنی صلاۃ و صدقہ دونوں پر، اور ولایتِ خاص بھی، یعنی یا صرف صلاۃ، یا صرف صدقہ کی ولایت۔

حالانکہ خلیفہ کو یہ اختیار ہے کہ وہ کسی کو والیٔ عام یا والیٔ خاص مقرر کرے، بہرحال معاویہ کی ولایتِ عام ہونے کی وجہ سے شام حضرت عثمانؓ کے دور میں خلیفہ سے خودمختار ہو گیا تھا اور معاویہ پر حضرت عثمانؓ کا اقتدار نہیں رہ گیا تھا، پھر حضرت عثمانؓ کی وفات کے بعد جو فتنہ ابھرا، یہ پورے شام میں ہر امورِ حکومت پر عام ولایت ہونے کے سبب تھا۔ اسی طرح عباسی خلفاء پر ضعف کا دور آیا تو صوبے خودمختار و آزاد ہونے لگے یہاں تک کہ خلیفہ کے اختیار میں کچھ بھی نہ بچا سوائے اس کے کہ اس کے نام پر دعا ہوتی اور سکّے اُس کے نام کے ڈھالے جاتے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ولایتِ عام دینے سے ریاستِ اسلامی کو نقصان پہنچتا ہے، لہٰذا والی کو محدود اختیارات ہی دئے جانے چاہئیں، تاکہ معاملہ خلیفہ سے آزادی تک نہ جائے۔ کیونکہ آزادی و خودمختاری جن چیزوں سے ہو سکتی ہے، وہ ہیں فوج، مالیات اور قضاء (Judiciary)۔ فوج کیونکہ طاقت و قوت ہے، مال سے زندگی کی حرکت ہے اور قضاء سے حقوق کی پاسداری ہوتی ہے اور حدود قائم ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہونا یہ چاہئے کہ والی کو یہ تین امور چھوڑ کر باقی امور پر ولایتِ خاصہ تک محدود رکھا جائے تاکہ اُن خطرات کی پیش بندی ہو سکے۔ بہرحال والی چونکہ حاکم ہوتا ہے اور اُس کے پاس نفاذ کی طاقت ہونا ضروری ہے، لہٰذا شرطہ (Police) اُس کی امارت (Command) میں رہے۔ والی کی امارت میں پولیس بھی شامل رہے، صرف اُن تین مذکورہ چیزوں کو چھوڑ کر، البتہ شرطہ کیونکہ فوج کا حصہ ہے، لہٰذا اُس کے انتظامی امور فوج ہی کے اختیار میں رہیں اور شرطہ تنفیذی اعتبار سے والی کی امارت میں ہو۔

والی کیلئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی ولایت میں انجام دئے جا رہے ہر کام سے خلیفہ کو باخبر رکھے، البتہ اُسے اس بات کا اختیار ہے کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جو مخصوص نوعیت کا ہو، تو وہ پہلے خلیفہ کو باخبر کرے اور اس کے حکم کا انتظار کرے، لیکن اگر اس انتظار سے صورتِ حال میں برائی کا اندیشہ ہو تو وہ پہلے کام کو انجام دے، اور پھر خلیفہ کو خبر دے کہ اُس کیلئے کیوں خلیفہ کے حکم کے بغیر کام انجام دینے کی نوبت آئی۔

والی اور معاون تفویض میں، خلیفہ کو باخبر رکھنے کے اعتبار سے جو فرق ہے، کہ معاون کیلئے خلیفہ کو باخبر رکھنا لازم ہے جبکہ والی پر نہیں، وہ فرق اس وجہ سے ہے کہ معاون خلیفہ کا باعتبار شخص نائب و وکیل ہوتا ہے، اور خلیفہ پر عائد کاموں کو انجام دیتا ہے۔ اگر خلیفہ وفات پا جائے تو معاون خود بخود معزول ہو جاتا ہے، کیونکہ جس کا وہ وکیل تھا وہ اب نہیں رہا۔ والی کی یہ صفات نہیں ہوتیں، والی خلیفہ کا بحیثیتِ شخص نائب و والی نہیں ہوتا، نہ ہی وہ خلیفہ پر عائد فرائض انجام دیتا ہے چنانچہ خلیفہ کے وفات پا جانے سے والی از خود معزول نہیں ہو جاتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب والیوں کا تقرر فرماتے تو اُن پر ہر امر کی اطلاع دینے کی شرط عائد نہیں فرماتے تھے، اور نہ والیان اپنے امور کی اطلاع دیا کرتے تھے، بلکہ اپنے فرائض مکمل خود مختاری سے انجام دیتے تھے، اور جیسے مناسب سمجھتے تھے حکومت کرتے تھے۔ یہی صورتِ حال حضرت معاذؓ، عتاب بن اُسید اور العلاء بن الحضرمی اور تمام والیان کی تھی۔ اس سے دلیل ملتی ہے کہ والی اپنے ہر کام کی اطلاع خلیفہ کو نہیں دیتا، یہی والی اور معاون کا فرق ہے کہ معاون پر خلیفہ کو اپنے ہر کام سے باخبر رکھنا لازم ہے، جبکہ والی پر نہیں۔ اسی لئے خلیفہ معاون کے کئے ہوئے ہر کام کو جانچتا ہے، لیکن والی کے کام کی اس طرح پرکھ نہیں کرتا، البتہ خلیفہ والیوں سے احوال معلوم کرتا رہتا ہے اور اُن کی خبر رکھتا ہے۔ لہٰذا والی اپنی ولایت میں مطلق تصرف رکھتا ہے، اسی لئے حضرت معاذؓ جب یمن کے والی کی حیثیت سے مقرر کئے گئے تو فرمایا: ((أجتهد رأيي)) یعنی اپنی رائے پر اجتہاد کرونگا۔ یہ دلیل ہے کہ والی اپنے ہر کام سے خلیفہ کو باخبر نہیں رکھتا، بلکہ اپنا اجتہاد کرتا ہے، البتہ یہ چیز والی کو خلیفہ کی کسی معاملہ میں رائے لینے سے نہیں روکتی، ہاں وہ ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں خلیفہ کی رائے کا انتظار نہیں کرتا کہ اس سے کاموں کے نفاذ کا حرج ہوتا ہے اور لوگوں کے امور متاثر ہوتے ہیں۔ والی کی تقرری میں اس کا اُس مخصوص ولایت کے تمام لوگوں پر امیر ہونا اور ان کے امور کی نگہداشت کرنا شامل ہوتا ہے، لیکن جب کوئی غیر معمولی معاملہ پیش آ جائے تو، وہ خلیفہ کو اطلاع دیتا ہے، بہرحال اگر خلیفہ کے احکام کے انتظار میں معاملہ بگڑنے کا خوف ہو، تو والی اُس کام کو انجام دے کر پھر خلیفہ کو باخبر کرتا ہے۔

ایک والی کا کسی ولایت میں طویل مدّت تک رکھنا ٹھیک نہیں ہوتا، بلکہ اُس کے وہاں قدم جمانے اور لوگوں میں اپنا رسوخ قائم کرنے سے پہلے، والی کو علیحدہ کر دیا جانا چاہئے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم والی کو مقرر کرتے اور پھر کچھ مدت کے بعد اُسے معزول کر دیا کرتے تھے، یہاں تک کہ کوئی بھی والی حضور ﷺ کی تمام حیات والی نہ بنا رہا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ولایت دائمی نہیں ہوتی، بلکہ کچھ مدت کی ہوتی ہے پھر معزول کر دیا جاتا ہے۔ البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ولایت کی مدت کس قدر طویل یا قصیر ہونا چاہئے، جو ثابت ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بھی والی کو اپنی تمام عمر کسی ولایت کا والی نہیں رکھا، والی مقرر کیا اور پھر معزول کیا۔ لیکن حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں معاویہ کی شام میں طویل مدتِ ولایت سے

امتِ مسلمہ میں فتنہ اُٹھا، اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ کسی بھی والی کا کسی ولایت پر طویل مدت تک برقرار رکھنا امتِ مسلمہ اور ریاستِ اسلامی کیلئے نقصان کا باعث ہوتا ہے، لہٰذا ولایت کی مدت لمبی نہیں ہونا چاہئے۔

والی ایک ولایت سے دوسری ولایت منتقل (Transfer) نہیں کیا جاتا، کیونکہ اس کی ولایت میں مقام کا تعین ہوتا ہے، البتہ اُسے معزول کر کے دوسری جگہ پھر تقرری کی جاسکتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ آپ ﷺ والیوں کو معزول کر دیا کرتے تھے لیکن اُنہیں ایک ولایت سے دوسری ولایت منتقل کرنا آپ ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ مزید یہ کہ والی کی تقرری ایک عقد ہوتا ہے جس کے لئے مخصوص الفاظ ہیں، جن میں اُس مقام کی تحدید کی جاتی ہے جہاں والی کو متعین کیا جارہا ہو، چنانچہ والی کے اقتدار اُس علاقے پر اُس وقت تک قائم رہتے ہیں جب تک کہ خلیفہ اسے معزول نہ کر دے، لیکن اگر اسے معزول نہ کیا جائے تو، وہ اپنی پہلی یعنی اصلی جگہ کا والی رہتا ہے۔ اگر کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے، بغیر اس کے کہ پہلی جگہ سے معزول کیا جائے، تو وہ اپنی پہلی جگہ سے معزول نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ نئی جگہ کا والی بن جاتا ہے، کیونکہ اسے پہلی جگہ سے معزول کرنے کیلئے صریح الفاظ کا ہونا ضروری ہے اور نئی جگہ اس کے تبادلے کیلئے بھی نئی تقرری کا عقد ضروری ہے۔ لہٰذا یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ والی کا ایک جگہ سے دوسری جگہ تبادلہ نہیں ہوتا، بلکہ اسے معزول کیا جاتا ہے اور دوسری کسی ولایت میں اس کی نئی تقرری ہوتی ہے۔

والیوں کے کام کی خبر گیری کرنا خلیفہ کی ذمہ داری ہے:

خلیفہ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ والیوں کے کام کی باریکی سے نگرانی رکھے۔ خلیفہ کو چاہئے کہ وہ کسی کو اس بات پر متعین کرے کہ والیوں کے احوال سے باخبر رہے، نیز یہ کہ والیوں میں کچھ سے یا سب سے وقتاً فوقتاً ملاقات کرے اور وہاں کے عوام کی شکایات پر غور کرتا رہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ جب آپ ﷺ کسی کو والی مقرر فرماتے تو اُس کا امتحان لیتے تھے جیسا کہ حضرت معاذؓ اور حضرت ابو موسیٰؓ کے ساتھ ہوا، یا والیوں کو اُن کے اہم معاملات میں ہدایات دیتے تھے جیسا کہ عمرو بن حزم کے ساتھ کیا، یا کسی اہم معاملہ میں انتباہ فرماتے جیسا کہ ابان بن سعید کے ساتھ پیش آیا کہ جب اُنہیں بحرین کا والی مقرر کیا تو فرمایا:

((استوص بعبد القيس خيراً و أكرم سراتهم۔))

عبد قیس کا خیال رکھنا اور اُن کے امیروں کا اکرام کرنا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ والیوں کا محاسبہ کیا کرتے تھے، اُن کے احوال معلوم کیا کرتے تھے اور اُن کی جو خبریں آپ ﷺ تک پہنچتیں اُنہیں بھی سنا کرتے تھے، والیوں سے آمدنی اور اخراجات کا حساب لیا کرتے تھے۔ بخاری و مسلم شریف میں ابی حمید الساعدي سے روایت آتی ہے:

((أن النبي ﷺ استعمل ابن اللُّتبيَّة على صدقات بني سليم فلما جاء و حاسبه قال هذا الذي لكم و هذه هدية أهديت لي،فقال رسول الله ﷺ فهلّا جلستَ في بيت أبيك و بيت أمك حتى تأتيك هديتك إن كنت صادقاً،ثم قام رسول اللهؐ فخطب الناس و حمد الله و أثنى عليه فقال:أما بعد فإني أستعمل رجلاً منكم على أمورٍ مما ولاني الله فيأتي أحدكم فيقول هذا لكم و هذه هدية أهديت لي فهلاً جلس في بيت أبيه و بيت أمه حتى تأتيه هديته إن كان صادقاً،فوالله لايأخذ أحدكم منها شيئاً بغير حق إلا جاء الله يحمله يوم القيامة،ألا فلأعرفنّ ما جاء الله رجلٌ ببعير له رغاء أو ببقرة لها خوار أو شاةٍ تيعر، ثم رفع يده حتى رأيت بياض إبطيه ألا هل بلغت۔))

آپ ﷺ نے بنی سلیم کے صدقات پر ابن اللتبیہ کو مامور فرمایا، جب وہ حضور ﷺ کے پاس آئے اور اُن سے حساب لیا گیا تو کہا کہ یہ آپ ﷺ کیلئے ہے اور یہ (حصہ) مجھے بطورِ ہدیہ ملا ہے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو اپنے باپ اور اپنی ماں کے گھر بیٹھتے تاکہ وہیں تمہیں یہ ہدیہ ملتا، پھر آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کی اور لوگوں سے مخاطب ہوئے، فرمایا: میں نے تم لوگوں میں سے ایک شخص کو ایک کام سونپا جو مجھے اللہ نے سونپا تھا، تو وہ شخص آ کر کہتا ہے کہ یہ آپ ﷺ کیلئے ہے اور یہ میرے لئے ہدیہ ہے۔ تو وہ اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھے حتی کہ اسے اسکے ہدیے ملیں اگر وہ سچا ہے۔ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی کہ تم میں سے کوئی بغیر حق کے کچھ نہ لیگا (اگر ایسا کیا تو) سوائے اس کے کہ قیامت کے دن وہ اُسے اُٹھائے ہوئے ہوگا۔ مجھے وہ شخص اپنے لائے ہوئے اونٹ کی آواز سے، اپنی لائی ہوئی گائے کے رمبھانے سے اور اپنی لائی ہوئی بکری کے ممیانے سے پہچانا جائیگا۔ پھر آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ اتنا اوپر اُٹھایا کہ میں نے آپ ﷺ کے بغل کی سفیدی دیکھ لی، پھر فرمایا: کیا میں نے (پیغام) پہنچا نہ دیا؟

اسی طرح حضرت عمرؓ بڑی سختی سے اپنے والیوں کا محاسبہ فرمایا کرتے تھے۔ اُنہوں نے محمد ابن مسلمہ کو والیوں کے احوال اور اُن پر نگرانی کیلئے متعین کیا تھا، پھر آپؓ والیوں کو حج کے موسم میں جمع کر کے اُن کے کاموں کا جائزہ لیا کرتے تھے اور عوام کی شکایات سنا کرتے تھے۔ والیوں سے اُن کی ولایات کے مُعاملات پر مذاکرہ کرتے اور اُن کے احوال معلوم کیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں روایت ہے کہ ایک دن آپؓ نے لوگوں سے پوچھا کہ اگر میں تم میں سے بہتر شخص کو تمہارے اوپر مقرر کردوں جو عدل سے کام لے، تو کیا میں نے اپنی ذمہ داری پوری کردی؟ لوگوں نے کہا "ہاں"۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا نہیں! جب تک کہ میں اُس کے کام کو دیکھ نہ لوں کہ کیا اُس نے ویسا ہی کیا ہے جو اسے حکم دیا تھا یا نہیں! حضرت عمرؓ اپنے والیوں اور عاملوں سے حساب لینے میں سخت تھے، اور بعض اوقات تو صرف شبہ کی بنیاد پر، ایسا شبہ جو دلیل نہیں ہوسکتا، کسی کو معزول بھی کردیا کرتے تھے۔ ایک بار آپؓ

سے اس بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ یہ آسان ہے کہ قوم کی بھلائی کیلئے ایک امیر کی جگہ دوسرا امیر بدل دیا جائے۔ اپنی اس سختی کے باوجود حضرت عمرؓ والیوں کو اپنے کام کیلئے پوری چھوٹ دیتے تھے اور اُن کی شان و رتبہ کی حفاظت کرتے تھے، اُن کی بات سنا کرتے تھے اور اُن کی دلیل پر غور کرتے تھے، اور جب کسی کی دلیل پسند آتی، تو اپنی پسندیدگی کو چھپاتے بھی نہیں تھے بلکہ بعد میں اس کی تعریف بھی کرتے۔ ایک بار حضرت عمرؓ کو خبر ملی کہ حمص میں اُن کے عامل عمیر ابن سعد نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا:

(لا يزال الإسلام منيعاً ما اشتدَّ السلطان، و ليست شِدَّة السلطان قتلاً بالسيف أو ضرباً بالسوط، ولكن قضاءً بالحق و أخذاً بالعدل)

اسلام اس وقت تک مضبوط رہیگا جب تک اس کا اقتدار مضبوط رہے۔ مضبوط اقتدار تلوار سے قتل کرنے اور کوڑے سے مارنے میں نہیں، بلکہ حق کو قائم رکھنے اور عدل سے فیصلے کرنے میں ہے۔

حضرت عمرؓ نے یہ سن کر فرمایا:

(وددت لو أن لي رجلاً مثل عمير بن سعد أستعين به على أعمال المسلين)

کاش میرے پاس کوئی عمیر بن سعد جیسا ہوتا جو مسلمانوں کے کام میں میری مدد کرتا۔

القضاء

قضاء وہ حکم صادر کرتی ہے جو نافذ العمل ہوتا ہے، وہ لوگوں کے درمیان جھگڑوں میں فیصلے کرتی ہے یا اُس چیز کو روکتی ہے جس سے معاشرہ کے حق کو نقصان پہنچتا ہے، لوگوں کے درمیان، یا کسی شخص اور حکومت (حاکم یا کوئی ملازم، خلیفہ یا دیگر) کے درمیان نزاع میں فیصلہ کرتی ہے۔

قضاء کی حقیقت واصلیت کتاب وسنت ہے۔ جہاں تک کتاب اللہ کا سوال ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿فَاحكم بينَهم بمآ انزل اللهُ﴾

اور یہ کہ تم اُن کے درمیان وہی فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: مائدہ:۴۹)

﴿وَ إِذا دُعُواْ إِلىَ اللهِ وَ رَسُولِه لِيَحْكُمَ بَينَهُمْ﴾

اور جب انہیں اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: نور:۴۸)

باعتبارِ سنت، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قضاء کے منصب پر بنفس نفیس فائز تھے اور وہ لوگوں کے درمیان احکام جاری فرماتے تھے، بخاری شریف میں روایت ہے:

((عن عائشة رضؓ زوج النبی ﷺ أمها قالت كان عتبة بن ابی وقاص عَهِد إلى أخيه سعد ابن ابی وقاص أن ابن وليدة زمعة مِني فاقبضه إليك،فلما كان عام الفتح أخذه سعد فقال: ابنُ أخي قد كان عَهِد إليَّ فيه،فقام إليه عبد بن زمعة فقال: أخي و ابن وليدة أبي،وُلِد على فراشه، فتسابقا إلى رسول اللهؐ فقال سعد: يا رسول الله ابن أخي كان عَهِد إليه فيه.و قال عبد بن زمعة: أخي و ابن وليدة أبي وُلِد على فراشه. فقال رسول اللهؐ هو لك يا عبد بن زمعة ثم قال رسول اللهؐ: الولد للفراش و للعاهر الحجر))

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ عتبہ ابن ابی وقاص نے اپنے بھائی سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے کہا کہ زمعہ کا بیٹا میرا ہے، تو تم اُسے اپنے پاس رکھو۔ جس سال مکہ فتح ہوا اُس سال حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اُس بچے کو لے لیا اور کہا کہ اسے میرے بھائی نے مجھے سونپا ہے۔ عبد ابن زمعہ نے اُنہیں روکا اور کہا کہ یہ میرا بھائی ہے، میرے باپ کا ہے اور اُسی کے بستر پر پیدا ہوا ہے۔ دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ یہ میرا بھتیجہ ہے اور میرے بھائی نے مجھے سونپا ہے۔ عبد ابن زمعہ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ: یہ میرا بھائی ہے، میرے باپ کا بیٹا اور اسی کے بستر (یعنی گھر) پر پیدا ہوا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ بیٹا اُسی کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا اور زانی

کیلئے پتھر (سنگساری) ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قاضی مقرر فرمائے، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن کے قاضی بنائے گئے اور آپ ﷺ نے اُنہیں قضاء سے متعلق ہدایات دیں، فرمایا:

((إذا تقاضا إليك رجلان فلا تقض للأول حتى تسمع كلام الآخر فسوف تدري كيف تقضي))

جب تمہارے پاس دو لوگ کوئی معاملہ لے کر آئیں تو اس وقت تک فیصلہ نہ کرو جب تک دوسرے شخص کی بھی بات نہ سن لو، پھر تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ کیسے فیصلہ ہو۔ (ترمذی)

مسند احمد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

((إذا جلس إليك الخصمان فلا تكلّم حتى تسمع من الآخر كما سمعت من الأول))

جب تمہارے سامنے دو فریق بیٹھیں تو اس وقت تک نہ بولو جب تک دوسرے کی بات اس طرح نہ سن لو جیسے پہلے کی سنی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو الجَند کا قاضی مقرر فرمایا تھا، قضاء کی مشروعیت کیلئے یہ دلیل ٹھہرتی ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث سے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قضاء کے طریقہ کی کیفیت معلوم ہوتی ہے کہ حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ اور عبد ابن زمعہ کے معاملہ میں زمعہ کے بیٹے کے بارے میں اختلاف ہوا، دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے، یہ دعویٰ پیش کیا کہ بچہ اُس کا ہے اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن دونوں کو شرعی حکم بتایا کہ بچہ عبد بن زمعہ کا بھائی ہے اور یہ کہ بچہ اُسی کا ہوگا جس کے بستر پر پیدا ہو۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ شرعی حکم ہوا اور آپ ﷺ نے دونوں کو اُس حکم کا پابند بنایا۔ یہ قضاء کی تعریف ٹھہری، یہی تعریف وصفِ حقیقی ہے اور کیونکہ یہ شرعی حقیقت ہے لہٰذا اس کیلئے دلیل لازمی ہے جس سے استنباط کیا جا سکے، اور یہ حدیث قضاء کی تعریف کی دلیل ہے۔

قضاء کی تعریف بعض جگہ یہ کی گئی کہ 'لوگوں کے درمیان تنازعات کا تسویہ ہے'۔ قضاء کی یہ تعریف ایک زاویہ سے ناقص ہے، دوسرے یہ کہ یہ واقعی حقیقتِ وصف نہیں ہے، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے ثابت ہوتا ہے۔ یہ تعریف قضاء کے ممکنہ نتائج کی مُظہر ہو سکتی ہے، بالفاظِ دیگر قاضی کے فیصلہ سے قضیہ کا تسویہ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی، یعنی فریقین کے مابین خصومت یا اختلاف ختم ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ لہٰذا قضاء کی جامع تعریف وہی ہوگی جو بحث کے شروع میں آئی اور جو حدیث سے مستنبط ہے۔

مزید یہ کہ اس جامع تعریف میں ایک طرف لوگوں کے درمیان فیصلے کرنا شامل ہے جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث

میں وارد ہوا اور دوسری طرف اِس تعریف میں حِسبہ بھی شامل ہے، حسبہ کی تعریف یہ ہے کہ 'یہ جماعت کے حق کو نقصان پہنچنے والے معاملہ پر شرعی حکم کی خبر ہے جو قابلِ نفاذ ہے'۔ اس معاملہ کا ذکر 'صبرۃ الطعام' والی حدیث میں مذکور ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے:

((أنَّ رسول الله صلى الله عليه و سلم مَرَّ على صُبْرَة طعام فأدخَلَ يَدَهُ فيها فَنَالَت أصابعهُ بللاً، فقال: ما هذا يا صاحب الطعام؟ فقال: أصابته السماء يا رسول اللهؐ، فقال: أفلا جَعَلْتَهُ فوق الطعام كي يراه الناس، مَن غَشَّ فَلَيْسَ مِنِّي))

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بازار میں ایک غلہ کے ڈھیر کے قریب سے گزرے تو اپنا ہاتھ اُس ڈھیر میں اندر ڈالا اور آپ ﷺ کی انگلیاں غلہ بھیگا ہوا ہونے کی وجہ سے نَم ہو گئیں، تو فرمایا: اے اناج فروش، یہ کیا ہے؟ اُس شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ، یہ آسمان (یعنی بارش) کی وجہ سے ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو اِس بھیگے ہوئے حصہ کو اوپر کیوں نہیں رکھا کہ لوگ دیکھ سکیں؟ جو دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں!

اس جامع تعریف میں مظالم بھی شامل ہیں کیونکہ یہ قضاء کا حصہ ہیں نہ کہ حکومت کا۔ یہ حاکم کے خلاف شکایت ہے، مظالم کی تعریف یوں کی جاتی ہے:

اُس حکم شرعی کی خبر جس کا نفاذ لازمی ہوتا ہے، اور جو عوام کے اور خلیفہ، یا اس کے کسی معاون، یا کسی والی یا کسی ملازم کے درمیان ہو، اور مسلمانوں کے درمیان کسی نصِ شرعی کی شرح یا تعبیر کے بارے میں واقع ہو جس کے بموجب کوئی حکم یا فیصلہ صادر کرنا ہو۔

مظالم کا ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی حدیث میں آتا ہے جو اشیاء کی قیمت متعین کرنے کے سلسلے میں ہے:

((..... و إنّي لأرجو أن ألقى الله، ولا يطلبني أحد بِمَظْلِمَة ظلمتها إياهُ في دمٍ ولا مالٍ))

اور میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے اِس حال میں ملنا چاہتا ہوں کہ مجھ سے کوئی شخص کسی مظلمہ کا مطالبہ نہ کرے، نہ جان کا نہ مال کا۔ (راوی حضرت انسؓ: مسند احمد)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ حاکم، والی یا کسی ملازم کے کسی مظلمہ کا معاملہ جب کوئی شخص اُٹھائے تو وہ قاضی مظالم کے پاس جائیگا جو اُس پر فیصلہ صادر کریگا اور جو قابلِ نفاذ ہوگا۔ لہٰذا قضاء کی جامع تعریف میں یہ تینوں چیزیں شامل ہونگی جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے ثابت ہیں، یعنی: لوگوں کے درمیان خصومات کے فیصلے، معاشرہ کو نقصان پہنچانے والی ہر چیز کو روکنا اور عوام اور حکام کے درمیان، یا عوام اور حکومت کے ملازمین کے درمیان نزاع کا فیصلہ۔

قضاۃ کی اقسام:

قضاۃ کی تین قسمیں ہیں: ایک؛ قاضی، جو لوگوں کے درمیان معاملات میں یا تعزیرات (عقوبات) کے فیصلے کرتا ہے؛ دوسرا محتسبؒ، جو اُن مخالفات (Offences) کے فیصلے کرتا ہے جن سے معاشرہ کے حق کو ضرر پہنچتا ہو؛ اور تیسرا قاضیٔ مظالم، جو عوام اور ریاست کے درمیان نزاع کا فیصلہ کرتا ہے۔

یہ تین قسم کے قاضی ہوئے، پہلی قسم کے قاضی، یعنی جو لوگوں کے درمیان خصومات کو رفع کرتے ہیں، تو اُن کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل (جیسا کہ حضرت سعد ابن ابی وقاص والی حدیث میں گزرا) اور حضور ﷺ کا حضرت معاذؓ کو یمن کا قاضی بنانا ہے۔ دوسری قسم کے قاضی، یعنی محتسب جو جماعت کے حق کو ضرر سے روکتا ہے، یہ بھی حضور ﷺ کے قول و فعل سے ثابت ہوا، آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَن غَشَّ فَلَيْسَ مِنِّي))

جو دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں!

یہ مسند احمد کی اُس حدیث کا حصہ ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے اور اوپر گزر چکی ہے۔ حضور ﷺ دھوکہ دینے والے سے تعرض کرتے تھے اور سزا دیا کرتے تھے۔ مسند احمد میں قیس ابن ابی غرزہ الکنانی کی روایت نقل ہوئی ہے، کہتے ہیں کہ ہم مدینہ میں مال تھوک سے خریدا کرتے تھے اور خود کو وسیط یا دلال کہتے تھے، حضور ﷺ بازار آئے اور ہمیں ایک بہتر نام سے پکارا:

((يا معشر التجار إن هذا البيع يحضره اللغو والحلف فشوبوه بالصدقة))

اے تاجرو! ایسی تجارت میں لغویات ہوتی ہیں اور قسمیں کھائی جاتی ہیں، ان کو صدقہ سے پاک کرلو۔

مسند احمد میں ابی منہال سے روایت ہے:

((أن زيد بن أرقم و البراء بن العازب كانا شريكين فاشتريا فضة بنقد و نسيئة فبلغ ذلك النبي فأمرهما أن ما كان بنقد فأجيزوه وما كان بنسيئة فردوه))

زید ابن ارقم اور البراء بن العازب باہم شریک (پارٹنر) تھے، انہوں نے چاندی خریدی، نقداً اور اُدھار۔ جب یہ اطلاع حضور ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے نقد خرید کو جائز قرار دیا اور اُدھار والی کو روک دیا اور کہا کہ اُسے واپس کردو۔

یہ معاملہ بھی حسبہ سے متعلق ہے۔ حسبہ اُس قضاء کا نام ہے جو معاشرہ کے حق کو نقصان پہنچانے والے معاملہ میں فیصلہ دیتی ہو۔ حسبہ ریاستِ اسلامی میں ایک متعین اصطلاح ہے جس کے ذیل میں تاجروں اور دستکاروں پر نگرانی کی جاتی ہے تا کہ اُنہیں اپنی تجارت، کام اور مال میں لوگوں کو دھوکہ دینے سے باز رکھا جائے، اُن پر صحیح ناپ، ماپ اور تول کی پابندی کی جائے

وغیرہ جن سے معاشرہ کو نقصان پہنچتا ہے۔ یہ وہ عمل ہے جو آپ ﷺ نے بذاتِ خود کیا، اس کا حکم دیا اور جیسا کہ البراء بن العازب والی حدیث سے ثابت ہے، فریقین کو ادھار والی چاندی کے سودے سے منع فرمایا۔ طبقات ابن سعد اور ابن عبد البر کی الاستیعاب میں آتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ نے حضرت سعید بن العاصؓ کو مکہ کے بازار پر متعین کیا۔ چنانچہ حسبہ کا حضور ﷺ کی سنت سے ثابت ہونا واضح ہے۔ اسی طرح حضرت عمر بن الخطابؓ نے اپنے قبیلہ کی ایک عورت 'الشفاء' کو جو ام سلیمان بن ابی حثمہ کے نام سے معروف تھیں، مدینہ کے بازار پر قاضی متعین کیا اور عبداللہ بن عتبہ کو بھی مدینہ کے بازار پر متعین کیا، یعنی قاضیٔ حسبہ مقرر کیا۔ اس کو امام مالک نے مؤطا میں اور امام شافعی نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔ مزید یہ کہ حضرت عمرؓ بذاتِ خود بازار کا گشت لگاتے اور حسبہ سے متعلق فیصلے کیا کرتے تھے، جیسا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل تھا۔ تمام خلفاء کا اسی پر عمل رہا یہاں تک کہ المہدی کے دور خلافت میں حسبہ قضاء کی ایک مستقل شاخ کے طور پر علیحدہ محکمہ بن گیا۔ ہارون الرشید کے دور میں قاضی حسبہ بازار کا دورہ کرتے تھے، ناپ تول کے پیمانوں کی جانچ کرتے تاکہ لوگوں کو دھوکہ نہ ہو اور تاجروں کے معاملات کی خبر گیری بھی کرتے تھے۔

قضاء کی قسم مظالم کی دلیل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿فإن تَنَازَعْتُمْ فِي شئٍ فَرُدُّوهُ إلى اللهِ والرَّسُولِ﴾

پھر اگر کسی چیز میں تم اختلاف کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: النساء:۵۹)

یہ ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان، اُس کے اس حکم کے بعد آیا:

﴿ يَا أَيُّها الذينَ آمَنُوا أَطِيْعُواْ اللهَ وَ أَطِيعُواْ الرَّسُولَ وَ أُوْلِى الأَمْرِ مِنْكُمْ﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اُن کی جو تم میں صاحب امر ہیں۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: نساء:۵۹)

لہٰذا عوام اور حاکم یعنی اولی الامر کے درمیان جو بھی نزاع ہو، یہ لازم ہے کہ اُسے اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی طرف لوٹایا جائے، یعنی اللہ کے حکم سے رجوع کیا جائے۔ اس کا لازم تقاضا یہ ہے کہ ایک قاضی ہو جو اس نزاع میں حکم جاری کرے، یعنی قاضیٔ مظالم۔ کیونکہ مظالم کی تعریف میں رعایا اور خلیفہ کے درمیان نزاع کے معاملات شامل ہیں۔ قضاء کے مظالم کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اور فعل دونوں ہیں، البتہ آپ ﷺ نے مخصوص طور پر مظالم کیلئے پوری ریاست میں کوئی مستقل قاضی مقرر نہیں فرمایا، اسی طرح خلفاء راشدین بھی اس شعبہ میں خود ہی فیصلے کیا کرتے تھے۔ یہی عمل حضرت علیؓ کے وقت بھی رہا، البتہ حضرت علیؓ نے اس کام کیلئے کوئی وقت مخصوص نہیں کر رکھا تھا اور نہ ہی کوئی مخصوص طریقہ کار وضع کیا تھا، بلکہ جب بھی کوئی ایسا حادثہ پیش آتا، جو مظالم کی تعریف میں آتا ہو، اُس وقت وہ اس میں حکم دیا کرتے تھے، گویا کہ مظالم کے فیصلے اُن کی عمومی ذمہ داریوں میں شامل

تھے۔عبدالملک ابن مروان کے وقت یہی سلسلہ جاری رہا،عبدالملک ابن مروان وہ پہلے خلیفہ تھے جنہوں نے مظالم کے معاملات کیلئے ایک دن مختص کر لیا تھااور اس کے کیلئے ایک مخصوص طریقہ بھی اپنایا تھا۔اسی دن وہ مظلمہ کے معاملات دیکھا کرتے تھے۔جب کوئی ایسا معاملہ مظالم کے ذیل میں پیش آتا جسے وہ خود نہیں حل کر پاتے تو ایسے معاملہ کو وہ ایک قاضی کو بھیج دیتے تھے جو اُس پر فیصلہ دیتا۔اس کے بعد خلفاء نے خاص نمائندے مقرر کئے جو مظالم کے معاملات دیکھا کرتے تھے اور اُن کیلئے مخصوص اسلوب وضع ہوئے۔اس کو 'دارالعدل' کہا جاتا تھا۔یہ جائز عمل ہے کیونکہ خلیفہ پر جو بھی ذمہ داریاں ہوتی ہیں،اُس کیلئے جائز ہے کہ وہ اُن کو انجام دینے کیلئے اپنے نائب مقرر کرے جو اُنہیں انجام دیں۔اسی طرح اِس کام کیلئے وقت اور اسلوب مخصوص کر لینا بھی جائز ہے کیونکہ یہ سب مباح کے دائرہ میں آتا ہے۔

قاضیوں کیلئے شرائط:

جسے قاضی کے عہدہ پر مقرر کیا جائے ،یہ لازم ہے کہ وہ مسلم،آزاد،بالغ،عاقل،عادل،فقیہہ ہو اور احکام کا حقیقت ِ حال پر انطباق کرنا جانتا ہو۔اس کے علاوہ جو شخص قاضیٔ مظالم ہو وہ اِن شروط کے ساتھ ساتھ مرد ہو اور قاضی قضاۃ کی طرح مجتہد ہو کیونکہ اس عہدہ کا حکم قضاء کے ساتھ ساتھ حاکم پر بھی منطبق ہوتا ہے اور اُس پر شریعت نافذ کرتا ہے،لہٰذا اُس کا باقی شرائط کے ساتھ ساتھ مرد ہونا بھی ضروری ہے۔اُن شرائط میں قاضی کیلئے فقیہہ ہونا لازمی ہے،لیکن قاضیٔ مظالم کیلئے فقیہہ ہونے کے ساتھ اس کا مجتہد ہونا بھی ضروری ہے، کیونکہ قاضیٔ مظالم کی ذمہ داریوں میں یہ دیکھنا بھی شامل ہے کہ کہیں حاکم اللہ کے نازل کردہ احکام کے ماسوا اور کسی حکم کو تو نافذ نہیں کر رہا،یعنی کوئی ایسا قانون تو نہیں جس کی کوئی شرعی دلیل نہ ہو یا حاکم کی کوئی دلیل ایسی تو نہیں جس کا واقعہ پر انطباق شرعی نہ ہو۔ایسے معاملات پر صرف ایک مجتہد ہی فیصلہ کر سکتا ہے اور اگر فیصلہ کرنے والا مجتہد نہ ہو تو وہ فیصلہ جہالت کا فیصلہ ہوگا جو کہ حرام ہے۔چنانچہ قاضیٔ مظالم کیلئے حاکم اور قاضی کی شرائط سے آگے بڑھ کر مجتہد ہونا لازمی ہوتا ہے۔

قاضیوں کی تقرری:

یہ جائز ہے کہ قاضی محتسب اور قاضیٔ مظالم کی تقرری عام ہو،یعنی پوری ریاست پر ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ تقرری کسی مخصوص علاقہ یا مخصوص نوعیت کے معاملات تک محدود ہو۔یہ دونوں صورتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے اخذ کی ہوئی ہیں۔آپ ﷺ نے حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی،اور حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کے ایک مخصوص علاقہ کا قاضی مقرر فرمایا تھا،جبکہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ایک مخصوص نوعیت کے معاملہ کا قاضی متعین کیا تھا۔

عدالتوں کی تشکیل:

یہ جائز نہیں ہے کہ کسی بھی عدالت میں ایک سے زیادہ قاضی ہوں، جنہیں فیصلہ کرنے کا اختیار ہو۔ البتہ یہ جائز ہے کہ قاضی کے ساتھ ایک یا ایک سے زیادہ قاضی عدالت میں ہوں، لیکن اُن اضافی قاضیوں کو فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہوسکتا، وہ صرف رائے مشورہ دے سکتے ہیں اور فیصلہ کرنے والا قاضی اِن آراء کو قبول کرنے کا پابند نہیں ہوتا۔

اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بھی معاملے میں ایک سے زیادہ قاضی متعین نہیں فرمائے، بلکہ ایک معاملہ کے لئے ایک ہی قاضی مقرر فرمایا۔ مزید یہ کہ قضاء حقیقت میں حکم شرعی کی خبر ہے جسے ماننا لازم ہے، اور ایک مسلم کیلئے ایک معاملہ میں ایک ہی حکم شرعی ہوتا ہے۔ یہ اللہ کا حکم ہوتا ہے اور ایک ہی ہوتا ہے، ایک سے زیادہ ہرگز نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُس کے متعدد مفہوم ہوسکتے ہیں لیکن ایک مسلم کیلئے، جہاں تک اُس حکم پر عمل کا تعلق ہے، ایک ہی ہوسکتا ہے اُس سے زیادہ قطعاً نہیں۔ کسی حکم کا جو مفہوم ایک مسلم سمجھتا ہے وہی اُس کے حق میں اللہ کا حکم ہے، حالانکہ اُس حکم کے دیگر مفاہیم کو بھی وہ شرعی حکم ہی مانتا ہے۔ اس کے بابت جو بھی مفہوم وہ سمجھے اور اُس پر عمل کرے، وہی اُس کے حق میں اللہ کا حکم ہے، جبکہ دوسری کوئی بھی تقلید اُس کیلئے اللہ کا حکم نہیں ہوتی۔ لہٰذا قاضی جب کسی معاملہ میں اللہ کا حکم سناتا ہے، جس کا تسلیم کرنا اُس شخص پر لازم ہے، تو یہ ضروری ہوا کہ یہ ایک ہی حکم ہو، کیونکہ اللہ کے حکم کے مطابق اس فیصلہ (خبر) کو ماننا اُس پر فرض ہے۔ اُس کیلئے اس حکم کو ماننا اور اُس پر عمل کرنا اللہ کے حکم پر عمل کرنا ہوتا ہے اور کسی بھی معاملہ میں اللہ کا حکم ایک ہی ہے، اگرچہ کہ اُس حکم کے متعدد مفاہیم ہی ہوں۔ چنانچہ ایک عدالت میں فیصلہ کرنے والا ایک ہی قاضی ہوسکتا ہے کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ اللہ کا حکم ایک سے زیادہ ہو۔ یہ جائز ہے کہ ایک ہی علاقہ میں تمام مقدمات کیلئے دو علیحدہ عدالتیں ہوں، کیونکہ قضاء درحقیقت خلیفہ کی نیابت ہے اور نمائندگی کی طرح اس میں بھی ایک سے زیادہ کی اجازت ہے۔ اسی طرح ایک ہی علاقہ میں ایک سے زیادہ قاضی بھی ہوسکتے ہیں اور اگر فریقین میں اس بات پر ٹھن جائے کہ کس عدالت میں مقدمہ جائے، تو مدعی کا حق ہوگا کہ وہ جس عدالت میں چاہے جائے کیونکہ وہ حق کا طالب ہے اور اس معاملہ میں مدعی کی پسند مدعا علیہ کی پسند پر غالب ہوگی۔

قاضی کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ عدالت کے علاوہ کہیں اور فیصلہ دے، اسی طرح حلف برداری اور ثبوت بھی عدالت ہی میں پیش ہوسکتے ہیں۔

اس کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے، حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((قضى رسول الله ﷺ أن الخصمين يقعدان بين يدي الحاكم))

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ دونوں فریق قاضی کے سامنے بیٹھیں۔ (مسند احمد وسنن ابوداؤد)

اس حدیث سے عدالت کی ہیئت کا پتہ چلتا ہے جو عدالتوں کیلئے بیان کی گئی ہیں، یعنی کہ اُنکی ایک مخصوص

شکل ہوتی ہے جس میں فیصلے کئے جاتے ہیں، جہاں دونوں فریق قاضی کے سامنے بیٹھیں۔اس ہیئت کی تائید ایک اور حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضرت علیؓ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إذا جلس إليك الخصمان فلا تكلّم حتى تسمع من الآخر كما سمعت من الأول))

جب تمہارے سامنے دو فریق بیٹھیں تو اس وقت تک نہ بولو جب تک دوسرے کی بات اس طرح نہ سن لو جیسے پہلے کی سنی تھی۔

اس حدیث میں بھی جہاں ((إذا جلس إليك خصمان)) کہا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فیصلے کی صحت اور حلف اُٹھانے کیلئے باقاعدہ عدالت کا ہونا شرط ہے، کیونکہ حضورﷺ نے فرمایا:

((اليمين على المدعى عليه))

بارِ حلف مدعا علیہ پر ہے۔(راوی حضرت ابن عباسؓ: بخاری شریف)

کوئی شخص عدالت ہی میں مدعا علیہ ہوسکتا ہے۔اسی طرح ثبوت کا پیش کیا جانا بھی عدالت ہی میں ضروری ہے، کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((.....ولكن البينة على المدعي،واليمين على من أنكر))

.....لیکن،ثبوت پیش کرنے کی ذمہ داری مدعی پر ہے اور بارِ حلف اُس پر جو(اُس ثبوت سے)انکار کرے۔(البیہقی)

اور کوئی شخص عدالت ہی میں مدعی ہوسکتا ہے یا ثبوت کی صحت سے انکار کرسکتا ہے۔

یہ جائز ہے کہ عدالتوں کے مختلف درجات ہوں جہاں مختلف قسم کے مقدمے پیش ہوں۔یہ بھی جائز ہے کہ بعض قاضی کسی خاص نوعیت کے اور کسی خاص حد تک کے مقدمات کیلئے مختص کئے جائیں اور دیگر مقدمات دوسری عدالتوں کو تحویل کر دئے جائیں۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ قضاء عین نمائندگی ہی کی طرح خلیفہ کی نیابت کا معاملہ ہے جہاں دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔نمائندگی عام بھی ہوسکتی ہے اور خاص بھی۔لہٰذا قاضی کا تعین کسی خاص معاملہ تک بھی ہوسکتا ہے،اس طرح کہ اُسے دوسری قسم کے مقدمات سے روک دیا جائے،اور اُن دوسری قسم کے مقدمات کیلئے دیگر قاضی مقرر کئے جائیں،جبکہ یہ تمام ایک ہی علاقہ میں ہوسکتے ہیں۔اس سے عدالتوں کے مختلف درجات ہونا ثابت ہوتا ہے اور ایسا ماضی میں ہوتا بھی رہا ہے۔علامہ الماوردی اپنی کتاب 'الأحكام السلطانية' میں لکھتے ہیں:

> ابو عبداللہ الزبیری نے کہا کہ بصرہ میں امراء جامع مسجد میں قاضی مقرر کیا کرتے تھے جو قاضی مسجد کہلاتے تھے، یہ قاضی دوسو درہم اور بیس دینار تک کے معاملات اور نفقات کے معاملات میں فیصلے کیا کرتے تھے۔یہ قاضی اپنی مقررہ حدوں سے تجاوز نہیں کرتے تھے اور اسی دائرہ میں اپنی ذمہ داریاں نباہتے تھے۔

پھر یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک مخصوص معاملہ کیلئے قاضی کی تقرری فرمائی، جیسا کہ حضرت عمرو بن العاصؓ کی تقرری میں ہوا؛ اور آپ ﷺ نے تمام انواع کی قضاء کیلئے ایک پوری ولایت پر قاضی مقرر فرمایا، جیسا کہ حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی تقرری میں ہوا جب اُنہیں یمن پر قاضی مقرر کیا گیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہوئی کہ قاضی کی عام اور خاص دونوں طرح تقرری کی جاسکتی ہے۔

ریاستِ اسلامی میں اپیل کیلئے کوئی عدالت نہیں ہوتی، اس طرح مقدمات کی سنوائی کے لحاظ سے ایک ہی قسم کی عدالت ہوتی ہے اور جب قاضی اپنا فیصلہ سنادے تو وہ نافذ ہونے کیلئے ہی ہوتا ہے جسے کوئی بھی دوسرا قاضی کسی حالت میں بدل نہیں سکتا الّا یہ کہ کوئی فیصلہ صریحاً قرآن، سنتِ رسول ﷺ یا اجماعِ صحابہ سے براہ راست ٹکراتا ہو۔

لہٰذا قاضی کا حکم گو کہ وہ ظنی دلیل پر مبنی ہو، اسے نہ وہ خود اور نہ ہی کوئی دوسرا قاضی تبدیل کرسکتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس بات پر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا اجماع تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بعض معاملات میں اپنے اجتہاد سے فیصلہ کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس اجتہاد سے اتفاق نہیں کرتے تھے لیکن اُنہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اِن فیصلوں کو کبھی تبدیل نہیں کیا۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعض فیصلوں میں اُن کے اجتہاد سے اتفاق نہ تھا لیکن اُنہوں نے کبھی ایسے فیصلوں کو نہیں بدلا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ دونوں کے اجتہاد سے بعض امور میں اختلاف ہونے کے باوجود اُن کے فیصلے تبدیل نہیں کئے۔ نجران کے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ اے امیر امومنین! آپ کی کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے اور آپ کی معافی آپ کی زبان سے ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''خدا تمہیں سمجھے! (حضرت) عمر رضی اللہ عنہ اس معاملہ میں ہدایت پر تھے، اور میں (حضرت) عمر رضی اللہ عنہ کا کیا ہوا کوئی بھی فیصلہ نہیں بدلونگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے 'المشرکۃ' کے معاملہ میں پہلے دو چچازاد بھائیوں کو حصہ داری نہیں دی، پھر اسی قسم کے دوسرے معاملہ میں اُنہیں ورثہ میں شریک بھی کیا، اور جب اس تضاد کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا: ''وہ حکم اُس معاملہ میں تھا اور یہ حکم اس معاملہ میں ہے''۔ آپ رضی اللہ عنہ نے دونوں احکام نافذ کئے اور دونوں میں تبدیلی نہیں کی۔ اسی طرح دادا (کے ورثہ) کے بارے میں مختلف معاملات میں مختلف فیصلے کئے اور پہلے والے فیصلے تبدیل نہیں کئے۔ شریح کے بارے میں روایت ہے کہ اُنہوں نے دو چچازاد بھائیوں کے بارے میں فیصلہ سنایا جن میں ایک ماں کا بھائی تھا کہ مال (ترکہ) اُس بھائی کا ہوگا، یہ معاملہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُنہیں بلایا اور پوچھا کہ تمہیں اس کی دلیل کس کتاب میں ملی؟ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

﴿وَأُوْلُوا الأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَولَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتابِ اللهِ﴾

تو ایسے لوگ بھی تم ہی میں سے ہیں مگر خدا کی کتاب میں خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار

ہیں (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: سورۂ انفال؛ آیت: ۷۵)

حضرت علیؓ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ إِنْ كَانَ رَجُلٌ يُوْرَثُ كَلَالَةً أَوْ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُدُسُ﴾

اور اگر کسی مرد یا عورت کا براہِ راست کوئی وارث نہ ہو، اور اس کے ایک بھائی یا بہن ہو، تو ان دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہوگا، (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: سورۂ نساء آیت: ۱۲)

یہ کہہ کر حضرت علیؓ نے اُس فیصلہ کو تبدیل کر دیا۔ اس کا جواب ابن قدامہ نے اپنی کتاب 'المغنی' کی جلد ۹ باب قضاء کے صفحہ ۵۶ پر یوں دیا ہے کہ ہماری رائے میں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت علیؓ نے فیصلہ تبدیل کیا ہو، اور اگر ایسا کیا بھی ہے تو یہ ممکن ہے کہ حضرت علیؓ نے شریح کے فیصلے کو کتاب اللہ کے برخلاف پایا اور بدل دیا۔ صحابہ کرامؓ کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ وہ بعض وقت اپنے اجتہاد سے فیصلے دیا کرتے تھے اور خلیفۂ وقت اُن سے اِس معاملہ میں اختلاف کرتے تھے، یہ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں ہوا، لیکن کسی نے بھی ایک دوسرے کے فیصلوں کو نہیں بدلا۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ وہ ایک ہی مسئلہ میں مختلف اور متضاد فیصلے دیا کرتے تھے اور سب کو نافذ بھی کیا کرتے تھے، بغیر اس کے کہ اپنے پہلے فیصلہ کو تبدیل کریں جب کہ دونوں میں تضاد تھا، یہ بھی ثابت ہے کہ انہوں نے اس بارے میں فرمایا:

(تلك على ما قضينا و هذه ما قضينا)

وہ ہمارا فیصلہ تھا (اُس بارے میں) اور یہ ہمارا فیصلہ ہے (اس بارے میں)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قاضی کا فیصلہ تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ ابن قدامہ المغنی میں لکھتے ہیں:

''اگر نصِ شرعی یا اجماعِ صحابہ کے خلاف ہوئے بغیر کبھی اُن کے اجتہاد میں تبدیلی آتی، یا کسی سابقہ اجتہاد سے نیا اجتہاد مختلف ہوتا، تو وہ اپنا حکم تبدیل نہیں کرتے تھے، کیونکہ اس بات پر تمام صحابہ کا اتفاق تھا۔''

البتہ اگر اُن کے اجتہاد میں حکم صادر کرنے سے پہلے کوئی تبدیلی آتی تو وہ اپنے نئے اجتہاد ہی سے حکم دیا کرتے تھے۔

مزید یہ کہ (ایک ہی مقدمہ میں) ایک سے زیادہ قاضی نہ ہونے کی دلیل ہی اس بات کی بھی دلیل ہے کہ قاضی کا حکم تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اللہ کا حکم ایک ہی ہے نہ اُس سے زیادہ، اور یہ کہ اللہ کا حکم کسی ایک معاملہ میں جب کہ اُس پر عمل ہو جائے تو وہ نافذ ہو گیا، اب اُسے تبدیل کیا جانا صحیح نہیں رہا۔ جب ایک قاضی کسی معاملہ میں حکم صادر کرے، تو اُس نے اللہ کا حکم وضع کیا ہوتا ہے جو قابلِ تنفیذ ہے، لہٰذا اب مطلقاً اس کو منقوض (Contradict) نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس کو نقض کرنا، اللہ کے حکم کو نقض (Contradict) کرنے کے مترادف ہوگا جو کہ جائز نہیں۔ چنانچہ اسی قاضی کیلئے، یا کسی اور قاضی کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ اس فیصلہ کو تبدیل کرے، کیونکہ وہی ایک اللہ کا حکم تھا، اُس سے زیادہ نہیں۔ اس فیصلہ کو تبدیل کرنا اللہ کے حکم کو تبدیل کرنے کے

مترادف ہے جو کہ مطلقاً جائز نہیں۔

رہی بات حضرت عمرؓ کے حضرت ابوموسیٰؓ کو لکھے خط کی جس میں لکھا تھا:

(ولا يمنعك قضاء قضيته بالأمس،ثم راجعت فيه نفسك،و هديت فيه لرشدك أن ترجع إلى الحق،فإن الحق قديم،والرجوع إلى الحق خير من التمادي في الباطل)

(کوئی ایسا فیصلہ جو تم نے کل کیا ہو، پھر اُس پر نظر ثانی کرنے سے تمہیں اُس میں ہدایت ملی، تمہیں حق پر لوٹنے سے نہ روکے، کیونکہ حق کی طرف لوٹنا بہتر ہے اس سے کہ ناحق پر اڑے رہو۔)

اگر حضرت عمرؓ کے اس خط کی صحت کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ حضرت عمرؓ کی رائے ہوگی نہ کہ شرعی دلیل، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تمام صحابہ اس پر خاموش رہے چنانچہ یہ صحابہ کا اجماع ہوا، کیونکہ صحابہ کا سکوت اُسی حالت میں اجماع گردانا جائیگا جب یہ واقعہ مشہور ہوتا اور کسی ایسے معاملہ میں ہوتا جس کا تعلق عام لوگوں سے ہوتا اور جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عام معلومات میں ہوتا، یا کسی ایسے معاملہ میں ہوتا جو شرعاً ممنوع ہے کیونکہ صحابہ کسی بھی منکر پر خاموش نہیں رہتے تھے۔ لیکن یہ خط تو ایک مخصوص قاضی کیلئے تھا نہ کہ عام لوگوں کیلئے جو کہ مشہور ہوتا، حالانکہ یہ خط بعد میں بہت مشہور ہوا، لیکن بہر حال یہ کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا جو صحابہ میں عام رہا ہو اور جس پر اُن کا سکوت اُن کے اجماع پر قیاس کیا جا سکے اور نہ ہی اس میں کوئی ایسی بات تھی جو شرعاً منکر ہو۔ دوسری طرف، اس نصیحت سے درحقیقت مراد یہ تھی کہ اگر کسی معاملہ میں اپنے اجتہاد سے ایک حکم صادر کر دیا ہو اور بعد میں مطالعہ سے ہدایت ملتی ہے اور اجتہاد میں تبدیلی آتی ہے، تو یہ صحیح نہیں کہ اپنے سابقہ اجتہاد پر ہی اڑے رہو، بلکہ آئندہ کسی اور معاملہ میں اپنے نئے اجتہاد سے فیصلہ کرو، اسی لئے فرمایا: أنْ ترجع إلى الحق۔ یہ نہیں کہا کہ اپنے صادر کردہ حکم سے پھر جاؤ۔ رجوع الی الحق سے مراد اپنی پر خطاء رائے کو ترک کر کے صحیح رائے اختیار کرنے کے ہیں، لہٰذا یہ فیصلہ کو تبدیل کرنے کی کوئی دلیل نہیں ٹھہرتی اور اسی لئے اسلام میں 'سابق قضائی نظیر' (Legal Precedent) جیسی کوئی چیز نہیں، کہ کوئی سابقہ مثال کی طرح اس معاملہ میں حکم جاری کیا جائے۔ اور اگر کوئی سابقہ نظیر سامنے آتی ہو جس میں کوئی خاص حکم صادر ہوا ہو، تو یہ کسی پر لازم نہیں کہ وہ اُسی کا پابند ہو، بلکہ اگر خود اُسی قاضی کو بھی اُسی نوعیت کے معاملہ میں فیصلہ کرنا پڑے، تو یہ اس کیلئے جائز ہے کہ وہ اُس سے مختلف فیصلہ کرے۔ رہی بات اُس سابقہ مقدمہ کی، تو اُس میں اللہ کا حکم نافذ ہو چکا، اب قاضی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اِس حکم سے پھر جائے یا اُسے بدل دے۔ اس لئے اسلام میں اپیل کورٹ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ تمام عدالتیں مقدمات کی سنوائی کے اعتبار سے ایک ہی جیسی ہوتی ہیں۔ اور شرعی قاعدہ ہے کہ (الإجتهاد لا ينقض بمثله) یعنی ایک اجتہاد دوسرے اجتہاد کو منسوخ نہیں کرتا، اسی طرح ایک مجتہد کسی اور مجتہد کیلئے حجت نہیں ہوتا۔ اسلئے ایسی عدالتوں کا ہونا صحیح نہیں ہے جو دوسری عدالتوں کے فیصلوں کو منسوخ کریں۔

البتہ اگر قاضی کسی شرعی حکم کو ترک کر کے احکام کفر سے فیصلہ کرتا ہے یا اس کا کوئی حکم قرآن اور سنت کی کسی قطعی نص

کے یا اجماعِ صحابہ کے خلاف ہو، یا اُس کا کوئی فیصلہ حقیقتِ حال کے برخلاف ہو جیسے کسی شخص کو قتلِ عمد کا مرتکب قرار دیتے ہوئے قصاص کا حکم کر دے، اور پھر اصلی قاتل سامنے آ جائے، تو ایسی حالت یا ایسی حالتوں میں قاضی کا حکم تبدیل کیا جائیگا، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بخاری و مسلم شریف میں نقل ہے:

((من احدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو ردّ))

جو ہمارے معاملہ (دین) میں کوئی نئی بات ایجاد کرے جو اُس میں نہ ہو، تو وہ قابلِ ردّ ہے۔

نیز اسی طرح حضرت جابر ابن عبداللہؓ سے روایت ہے:

((أن رجلاً زنى بامرأة فأمر به النبي ﷺ فجُلِد. ثم أخبر أنه محصن،فأمر به فَرُجم))

ایک شخص نے ایک عورت سے زنا کیا تو حضور ﷺ نے اُسے کوڑے لگوائے، پھر آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ وہ شادی شدہ ہے، تو آپ ﷺ نے اُسے سنگسار کرایا۔

حضرت مالک ابن انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

(بلغني أن عثمان رضی اللہ عنہ أُتي بامرأة ولدت من ستة أشهر فأمر برجمها. فقال له علی رضی اللہ عنہ:ما عليها رجم،لأن الله تعالىٰ يقول:)

مجھے پتہ چلا کہ ایک (زانیہ) عورت کو زنا کے باعث چھ ماہ پہلے بچہ ہوا تھا، حضرت عثمان کے پاس لائی گئی، اُنہوں نے اسے سنگسار کرنے کی سزا سنائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُن سے کہا کہ اُسے سنگساری کی سزا نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

﴿وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا﴾

اور اس کے حمل کی حالت میں رہنے اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ ہے (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورۂ احقاف:۱۵)

اور

﴿وَالوالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلادَهُنَّ حَولَينِ كَامِلَينِ لِمَن أَرَادَ أَن يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾

اور جو کوئی پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے تو مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم سورہ بقر:۲۳۳)

(فالحمل يكون ستة أشهر،فلا رجم عليها فأمر عثمان بردها،فوجدها قد رجمت)

لہٰذا اسے سنگسار نہیں کیا جائیگا، حضرت عثمانؓ نے حکم دیا کہ عورت کو واپس بلایا جائے لیکن خبر آئی کہ اُسے سنگسار کیا جا چکا ہے۔

عبدالرزاق امام الثوری کے بارے میں بتاتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

اگر قاضی کتاب اللہ، سنتِ رسول یا کسی ایسی چیز کے خلاف فیصلہ دے جس پر (صحابہ کا) اجماع ہے، تو دوسرا قاضی

اسے تبدیل کر دے۔

اور وہ قاضی جسے کسی قاضی کے فیصلے تبدیل کرنے کا (مندرجہ بالا حالات میں) اختیار ہے، وہ قاضی مظالم ہے۔

محتسب (قاضیٔ حسبہ)

محتسب وہ قاضی ہوتا ہے جسے تمام اُن امور میں فیصلے کرنے کا اختیار ہو جو حقوق عام سے متعلق ہوں، اس میں کوئی مدعی نہیں ہوتا، اور یہ معاملات حدود اور تعزیرات (Penal Offences) کے دائرہ سے باہر کے ہوتے ہیں۔

یہ محتسب یا قاضی حسبہ کی تعریف ہے جو بھیگے ہوئے اناج والی حدیث سے ماخوذ ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیگے ہوئے (غذاء) یا دانے کو اوپر رکھنے کا حکم دیا تاکہ لوگ اُسے دیکھ سکیں۔ یہ حقوق عام کا معاملہ تھا جس میں حضور ﷺ نے حکم دیا کہ نَم یا بھیگے ہوئے حصہ کو اوپر رکھا جائے جس سے لوگوں کو دھوکہ نہ ہو۔ اس میں وہ تمام حقوق شامل ہیں جو اس نوعیت کے ہیں، البتہ اس میں حدود اور تعزیرات کے معاملات شامل نہیں ہوتے، کیونکہ وہ اس نوعیت کے نہیں ہوتے اور وہ درحقیقت لوگوں کے آپسی تنازعہ کے معاملات ہوتے ہیں۔

قاضیٔ حسبہ کے اختیارات:

قاضی حسبہ کسی بھی معاملہ میں، جو اُس کے دائرہ اختیار میں آتا ہو حکم جاری کرتا ہے، اس کے لئے کسی باقاعدہ عدالت ہی میں حکم جاری کرنا ضروری نہیں۔ قاضی حسبہ کے تصرف میں پولیس کا عملہ ہوتا ہے جو اسکے احکامات کو فوراً نافذ کرتا ہے۔

کسی معاملہ میں سنوائی کرنے کیلئے محتسب کو عدالتی مجلس کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ واقعہ کی خبر ملتے ہی وہ حکم جاری کر سکتا ہے، خواہ کوئی جگہ ہو یا کوئی بھی وقت ہو؛ بازار ہو گھر ہو، گھوڑے پر سوار ہو یا موٹر کار میں ہو، رات ہو یا دن ہو۔ دیگر قاضیوں کیلئے جس طرح عدالت ہی میں کارروائی ہونے کی شرط ہے وہ قاضیٔ حسبہ پر منطبق نہیں ہوتی، کیونکہ جس حدیث میں عدالت اور فریقین کی موجودگی ضروری قرار دی گئی ہے، اس کے بقول:

((قضى رسول اللهؐ أن الخصمين يقعدان بين يدي الحاكم))

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ دونوں فریق قاضی کے سامنے بیٹھیں۔ (مسند احمد و سنن ابوداؤد)

((إذا جلس إليك الخصمان))

جب تمہارے سامنے دو فریق بیٹھیں.....۔

یہ شرائط محتسب یا قاضیٔ حسبہ پر منطبق نہیں ہوتیں، کیونکہ حسبہ میں مدعی اور مدعا علیہ نہیں ہوتا، صرف ایک حق عام ہوتا ہے جسے نقصان پہنچا ہو، یا کوئی شرعی خلاف ورزی سرزد ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیگے ہوئے اناج والے معاملہ میں حکم جاری کیا تو آپ ﷺ بازار میں گشت پر تھے اور سامان نظر کے سامنے تھا۔ آپ ﷺ نے اُس دوکان دار کو

طلب نہیں فرمایا، بلکہ وہیں موقع واردات پر ہی حکم جاری فرمایا جو اس بات کی دلیل ہے کہ محتسب کو خود کسی معاملہ کی سنوائی کیلئے مخصوص عدالتی مجلس کا ہونا ضروری نہیں۔

محتسب کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے نائب منتخب کرے جن میں وہ شرائط موجود ہوں جو ایک محتسب کیلئے ہیں۔ محتسب اُنہیں مختلف علاقوں کیلئے مقرر کرسکتا ہے۔ یہ قاضیان اپنے لئے مقررہ علاقوں میں اور اُن مقررہ معاملات میں حسبہ کی ذمہ داریاں ادا کر سکتے ہیں۔ البتہ محتسب کا یہ اختیار اِس بات پر موقوف ہے کہ خلیفہ نے خود اُس محتسب کو مقرر کرتے وقت اُسے اور قاضیوں کی تقرری کا اختیار دیا تھا یا نہیں۔ لیکن اگر اس محتسب کی تقرری خلیفہ کے بجائے قاضی القضاۃ نے کی ہو تو ان شروط کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ خود قاضی القضاۃ کی تقرری میں حق استخلاف شامل ہو۔ یعنی یہ اختیار شامل ہو کہ قاضی القضاۃ جن قاضیوں کو مقرر کرے، وہ قاضی بھی مزید قاضیوں کو مقرر کرنے کے اہل ہوں۔ لیکن اگر قاضی القضاۃ کے تعین میں یہ اختیار شامل نہیں کیا گیا ہو، تو پھر وہ بھی جس کسی کو متعین کرے اُسے مزید تقرریاں کرنے کا اختیار نہیں دے سکتا۔ لہٰذا اس صورت میں محتسب کو بھی حق استخلاف نہیں ہوگا۔ چنانچہ حق استخلاف، خواہ وہ محتسب کیلئے ہو، قاضی کیلئے ہو یا قاضیٔ مظالم کیلئے ہو، اس ہی شکل میں ہوسکتا ہے جب یہ حق خلیفہ کی جانب سے تعین کرتے وقت دیا گیا ہو، یا قاضی القضاۃ کو تعین کرتے وقت یہ اختیار دیا گیا ہو کہ وہ جسے متعین کرینگے اُنہیں بھی حق استخلاف ہوگا۔ ایسا اسلئے ہے کہ قاضی کو قضاء کیلئے، یعنی حسبہ کیلئے متعین کیا گیا ہے، اگر اُسے یہ اختیار نہیں دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مزید نمائندے مقرر کرے، تو پھر وہ کسی کی تقرری نہیں کرسکتا۔ یہ بات قاضی اور قاضیٔ مظالم دونوں کیلئے ہے کیونکہ دونوں مخصوص شرائط پر مقرر کئے گئے ہیں۔ لہٰذا اُنہیں مزید تقرریاں کرنے کا اختیار نہیں ہوگا جب تک کہ خود اُن کی تقرری میں یہ بات شامل نہ ہو۔ چنانچہ وہ کسی کو حسبہ کے کام کیلئے بھی مقرر نہیں کر سکتے، جب تک کہ خود اُن کی اپنی تقرری میں اُنہیں اس کا اختیار حاصل نہ ہو۔ یہی بات قاضی القضاۃ کیلئے بھی ہوگی۔ قاضی کیلئے اپنا نائب مقرر کرنے کے جواز کی دلیل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ہے۔ آپ ﷺ کے پاس ایک معاملہ لایا گیا تو آپ ﷺ نے ایک شخص کو اپنا نائب مقرر فرما کر بھیجا۔ ایک اعرابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے بیٹے کے بارے میں حکم کی درخواست کی جو ایک شخص کے گھر ملازم تھا اور وہ اس کی بیوی کے ساتھ زنا کر بیٹھا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((واغد يا أُنيس ألى امراة هذا فإن اعترفت فارجمها.....))

اے اُنیس رضی اللہ عنہ اُس عورت کے پاس جاؤ اور اگر وہ جرم قبول کرلے تو اُسے سنگسار کردو۔

(بخاری و مسلم شریف: راوی حضرت ابوہریرہؓ اور زید بن خالد الجہنی)

اس سے یہ ثابت ہوا کہ قاضی کو اختیار ہے کہ وہ ایک شخص کو اپنا نائب مقرر کرے جو اس مقررہ معاملہ میں حکم دے، یہی بات محتسب کیلئے بھی ہے کیونکہ وہ بھی قاضی ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ قاضی کسی کو مقدمہ کے سننے اور اس پر حکم جاری

کرنے کیلئے اپنا نائب مقرر کرے تب ہی اُس نائب کی تقرری صحیح ہوگی۔ قضاء کیونکہ شرعی حکم کی خبر ہے جو قابلِ تنفیذ ہے، چنانچہ اس معنوں میں اسے منقسم نہیں کیا جاسکتا کہ مقرر کردہ شخص صرف معاملہ کی تفتیش کرے حکم جاری نہ کرے، بلکہ اس کی تقرری کامل ہونا چاہئے، تاکہ اس کا جاری کردہ حکم صحیح ہو، بھلے ہی وہ پھر حکم جاری نہ کرے؛ کیونکہ بہرحال یہ شرط نہیں ہے، بلکہ یہ جائز ہے کہ وہ معاملہ کو سنے، تفتیش کرے، اور قضیہ مکمل ہونے سے پہلے معزول کر دیا جائے، پھر اس کی جگہ دوسرا قاضی اُس معاملہ میں حکم جاری کرے۔ اسی طرح قاضی کے نائب کیلئے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ حکم جاری ہی کرے، صرف یہ ضروری ہے کہ اس کے متعین کئے جانے میں مقدمہ کے سننے اور حکم جاری کرنے کا اختیار شامل ہو۔ یعنی نائب کی تقرری میں قاضی کے پورے اختیارات ہونا شرط ہے۔ اسی طرح محتسب کے نائب یا نائبین جو مقرر کئے جائیں، اُن کو جس کام کیلئے مقرر کیا جارہا ہو، یعنی حسبہ کیلئے، یا جس علاقہ کیلئے وہ مقرر کئے جارہے ہوں، اُس میں معاملہ کو سننے اور حکم جاری کرنے کا مکمل اختیار ہونا چاہئے، یعنی اگر مقرر کرنے والے قاضی کی تقرری میں مزید تقرریاں کرنے کا اختیار شامل ہے۔ مقرر کئے جانے والے شخص کیلئے شرط ہے کہ وہ مسلم، آزاد، عادل، بالغ اور جن معاملات کیلئے مقرر کیا جارہا ہو، اُن میں فقیہہ ہو۔ بالفاظِ دیگر محتسب کے نائب میں اُن تمام شرطوں کا ہونا ضروری ہے، جو محتسب کیلئے ہیں کیونکہ نائب بھی محتسب کی طرح ہی قاضی ہوتا ہے۔

قاضیٔ مظالم:

قاضیٔ مظالم وہ قاضی ہوتا ہے جس کو ریاست میں ہونے والے ہر مظلمہ یا ریاست کی طرف سے ریاست میں رہنے والے ہر شخص پر ہونے والے مظلمہ کو رفع کیلئے متعین کیا جائے، خواہ وہ اُس ریاست کا شہری ہو یا نہ ہو، خواہ مظلمہ کا ذمہ دار خلیفہ ہو یا ریاست کا کوئی اور حاکم یا ملازم۔

قاضیٔ مظالم کی یہ تعریف ٹھہری، قضاء مظالم کی حقیقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت حضرت انسؓ کی حدیث سے واضح ہوتی ہے کہ حاکم کے ذریعہ کسی ناحق امر سے عوام کو ضرر پہنچنے کا نام مظلمہ ہے حضرت انسؓ نے فرمایا:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں ایک بار اشیاء کی قیمتوں میں گرانی آ گئی تو لوگوں نے آپ ﷺ سے کہا کہ "اے اللہ کے رسول ﷺ آپ قیمتیں مقرر فرما دیجئے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إن الله هو الخالق القابض الباسط الرازق المسعر، و إني لأرجو أن ألقى الله ولا يطلبي أحد بمظلمة ظلمتها إياه في دمٍ ولا مال))

بیشک اللہ ہی خالق، قابض باسط رازق اور مسعر (قیمتیں طے کرنے والا) ہے میں یہ امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملوں کہ مجھ سے کوئی کسی مظلمہ کا مطالبہ نہ کرے، خواہ جان کا یا مال کا۔ (مسند احمد)

لہٰذا آپ ﷺ نے قیمتوں کے (صاحبِ مال کے بجائے کسی اور کی جانب سے) طے کرنے کو مظلمہ قرار دیا، یعنی اگر

آپ ﷺ قیمتوں کو مقرر کر دیتے تو یہ ایسا فعل ہوتا جس کا آپ ﷺ کو حق نہ تھا۔اسی طرح آپ ﷺ نے وہ حقوقِ عام جنہیں ریاست منظّم کرتی ہے،اُن میں تنازعہ کو مظلمہ قرار دیا،مثلاً زراعتی زمین کی مشترکہ پانی سے باری باری آبپاشی۔حضور ﷺ نے حضرت زبیر بن العوامؓ اور ایک انصاری کے درمیان زمین کی آبپاشی کے تنازعہ میں سنوائی کی اور حضرت زبیرؓ سے فرمایا:

((اسقِ يا زبير ثم أرسل الماء إلى جارك))

اے زبیرؓ پہلے تم (اپنی زمین کو) پانی دو پھر (پانی) اپنے پڑوسی کی طرف جانے دو۔(متفق علیہ)

لہٰذا کوئی بھی مظلمہ،کسی بھی شخص کو پیش آئے،خواہ حاکم کی طرف سے یا ریاست کے کسی محکمہ کی جانب سے یا پھر حکومت کے کسی بھی حکم سے،وہ مظلمہ کی تعریف میں آتا ہے اور خلیفہ یا اس کے مقرر کردہ قاضیٔ مظالم کے سامنے فیصلہ کیلئے پیش ہوتا ہے۔

قاضیٔ مظالم کا تقرر اور معزولی:

قاضیٔ مظالم کو خلیفہ یا قاضی القضاۃ متعین کرتے ہیں۔لیکن قاضیٔ مظالم کی معزولی،اس کا محاسبہ،تنبیہ وسرزنش اور تبادلہ خلیفہ ہی کر سکتا ہے۔البتہ اگر خلیفہ محکمہ مظالم کو یہ اختیارات دیدے،تو محکمہ مظالم بھی اِنہیں انجام دے سکتا ہے۔بہرحال یہ اختیار صرف خلیفہ ہی کے ہیں۔نیز یہ کہ مظالم قضاء کا جزو ہیں کیونکہ یہ بھی وہ حکم شرعی ہے جو قابلِ تنفیذ ہے۔قاضی کا تعین خلیفہ ہی کا اختیار ہے اور یہ بات حضور ﷺ کے عمل سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ ہی قاضیوں کا تقرر فرمایا کرتے تھے۔اس سب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خلیفہ ہی قاضیٔ مظالم کا تقرر کرتا ہے یا قاضی القضاۃ کر سکتا ہے اگر خلیفہ نے اُسے متعین کرتے وقت یہ اختیار دیا ہو۔

جہاں تک قاضی مظالم کی معزولی کا سوال ہے،تو یہ اختیار صرف خلیفہ کو ہے جس طرح اُسے ہی تقرری کا حق ہے۔البتہ خلیفہ قاضیٔ مظالم کو ایسے وقت معزول نہیں کر سکتا جب قاضیٔ مظالم کے سامنے خلیفہ،معاونین تفویض یا قاضی القضاۃ کے خلاف کوئی مقدمہ زیرِ سماعت ہو،کیونکہ جو شئے حرام کیلئے وسیلہ بنتی ہو وہ خود حرام ہو جاتی ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود مظالم کے معاملے دیکھا کرتے تھے اور آپ ﷺ سے مظالم کیلئے کسی کو مقرر کیا جانا روایت نہیں ہے،اسی طرح چاروں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے بھی مظالم کے معاملات کیلئے کسی شخص خاص کو مقرر نہیں فرمایا،حضرت علیؓ خود ہی مظالم کے معاملات سنا کرتے تھے اور اُنہوں نے کئی مظالم کے معاملات پر حکم جاری کیا۔جب عبدالملک ابن مروان خلیفہ ہوئے تو اُنہوں نے ایک دن مظالم کیلئے مختص کر لیا تھا جس میں وہ مظلومین کے معاملات کا تسویہ کیا کرتے تھے جس میں معاملہ کی تفتیش شامل نہیں ہوتی تھی۔اگر اُنہیں کوئی مشکل پیش آجاتی تو وہ معاملہ کو اپنے قاضی ابوادریس الازدی کے سپرد کر دیتے جو اُس میں قابلِ تنفیذ حکم جاری کرتے تھے،جو اُن کے قاضی تھے اور مظالم کے معاملات جو خلیفہ ان کے سپرد کرتے تھے،اُن میں فیصلے کرتے تھے۔پھر حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ جب خلیفہ ہوئے تو وہ مظالم کے معاملات خود ہی سماعت کرتے اور حکم جاری کیا کرتے تھے،اُنہوں نے بنوامیہ

کے مظالم کی روک تھام کی۔ بنوعباس کی خلافت کے وسط میں خلفاء بنوعباس مظالم کے معاملات ایک مخصوص قاضیٔ مظالم کے سپرد کرنے لگے۔ اس کے بعد سے قاضیٔ مظالم کا خلیفہ سے علیحدہ مستقل عہدہ ہو گیا، جو اس وقت تک خلیفہ ہی کے ذمہ تھا۔ لہٰذا خلیفہ کو مظالم کے معاملات سننے کا اختیار ہے اور یہ بھی اختیار ہے کہ وہ مظالم کے لئے علیحدہ قاضی مقرر کرے۔ خلیفہ ایک قاضی کو معزول کر کے دوسرا قاضیٔ مظالم بھی مقرر کر سکتا ہے، یہ اسکی صوابدید پر منحصر ہے۔

مزید یہ کہ خلیفہ ہی قاضیٔ مظالم کا محاسبہ، تنبیہ و سرزنش کرتا ہے اور خلیفہ ہی اسے معزول کر سکتا ہے کیونکہ دراصل خلیفہ ہی مظالم کے ازالہ کا اور قاضیٔ مظالم کا مسئول ہوتا ہے جو اس کی نیابت میں مظالم کے معاملات رفع کرتا ہے۔ خلیفہ کو یہ اختیار بھی ہوتا ہے کہ وہ قاضیٔ مظالم یا قاضی القضاۃ کو یہ اختیار سپرد کر دے جس سے وہ مظالم کے قاضیوں کا محاسبہ، ان کی سرزنش اور انہیں معزول کر سکیں۔

یہ ضروری نہیں کہ مظالم کے قاضیوں کی تعداد ایک ہی تک محدود ہے، خلیفہ اپنی صوابدید پر مظالم کے ازالہ کیلئے جس قدر تعداد ضروری سمجھے قاضیانِ مظالم مقرر کر سکتا ہے۔ البتہ فیصلہ کا اختیار ایک ہی قاضی کو ہو سکتا ہے، باقی قاضی عدالت میں رہ کر اپنی رائے دے سکتے جنہیں قاضی مظالم منظور کرنے کا پابند نہیں۔

اس کا سبب یہ ہے کہ خلیفہ کو اپنا ایک یا ایک سے زیادہ نمائندہ منتخب کرنے کا اختیار ہوتا ہے، البتہ گو کہ قاضیانِ مظالم کی تعداد ایک سے زیادہ ہو سکتی ہے، لیکن اُن کا اختیار اور یہ ذمہ داریاں منقسم نہیں ہوتیں، بلکہ یہ سب کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ خلیفہ کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ یا تو ایک قاضیٔ مظالم کو کسی مخصوص ولایت تک یا کسی ایک نوعیت یا بعض انواع کے مظالم تک محدود کر دے، کیونکہ خلیفہ کو ولایت عامہ یا ولایتِ خاصہ اور مکمل ریاست کی مجموعی ولایت دینے کا بھی اختیار ہے۔ قاضیٔ مظالم جب کسی معاملہ کی سنوائی کرے تو وہ خود اکیلا ہی کر سکتا ہے جیسا کہ ذکر ہوا کہ ایک مقدمہ میں ایک سے زیادہ قاضی نہیں ہو سکتے، گو کہ ایک مقام پر ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ جائز ہے کہ باقی قاضیٔ مظالم عدالت میں ساتھ بیٹھیں لیکن محض رائے کیلئے، گو کہ اُن کی رائے قبول کرنے کا قاضیٔ مظالم پابند نہیں۔ اُن قاضیان کی عدالت میں موجودگی بھی قاضی مظالم کے اختیار کا معاملہ ہے، اگر وہ اُن کا بیٹھنا مناسب نہ سمجھے اور مخالفت کرے تو باقی قاضیانِ مظالم عدالت میں نہیں بیٹھ سکتے، کیونکہ کوئی ایسا شخص عدالت میں نہیں بیٹھ سکتا جس سے قاضی کی توجہ اس معاملہ سے منتشر ہو جو اس کے زیرِ غور ہے۔ قاضی مظالم عدالت کی مجلس کے اختتام پر اُن قاضیوں سے مشورہ کر سکتا ہے۔

قاضیٔ مظالم کے اختیارات:

قاضیٔ مظالم کو ریاست کے کسی بھی حاکم یا ملازم کو برخواست کرنے کا، نیز خلیفہ کو معزول کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔

قاضی مُظالم کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ حکام کو برخواست کردے۔حاکم کی تقرری عقدتعین سے عمل میں آتی ہے کیونکہ خلیفہ کواپنی ولایت میں یعنی حکومت میں یہ حق ہوتا ہے کہ وہ کسی کواس امر میں اپنا نمائندہ مقرر کرے جو کہ مخصوص الفاظ کی ادائیگی سے مکمل ہوتا ہے،لہٰذا کسی حاکم کا معزول کیا جانا اُس عقدتعین کومنسوخ کرنے کے مترادف ہوتا ہے، جو کہ خلیفہ کا مطلق اختیار ہے کیونکہ حضور ﷺ نے،اور آپ ﷺ کے بعد خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے والیوں کومقرر اور معزول فرمایا ہے۔محکمہ مُظالم کو حکام کے برخواست کرنے کا اختیار بحیثیت نائب خلیفہ نہیں ہوتا، کیونکہ محکمہ مظالم ،تقرری اور معزولی میں خلیفہ کی نیابت نہیں کرتا بلکہ مظلمہ کے ازالہ میں خلیفہ کی نیابت کرتا ہے۔لہٰذا اگر کسی والی یا حاکم کی اُس ولایت میں موجودگی مظلمہ کا باعث ہو،تو محکمہ مظالم کا اختیار یہ ہے کہ وہ اس مظلمہ کو رفع کرے جو کہ ادراصل اُس حاکم کو برخواست کرنے کے ہم معنی ہے۔چنانچہ محکمہ مُظالم کا اُس حاکم کو برخواست کرنا خلیفہ کے اختیارات کی نیابت سے نہیں محض مظلمہ کے رفع کرنے سے عمل میں آتا ہے۔اس لئے محکمہ مُظالم جس کسی کے بارے میں معزولی کا حکم دے وہ برخواست ہوجاتا ہے خواہ وہ خلیفہ ہی ہو، کیونکہ یہ دراصل مظلمہ کے ازالہ کا حکم ہوتا جو خلیفہ اور دیگر حکام وملازمین سب پر نافذ ہوتا ہے۔قاضی مُظالم کا مظلمہ کے ازالہ کا حکم اگر خلیفہ کیلئے ہو،تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ خلیفہ اُس حالت میں ہے جہاں اُس کا معزول کیا جانا واجب ہوا، کیونکہ اُس کا قائم رہنا مظلمہ کا باعث ہے اور محکمہ مُظالم کو مظلمہ رفع کرنے کا اختیار ہے، چنانچہ اُس نے معزولی کا حکم جاری کیا۔لہٰذا محکمہ مظالم کا خلیفہ کو معزول کرنے کا حکم فی الحقیقت مظلمہ کے ازالہ کا حکم تعبیر کیا جائیگا۔

محکمہ مُظالم کو کسی بھی مظلمہ کے معاملہ میں سنوائی کا اختیار ہوتا ہے،خواہ وہ مظلمہ ریاست کے مختلف محکموں کے ملازمین سے متعلق ہو،یا خلیفہ کے ذریعہ کسی حکم شرعی کی مخالفت سے جڑا ہو یا دستور میں کسی نص شرعی کے بابت ہو،یا خلیفہ کے ذریعہ تبنی کئے ہوئے کسی حکم شرعی سے وابستہ ہو یا پھر کسی ٹیکس کے عائد کئے جانے کے متعلق ہو،یا کسی اور دیگر امور سے جڑا ہو۔

اس کا سبب یہ ہے کہ جب مدینہ میں اشیاء کی قیمتوں میں گرانی واقع ہوئی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس معاملہ میں مداخلت کرکے قیمتوں کو متعین کرنے کی درخواست کی تو آپ ﷺ نے انکار کردیا،اور اس عمل کو آپ ﷺ نے ایک مظلمہ سے تعبیر فرمایا۔اسی طرح آپ ﷺ نے حاکم کے ذریعہ لوگوں کو اپنی زمین کیلئے اس طرح باری باری آبپاشی کو بھی مظلمہ قرار دیا جو کہ ناحق ہو۔اس سے ثابت ہوا کہ اگر حاکم حق کے خلاف جائے یا احکام شرع کی خلاف ورزی کرے تو یہ بھی مظلمہ میں شمار ہوگا۔اُس وقت آپ ﷺ بذاتِ خود مسلمانوں کے حاکم اور اُن کی ریاست کے امیر تھے۔

اسی طرح حکومت کے کسی بھی ادارے کے کسی بھی ملازم یا حاکم کے ذریعہ کیا گیا کوئی بھی عمل،اگر حق کے یا کسی شرعی حکم کے خلاف ہے تو وہ مظلمہ کے ذیل میں آتا ہے کیونکہ وہ شخص اُس کام میں جو اس کے سپرد تھا خلیفہ کے نائب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمتوں کے تعین والی حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ خلیفہ کے ذریعہ کی گئی کوئی بھی حق یا حکم شرعی کی خلاف ورزی

مظلمہ سے تعبیر ہوتی ہے اور یہ کہ محکمہ مُظالم کو مظالم کے معاملہ میں سنوائی کا اختیار ہے۔

رہی بات دستور یا قانون کی نص کے معاملات کی، تو یہ اقتدار کا امر ہے، اور اس میں سنوائی، خلیفہ کے عمل کے جانچنے کے ہم معنی ہے چنانچہ یہ بھی اُسی حدیث کے ضمن میں آتی ہے۔ مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَإِم تَنَازَعْتُمْ فِي شَئيٍ فَرُدُّ وهُ إلى اللهِ و الرَّسولِ﴾

پھر اگر کسی چیز میں تمہارا جھگڑا ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ (ترجمہ معانیٔ قرآن: سورۂ نساء آیت: ۵۹)

یعنی اگر عوام اور اولی الامر میں کسی بات پر یا کسی قانون کی دفع میں تنازعہ واقع ہو جائے، تو اُسے اللہ اور اللہ کے رسول کے سپرد کر دیا جائے یعنی محکمہ مُظالم کے سپرد تاکہ اس تنازعہ میں محکمہ مُظالم اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کرے۔

ٹیکسوں کے متعلق تنازعہ کے معاملات میں قاضیٔ مُظالم کے اختیارات میں آنے کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ملتی ہے:

((و إني لأرجو أن ألقى الله،ولا يطلبنى أحد بمظلمة ظلمتها إياه فى دم ولا مال))

میں یہ امید کرتا ہوں کہ اللہ ﷻ سے اس حال میں ملوں کہ مجھ سے کسی مظلمہ کا مطالبہ نہ ہو، خواہ جان کا ہو یا مال کا۔ (مسند احمد)

لہٰذا خلیفہ کے ذریعہ رعایا سے ناحق وصول کیا گیا مال مظلمہ شمار کیا جائیگا، ایسا مال رعایا سے وصول کرنا جسے شریعت نے واجب نہیں بتایا ہے مظلمہ ہوگا، چنانچہ محکمہ مُظالم کے یہ ذمہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے ٹیکسوں کے معاملات کو دیکھے کیونکہ یہ رعایا سے وصول کیا گیا مال ہے۔ ٹیکسوں کے معاملات کی دیکھ بھال محکمہ مُظالم اس نظریہ سے کرتا ہے کہ آیا یہ ٹیکس شرعاً واجب ہے یا نہیں مثلاً غریبوں کو غذا بہم پہنچانے کے مقصد سے جو کہ جائز ہوگا اور مظلمہ کی تعریف میں نہیں آئیگا، یا پھر کسی ایسے باندھ کی تعمیر کیلئے جو غیر ضروری ہو جو کہ ناجائز ہوگا اور مظلمہ کے ذیل میں آجائیگا جس کا ازالہ کیا جائیگا۔ اس غرض سے محکمہ مُظالم کو ٹیکسوں کے بھی معاملات کو دیکھنے کا اختیار ہوتا ہے۔

کسی بھی مظلمہ کے متعلق خواہ وہ حکومتی اداروں سے وابستہ اشخاص سے ہو، خلیفہ کی جانب سے کسی حکم شرعی کی خلاف ورزی ہو، کسی دستوری یا قانونی دفع یا خلیفہ کے تبنی شدہ احکام کے بابت ہو، یا ٹیکسوں کے عائد کرنے سے متعلق ہو، یا حکومت کے جور و ظلم کا قضیہ ہو، رعایا کا مال حکومت کے ناحق چھیننے کی بات ہو، ملازمین اور فوجی سپاہیوں کی تنخواہیں کم کرنے یا تنخواہیں ادا کرنے میں تاخیر سے متعلق ہو اِن سب معاملات میں محکمہ مُظالم کو جانچ کرنے کا اختیار ہوتا ہے اور محکمہ مُظالم کیلئے یہ ضروری نہیں کہ اِن معاملات کو وہ کسی مدعی کے ذریعہ پیش کئے جانے پر ہی اُن میں غور کرے یا اُن میں مدعا علیہ کی پیشی لازم ہو۔ محکمہ مُظالم اِن معاملات اور اِن جیسے معاملات میں بغیر کسی شکایت کے (Suo moto) غور کر سکتا ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ مقدمات کیلئے عدالتی مجلس ہونے کی جو شرط ہے وہ مظالم کی عدالت پر منطبق نہیں ہوتی کیونکہ

یہاں کسی مدعی کی موجودگی ضروری نہیں ہوتی، عدالتِ مظالم بغیر کسی مدعی کے کسی بھی مظلمہ پر غور کرسکتی ہے اور نہ ہی یہاں مدعا علیہ کو پیش ہونا ضروری ہے جب کہ عدالت مظلمہ کی تفتیش کر رہی ہو، چنانچہ باقاعدہ مجلس منعقد کرنے کی ضرورت کی دلیل مظالم کی عدالت پر منطبق نہیں ہوتی، جس کے متعلق حضور ﷺ سے مروی احادیث ((قضى رسول اللهؐ أن الخصمين يقعدان بين يدي الحاكم)) اور ((إذا جلس إليك الخصمان)) اوپر گزریں۔ لہٰذا محکمۂ مظالم کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ جیسے ہی کوئی مظلمہ واقع ہو، وہ وقت، جگہ اور باقاعدہ مجلس ہونے کی شرط کے بغیر اس پر غور کرے۔ محکمۂ مظالم کے اختیارات اسے عظمت و ہیبت کے لحاظ سے ایک خاص مقام پر کھڑا کر دیتے ہیں۔ مصر و شام میں سلاطین کے عہد میں جب سلطانوں کے دربار میں مظالم کے معاملات سنے جاتے تھے، تو اس کا نام دار العدل تھا جہاں سلطان کے نمائندے اُن کی نمائندگی کرتے تھے، اور فقہا اور قاضیان موجود رہا کرتے تھے۔ المقریزی اپنی کتاب 'السلوك إلى معرفة دول الملوك' میں لکھتے ہیں کہ سلطان الملک الصالح ایوب نے دار العدل میں مظالم کے ازالہ کیلئے اپنا نمائندہ مقرر کر رکھا تھا، جہاں قاضیان، فقہا اور گواہ موجود ہوتے تھے۔ محکمۂ مظالم کیلئے ایسی عالیشان امارت کی تعمیر کرانے میں جس سے اس محکمہ کی عظمت ظاہر ہو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ یہ امورِ مباح سے متعلق ہے۔

انتظامی ادارے

ریاست کے معاملات اور عوام کے مفاد کے انتظام مختلف محکمات اور اداروں کے ذمہ ہوتے ہیں جو ان کاموں کو بخوبی انجام دیتے ہیں۔ایک ہی نوعیت کے کام کیلئے ایک مدیر عام (Director General) ہوتا ہے اور اس کے تحت مختلف کاموں کیلئے علیحدہ ادارے ہوتے ہیں جن کا ایک مدیر (Director) ہوتا ہے جو اس کام کا براہ راست ذمہ دار ہوتا ہے۔ایسے تمام مدراء (Directors) ایک اعلیٰ افسر کو اپنے کام کے اعتبار سے جوابدہ ہوتے ہیں جس کے سپرد اس نوعیت کے کام ہوں، اور ساتھ ہی والی اور عامل کے سامنے بھی احکام اور عمومی نظام کے تقید کے لحاظ سے جوابدہ ہوتے ہیں۔

انتظامی ادارے اسلوب کے ذیل میں آتے ہیں، حاکم نہیں ہوتے:

انتظامی ادارے افعال کی انجام دہی کیلئے اسلوب (Style) یا وسیلہ ہوتے ہیں۔ان کیلئے کسی مخصوص دلیل کی ضرورت نہیں بلکہ ان کے وجود کیلئے عام دلیل کافی ہے۔یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انسانوں کے کام ہیں چنانچہ انہیں مخصوص احکام شرعی کے تابع ہونا چاہئے کیونکہ ان کیلئے شرعی دلیل عمومی نوعیت کی ہے۔اس میں وہ تمام افعال شامل ہیں جو اصل کام کی شاخیں ہیں، البتہ اگر کوئی ایسی دلیل ہو جو اُن میں سے کسی پر بالخصوص منطبق ہوتی ہو، تو پھر وہ کام اُس مخصوص دلیل کے ضمن میں آئیگا۔مثلاً اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

﴿وَ ءَ اتُوا الزَّكَاةَ﴾

اور زکوٰۃ دیں (ترجمہ معانی قرآن کریم: سورۂ توبہ آیت:۱۱)

یہ آیت زکوٰۃ کیلئے عام دلیل ہے، جبکہ اس سے متعلق تفصیلی احکام کی دلیل، مثلاً زکوٰۃ کی مقدار، زکوٰۃ جمع کرنے والے عاملین، جن چیزوں پر زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے وغیرہ اصل زکوٰۃ کی تفصیل ہیں جن کی دلیل علیحدہ نہیں بلکہ اسی آیت کے ذیل میں آئی ہے۔یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ زکوٰۃ کس طرح جمع کی جائے، زکوٰۃ جمع کرنے والے زکوٰۃ لینے پیدل جائیں یا سواری پر، وہ اپنی مدد کیلئے اور لوگوں کی خدمات لیں یا نہ لیں، وہ ان کا حساب مخصوص رجسٹروں میں کریں یا نہ کریں، اس کام کیلئے علیحدہ دفتر ہو جس میں زکوٰۃ جمع کرنے والے ساتھ بیٹھیں یا نہیں، وہ اس مال کو جمع کرنے کیلئے ایک خاص مخزن (Warehouse) رکھیں یا نہ رکھیں، یہ مخازن زیر زمین ہوں یا کھلیہانوں کی طرح، یا زکوٰۃ تھیلوں میں جمع کی جائے یا صندوقوں میں۔یہ تمام کام ایک ہی اصل کام کی متفرق شاخیں ہیں جو اس آیت کے ذیل میں آیا ہے اور ان تمام کاموں کی دلیل اُسی عام دلیل کے ذیل میں آتی ہے۔یہی مثال تمام افعال کی ہے جو حکومتی انتظام کے ذیل میں آتے ہیں۔لہٰذا اسالیب اُسی اصل کام کی مختلف شاخیں ہیں اور ان کی دلیل اسی اصل کام کی دلیل کے ضمن میں آتی ہے اور تمام اسالیب پر منطبق ہوتی ہے۔

انتظامیہ کا قیام یعنی اُن لوگوں کا قیام جو عوام کے معاملات پر، جن کے انتظام کی ضرورت ہے مقرر کئے جائیں تو یہ اصل کام کے ذیل میں آتے ہیں نہ کہ اُن کی تفصیل کے ضمن میں، چنانچہ ان کیلئے مستقل دلیل کی ضرورت ہوگی جو کہ حضور صلی

اللہ علیہ وسلم کے افعال سے ماخوذ ہے حضور ﷺ حکومت بھی کرتے تھے اور اس کا انتظام بھی سنبھالتے تھے، آپ ﷺ مبلغ بھی تھے، احکام کی تنفیذ بھی کیا کرتے تھے اور مسلمانوں کے مفادات کی دیکھ بھال بھی۔ آپ ﷺ کی تبلیغ معروف ہے اور محتاج بیان نہیں۔ رہی بات تنفیذ کی، تو آپ ﷺ کو وحی کے ذریعہ صدقات وصول کرنے کا حکم ملا جو کہ تنفیذ سے متعلق ہے، یا چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم ملا، یہ بھی تنفیذ سے متعلق ہے، زانی کو سنگسار کرنے کا حکم ملا، وہ بھی تنفیذ کے ذیل میں آتا ہے، یا قذف کی سزا کے طور پر کوڑے مارے جانے کا حکم ملا، دشمن کو قتل کرنے کا حکم ملا، یہ سب تنفیذ سے متعلق ہیں۔ آپ ﷺ مورتیوں کو منہدم کر دیتے تھے، یہ بھی تنفیذ ہوئی، یا لوگوں کو بھیج کر مورتیاں ہٹوا دیتے تھے، یہ بھی تنفیذ ہے۔ یا جنگ میں قتال کرنا اور قیدیوں کو پکڑنا، یا لوگوں کو عدل کا حکم دینا اور عدل کو قائم کرنا، خطا کار کو سزا دینا، لوگوں کو ہر نازل کردہ حکم کی تعمیل کی ترغیب دینا یہ تمام تنفیذی کام ہیں۔

جہاں تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عوام کے مفادات کے انتظام کا سوال ہے، تو آپ ﷺ نے اُن کیلئے انتظامی ڈھانچہ تیار کیا اور ہر ادارے یا محکمہ کے انتظام کیلئے ایک مدیر (Director) مقرر فرمایا۔ آپ ﷺ اہل مدینہ کے معاملات کا انتظام فرماتے تھے اور ایسے لوگوں کو متعین کرتے جو یہ کام سرانجام دیا کرتے۔ مثلاً حضرت علی ابن ابی طالبؓ کو معاہدات اور صلح نامہ لکھنے پر مقرر فرمایا تھا اور جب کوئی معاہدہ یا صلح انجام پاتی تو وہ اس کی کتابت فرمایا کرتے، یہ ایک انتظامی معاملہ ہوا نہ کہ براہِ راست حکومت۔ اسی طرح معیقیب ابن ابی فاطمہ مہر نبوت کے امین تھے اور یہ بھی ایک انتظامی معاملہ ہے نہ کہ حکومت۔ بخاری شریف میں محمد ابن بشار اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں، اُنہوں نے کہا:

((كان خاتم رسول الله ﷺ من حديد ملوّن عليه فضة كان بيدي۔ و كان معيقيب على خاتم رسول الله ﷺ))

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر نبوت لوہے سے بنی ہوئی اور اُس پر چاندی چڑھی ہوئی تھی اور وہ میرے (معیقیبؓ) کے ہاتھ میں رہا کرتی تھی اور معیقیبؓ مہر نبوت کے رکھوالے تھے۔

حضرت معیقیب رضی اللہ عنہ اس کے علاوہ مالِ غنیمت کا حساب بھی رکھا کرتے تھے اور یہ بھی ایک انتظامی معاملہ ہے نہ کہ حکومت۔ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ علاقہ حجاز کے پھلوں کی پیداوار پر محصول کے ذمہ دار تھے، حضرت عبداللہ ابن ارقمؓ قبیلوں اور اُن کے آبی ذرائع کے کاتب تھے اور یہ بھی انتظامی امور میں داخل ہیں نہ کہ حکومت میں، وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام دلیلیں اس بات کی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح حکومت کی کمان سنبھالتے تھے اسی طرح اس کے انتظامی معاملات کی بھی دیکھ بھال فرماتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن میں سے ہر افسر یا مدیر کیلئے اُس کا کام طے فرمایا جو اُس کے سپرد کیا تھا، یعنی مالِ غنیمت کا حساب، پھلوں کی پیداوار کا حساب وغیرہ لیکن آپ ﷺ نے اُن کے کام کی تفصیلات، جنہیں کرنے سے ہی کام کی تکمیل ہوتی ہے، طے نہیں فرمائیں۔ آپ ﷺ کے اِن تفاصیل کو طے نہ فرمانے کے معنے یہ ہوئے کہ وہ تفاصیل اُسی اصل کام

کی شاخیں ہیں جو اُن کے سپرد کیا گیا ہے۔ لہٰذا جس کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے، اُس کیلئے اس کی اجازت ہے کہ وہ اُس کام کیلئے ایسے اسالیب اور طریقے اپنائے جس سے کام بحسن وخوبی انجام پا سکے۔

معاملات کو انجام دینا حکومت کے کام کا حصّہ ہے:

کیونکہ معاملات کو انجام دینا حکومتی اعمال کا حصہ ہے، اور حکومت خلیفہ کی ہوتی ہے لہٰذا یہ خلیفہ کی ذمہ داری ہوئی کہ وہ انتظامی کاموں کیلئے جو اسالیب مناسب سمجھے اُنہیں اختیار کر کے نافذ کرے۔ خلیفہ کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ انتظامی معاملات کے لئے قانون وضع کرے اور لوگوں کو اُن قوانین کا پابند بنائے، کیونکہ یہ فروعی اعمال ہیں اور خلیفہ کیلئے یہ جائز ہے کہ وہ لوگوں پر وضع کردہ قوانین نافذ کرے، جن کی اطاعت واجب ہوگی، کیونکہ یہ خلیفہ کے اختیار (تبنی) کردہ قوانین کا انطباق ہے۔ اِن سے پابندی کا مطلب اِن کے سوا کسی اور اسلوب کو چھوڑ کر اِن کا پابند رہنا ہے۔ ایسے احکام کا تبنی کرنا، عین شرعی احکام کے تبنی کرنے کے ہم معنی ہے اُس سے مختلف نہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ محض اسالیب ہیں چنانچہ مباح ہیں اور ہر شخص جو اسلوب مناسب سمجھے وہی اختیار کرے، یا یہ کہ اگر خلیفہ مباحات میں سے ایک مباح کو اختیار کر لیتا ہے اور دوسرے مباح سے روک دیتا ہے، تو یہ اُس مباح کو حرام کرنے کے مترادف ہوا۔ یہ کہا جانا صحیح نہیں ہے، کیونکہ جب خلیفہ اسلوب کو تبنی یا اختیار کرتا ہے تو وہ ایک مباح کو واجب اور دوسرے مباحات کو حرام نہیں کر رہا بلکہ محض اپنے شرعی اختیارات کا استعمال کر رہا ہے۔ اِنہیں میں ایک اختیار احکام کی تبنی اور اُن اسالیب کا اختیار کرنا ہے جن سے ان احکام کی تکمیل ہوتی ہو۔ خلیفہ کے شرعی اختیار میں جہاں احکام تبنی کرنا ہے وہیں ایسے اسالیب اختیار کرنا بھی شامل ہے جن سے وہ احکامات پورے ہوتے ہوں۔ لہٰذا خلیفہ کو یہ حق ہے کہ وہ اُنہیں اختیار کرے اور عوام کیلئے اُن پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے اور جن اسالیب سے روک دیا ہو، اُن سے رک جانا بھی لازم ہے۔ پھر یہ کہ یہ مباح وہ مباح ہے جو معاملات کی نگہداشت کیلئے ہے جو کہ خلیفہ کی ذمہ داری ہے اور یہ مباح خلیفہ کیلئے ہے نہ کہ رعایا کیلئے، کیونکہ معاملات کی نگہداشت رعایا کی ذمہ داری نہیں ہے۔ چنانچہ عوام کیلئے خلیفہ کے ذریعہ اختیار کیا گیا مباح قابل التزام ہے اور بحیثیت خلیفہ کی اطاعت کے نہ کہ مباح کو فرض کئے جانے کے تعلق سے۔

انتظامیہ کی تفصیلات:

انتظامیہ کا بحیثیت مجموعی جائزہ لینے کے بعد اب اُس کی تفاصیل پر غور کریں جو فی الحقیقت انتظامیہ کے حقائق ہی سے ماخوذ ہیں۔ ان میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انتظامیہ میں بعض ایسے افعال ہیں جنہیں خلیفہ خود ہی انجام دیتا ہے یا خلیفہ کے معاونین انہیں انجام دیتے ہیں۔ یہ کام اقتدار، یعنی شریعت کے نفاذ سے متعلق بھی ہو سکتے ہیں اور انتظامیہ سے متعلق بھی جن کیلئے اسالیب و وسائل درکار ہوتے ہیں۔ ان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ خلیفہ کیلئے ایک مخصوص اداری ڈھانچہ ہو جو انہیں انجام دے۔ دوسری طرف انتظامیہ میں رعایا کے مفادات کے معاملات ہوتے ہیں جنہیں انجام دیا جانا ہوتا ہے اور اِن کیلئے بھی

اسالیب ووسائل درکار ہوتے ہیں تاکہ ان امور کی تکمیل ہو۔ اِن کا بھی تقاضا ہے کہ اِن کیلئے ایک انتظامی ڈھانچہ ہو۔

یہ ڈھانچے اداروں، محکمات (Departments) اور مدیریات (Directorates) پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ادارے ریاست کے کسی بھی کام کی انجام دہی کے بحیثیتِ مجموعی ذمہ دار ہوتے ہیں جیسے ادارہ تعلیم، ادارۂ صحت، ادارۂ زراعت، ادارۂ صنعت وغیرہ۔ یہ ادارے اُن تمام دفاتر پر مشتمل ہوتے ہیں جو اِن کاموں کی تنفیذ کیلئے ضروری ہوں۔ ایک ادارہ اپنے تمام معاملات کا اور اس کے ذیل میں آنے والے تمام محکمات و مدیریات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک محکمہ (Department) اپنے کاموں کے علاوہ اس کے ذیل میں آنے والے تمام مدیریات (Directorates) کا ذمہ دار ہوتا ہے اور ہر مدیریہ اپنے کاموں کے علاوہ اس کے تحت آنے والے دیگر شعبوں اور دفاتر کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

اِن تمام اداروں، محکموں، مدیریات اور دفاتر کا مقصد ریاست کے معاملات اور رعایا کے مفادات کی خبر گیری اور معاملات کا انجام دینا ہوتا ہے۔

ان تمام اداروں، محکموں اور مدیریات کی کارکردگی کو بحسن وخوبی انجام دینے کیلئے ناگزیر ہے کہ اِن کیلئے ذمہ دار افسران کا تعین کیا جائے۔ لہٰذا ہر مدیریہ کیلئے ایک مدیر عام (Director General) متعین کیا جاتا ہے جو اس مدیریہ کے ذیل میں آنے والے تمام دفاتر کا نگرانِ اعلیٰ ہوتا ہے۔ پھر ہر دفتر اور ہر شعبہ کیلئے ایک مدیر ہوتا ہے جو براہِ راست اس شعبہ (Section) کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

یہ ریاست کے انتظامی اداروں کی شرح ہوئی۔ یہ ایک عام ڈھانچہ ہے جو ریاست کی تمام رعایا کے مفادات کے اور اس ریاست میں مقیم تمام افراد کیلئے ہے۔ اسے عام طور پر 'دیوان' کہا جاتا ہے۔ اس طرح کا دیوان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں خصوصی طور سے موجود نہیں تھا، بلکہ ہر کام کیلئے علیحدہ کاتب ہوا کرتے تھے جنہیں مدیر یا (Director) کہا جاسکتا ہے، یہی کاتب اس کام کے مکمل ذمہ دار تھے۔

اس طرح دیوان کو پہلی بار حضرت عمر بن الخطابؓ نے قائم کیا تھا۔ دیوان کے وضع کئے جانے کا سبب یا محرک یہ تھا کہ حضرت عمرؓ نے ایک فوجی ٹکڑی کسی جگہ روانہ کی، اُس وقت آپؓ کے ساتھ الہرمزان تھے، اُنہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا: ''آپ نے اس ٹکڑی کو رقم دی ہے، اگر اس ٹکڑی کا کوئی شخص وہیں رُک گیا تو باقی لوگوں کو کیسے پتہ ہوگا، آپ اس کام کیلئے دیوان (Register) رکھئے''۔ حضرت عمرؓ نے اُن سے اس دیوان کی تفصیل پوچھی جو اُنہوں نے واضح کی۔ عابد ابن یحییٰ، حارث بن نفیل سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں سے دیوان وضع کئے جانے کے بارے میں مشورہ کیا۔ حضرت علی ابن ابی طالبؓ نے کہا: '' سال بھر میں جو کچھ مال آپؓ جمع کرتے ہیں اسے تقسیم کر دیجئے اور کچھ بچا کر نہ رکھئے''۔ حضرت عثمان ابن عفانؓ نے کہا: ''میرے خیال سے جمع مال لوگوں کیلئے کافی ہے، اگر اس کا حساب نہ رکھا گیا، جس سے یہ پتہ چلے کہ کس نے لیا اور کس نے

نہیں لیا، تو مجھے ڈر ہے کہ معاملہ ہاتھ سے نکل جائیگا''۔ الولید ابن ہشام بن مغیرہ نے کہا: ''میں ملکِ شام میں تھا وہاں میں نے دیکھا کہ بادشاہ دیوان رکھتے ہیں اور فوجیوں کو بھرتی کرتے ہیں تو آپ بھی ایسا ہی کیجئے۔ حضرت عمرؓ نے یہ مشورہ قبول فرمایا اور حضرت عقیل ابن ابی طالبؓ، مخرمہ بن نوفل اور جبیر بن مطعم کو طلب کر کے اُنہیں حکم دیا:

(اکتبوا الناس علی منازلھم)

لوگوں کی تعداد کا حساب ہر گھر کے لحاظ سے کرو۔

یہ تینوں حضرات قریش کے شجرہ سے بخوبی واقف تھے اور علم الانساب کے ماہر گردانے جاتے تھے۔ جب اسلام عراق آیا تو محصولات اور مصارف کے دیوان سابقہ جیسے چلتے رہے۔ شام میں دیوان لاطینی زبان میں تھا کیونکہ شام پہلے مملکتِ روم کا حصہ تھا اور عراق کا دیوان فارسی میں تھا کیونکہ عراق فارس کا حصہ تھا۔ عبدالملک ابن مروان کے عہد میں یعنی ۸۱ھ میں شام کا دیوان عربی میں لکھا جانے لگا۔ پھر مختلف ضرورتوں کیلئے جیسا رعایا کی ضرورت کا تقاضا ہوتا، متعدد دیوان وضع ہوئے۔ فوج میں سپاہیوں کے داخلہ اور اُنہیں تنخواہیں تقسیم کرنے کیلئے دیوان مرتب کیا گیا۔ تمام کاموں کی تفصیل اور اُن کاموں کے اخراجات اور حقوق درج کرنے کیلئے علیحدہ دیوان مرتب کئے گئے۔ اسی طرح والیوں اور عمّال کی تقرری اور معزولی کو ضبطِ قلم کرنے کیلئے مستقل رجسٹر یا دیوان وضع ہوا۔ بیت المال میں آمدنی اور اُس میں سے مختلف مدوں میں ہونے والے اخراجات کو علیحدہ دیوان میں لکھا گیا، وغیرہ۔ اس طرح دیوان حسبِ حاجت ہر کام کیلئے علیحدہ بنائے گئے اور ہر دور میں اُن کی شکل باعتبار ضرورت بدلتی رہی۔

دیوان مرتب کرنے کیلئے باقاعدہ ایک امیر مقرر ہوتا جس کے سپرد کچھ ملازمین ہوتے۔ بعض امراء کو ملازمین مقرر کرنے کا اختیار دیا گیا اور بعض کیلئے ملازمین مقرر کر کے اُس امیر کے سپرد کئے گئے۔

لہٰذا دواوین (Registers) جس کام کیلئے مرتب کئے جا رہے ہوں اُس کام کی نوعیت کے اعتبار سے اُن کا اسلوب مختلف ہو سکتا ہے، یہ اسلوب ہر زمانے میں مختلف، یا ہر ولایت اور ہر شہر میں بھی مختلف ہو سکتے ہیں۔

تمام ملازمین ریاست ایک طرف تو ریاست کے شہری ہیں اور دوسری طرف اُن کی حیثیت تنخواہ دار ملازمین کی ہوتی ہے۔ بحیثیتِ ملازم یہ لوگ اپنے شعبہ (Section) کے امیر کو جوابدہ ہیں اور پھر بحیثیت شہری وہ معاونین یا والیوں جیسے حکام اور خلیفہ کو جوابدہ ہیں نیز احکام شرع اور ریاست کے انتظامی ڈھانچہ کے قوانین کے پابند ہوتے ہیں۔

انتظامی معاملات کی پالیسی:

انتظامی امور کی پالیسی یا سیاست نظام کے سہل ہونے یا نظام کو سہل رکھنے پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کا ہدف ہوتا ہے کہ تمام کام بغیر کسی غیر ضروری تاخیر یا اڑچن (Red tape) کے انجام پائیں، اور انہیں انجام دینے والے اِن کاموں کی اہلیت رکھتے ہوں۔ یہ پالیسی اس بات سے ماخوذ ہے کہ جو شخص یہ کام کروانے کا طالب ہے اُسے یہ مطلوب ہے کہ یہ کام جلد اور بخوبی

پورے ہوں۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی حدیث میں آتا ہے:

((إن الله كتب الإحسان على كل شيء، فإذا قتلتم فأحسنوا القتلة،وإذا ذبحتم فأحسنوا الذبح.....))

بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر کام میں عمدگی اور نفاست (Excellence) کو فرض قرار دیا ہے،سو اگر تم قتل کرو تو اس میں عمدگی ہو اور اگر تم ذبح کرو تو اُس میں بھی عمدگی اور نفاست ہو.....(مسلم شریف: راوی شداد ابن اوس)

لہٰذا ہر کام میں عمدگی کا شریعت کی طرف سے لحاظ رکھا گیا ہے۔انتظامیہ کے کاموں میں عمدگی یا احسان کو یقینی بنانے کیلئے تین چیزیں ناگزیر ہوتی ہیں: نظام کا سہل ہونا (Simplicity of System)،معاملات کا جلد نبٹارا ہونا کیونکہ اس سے اُس شخص کو سہولت ہوتی ہے جس کا کام مطلوب ہے،تیسرے جو افراد اُس کام کو انجام دینے پر مامور ہوں اُن میں اُس کام کی لیاقت واہلیت کا ہونا۔اسی لیاقت سے کام میں عمدگی پیدا ہوتی ہے اور کام کی انجام دہی کیلئے یہ ضروری بھی ہے۔

ریاست کے انتظامیہ میں تقرری کے مستحق کون ہیں:

ہر وہ شخص جو ریاست کا شہری ہے،جس میں متعلقہ کام کی اہلیت ہے،خواہ وہ مرد ہو یا عورت مسلم ہو یا غیر مسلم اُسے کسی بھی اداری محکمہ کا مدیر (Director) بنایا جاسکتا ہے یا اُس محکمہ میں ملازم رکھا جاسکتا ہے۔

اس طرح کسی کو اجرت پر ملازم رکھنے کی دلیل مطلق ہے اس میں مسلم یا غیر مسلم ہونے کی شرط نہیں ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قول ہے:

﴿فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاتُوهُنَّ أُجورَهُنَّ﴾

اور اگر وہ تمہاری خاطر دودھ پلائیں،تو تم انہیں ان کے معاوضے دو (ترجمہ معانی قرآن کریم: سورۂ طلاق آیت:٦)

چنانچہ اجارہ یا اجرت کی دلیل عام ہے،بخاری شریف میں حضرت ابی ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((قال الله تعالىٰ:ثلاثة أنا خصمهم يوم القيامة..... و رجل استأجر أجيراً فاستوفى منه ولم يعطه أجره))

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تین قسم کے لوگوں سے قیامت کے دن میری دشمنی ہوگی.....(اُن میں ایک) وہ شخص جو کسی کو کسی کام کیلئے اجرت پر رکھے،اُس سے وہ کام لے پھر اُسے وہ اجرت نہ دے۔

یہ دلیل بھی عام ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار بنی الدیل کے ایک شخص کو جو غیر مسلم تھا،اجرت پر رکھا تھا۔اس سے بھی کسی غیر مسلم کو اجرت پر ملازم رکھنے کی دلیل ملتی ہے۔اسی طرح عورت کو اجرت پر رکھنے کا بھی جواز اُسی دلیل کی عمومی نوعیت سے ماخوذ ہے۔چنانچہ وہ کسی محکمہ یا دفتر کی مدیر ہوسکتی ہے یا اس میں ملازم ہوسکتی ہے۔اسی طرح ایک غیر مسلم کسی محکمہ یا دفتر میں

مدیر یا ملازم ہوسکتا ہے کیونکہ یہ اجرت یا اجارہ کا معاملہ ہے اور اس کی دلیل عمومی نوعیت کی ہے۔ رہی بات ملازم رکھنے کیلئے شہری ہونے کی شرط کی، تو اس کا سبب یہ ہے کہ جو شخص ریاست کا شہری ہوتا ہے، وہی ریاست کے قوانین کے تابع ہوتا ہے اور غیر شہری ریاست کے قانون کا تابع نہیں ہوتا، خواہ وہ مسلم ہی کیوں نہ ہو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک امیر جیش کو نصیحت فرمائی، یہ حدیث مسلم شریف میں بروایت بریدہ نقل ہے:

((ثم ادعهم إلى التحول من دارهم إلى دار المهاجرين، وأخبرهم أنهم إن فعلوا ذلك فلهم ماللمهاجرين وعليهم ما على المهاجرين))

پھر اُن لوگوں سے اپنا ملک چھوڑ کر مہاجروں کے ملک میں آنے کیلئے کہو، اور اُنہیں بتاؤ کہ اگر وہ ایسا کرینگے تو اُن کے حقوق وہی ہونگے جو مہاجرین کے ہونگے اور وہ اُسی (نظم) کے پابند ہونگے جس کے مہاجرین پابند ہیں۔

اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اگر وہ اپنا ملک چھوڑ کر نہیں آتے تو اُن کے وہ حقوق نہیں ہونگے جو ہمارے ہیں اور اُن کے وہ فرائض نہیں ہونگے جو ہمارے ہیں خواہ وہ مسلم ہی کیوں نہ ہوں۔ یہاں وہ لوگ مراد ہیں جن پر ریاست کے قوانین منطبق ہوتے ہیں ورنہ اُن لوگوں کو بھی ملازم رکھا جاسکتا تھا جو شہری نہ ہوں کیونکہ ملازمت یا اجارہ کی دلیل عمومی نوعیت کی ہے۔

ریاست کے ملازمین تنخواہ دار ہوتے ہیں:

ریاست کے مختلف محکموں کے مدراء (Directors) اور ملازمین احکام اجارہ کے تحت تنخواہ دار ہوتے ہیں۔ اُن کی تقرری، معزولی، تبادلہ اور تادیب (Discipline) اُن کے شعبہ یا محکمہ کے امیر کرتے ہیں جو اُس نظم کے تحت ہوں۔

اس بات کی دلیل احکام اجارہ سے ماخوذ ہے۔ اجیر اور مستاجر دونوں پر احکام اجیر کے مطالبات وتقاضے نیز اُن کی پابندی لازم ٹھہرتی ہے کیونکہ عقد اجیر کے طرفین پابند ہوتے ہیں مثلاً اجیر کو اگر معین مدت کیلئے رکھا گیا ہو تو اُس مدت کے پورا ہونے سے پہلے اُسے برطرف نہیں جاسکتا۔ انتظامی نظام کی پابندی اجارہ کی شروط کی طرح ہے، جن کی پاسداری لازم ہوتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((المسلمون على شروطهم))

مسلمان (اُن پر عائد) شروط کے پابند ہوتے ہیں۔ (ابوداؤد: راوی حضرت ابوہریرہؓ)

رہی بات ملازمین کے ایک جگہ سے دوسری جگہ تبادلہ کی، تو یہ تقرری کے عقد کے تابع ہوتے ہیں۔

ملازمین کی تقرری، معزولی، تبادلہ اور تادیب (Discipline) اُن کے شعبہ یا محکمہ کے امیر کی طرف سے ہوتی ہے جو اُس نظم کے تحت ہوں، کیونکہ وہی اُس کام کے ذمہ دار ہوتے ہیں جس پر ملازمین مقرر ہوں اور اُنہیں کے پاس کام کی تکمیل کی ذمہ داری کے بموجب اختیارات ہوتے ہیں۔

مجلسِ امت (شوریٰ)

مجلسِ امت اُن اشخاص پر مشتمل ہوتی ہے جو امت کی عام رائے کی نمائندگی کرتے ہیں۔خلیفہ ریاست کے معاملات میں مجلس سے مشورہ کرتا ہے اور اس مجلس کے ارکان حکام کے احتساب میں امت کی نمائندگی کرتے ہیں۔یہ بات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ماخوذ ہے کہ آپ ﷺ نے چودہ (۱۴) افراد کو مختلف معاملات میں مشورے کیلئے مخصوص فرمایا تھا۔یہ افراد مہاجرین وانصار کے نقیبوں (سردار) میں سے تھے۔نیز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی مہاجرین وانصار کے افراد کو ضرورت پڑنے پر مشورے کیلئے مخصوص کیا تھا۔حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں یہ اہلِ شوریٰ علماء اور مفتی ہوا کرتے تھے۔ابن سعد القاسم سے روایت کرتے ہیں کہ جب کوئی معاملہ پیش آتا تو حضرت ابوبکرؓ اہلِ رائے اور اہلِ فقہ سے مشورہ کیا کرتے تھے، وہ انصار ومہاجرین میں سے حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ، حضرت معاذ ابن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت زید ابن ثابتؓ کو طلب فرماتے۔حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں یہی حضرات اپنی رائے دیا کرتے تھے اور لوگوں کو بھی یہی حضرات فتاویٰ دیا کرتے تھے۔اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اپنے عہدِ خلافت میں انہیں حضرات سے مشورے کیلئے رجوع کرتے رہے جبکہ آپؓ کے دور میں اہلِ فتویٰ میں حضرت عثمان، حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت زید ابن ثابتؓ تھے۔اس سے ایک ایسی مجلس کی موجودگی ثابت ہوتی ہے جو حاکم کے محاسبہ میں امت کی نمائندگی کرے اور مشورے دے۔یہ بات نص قرآن وسنت سے بھی ثابت ہے۔اسے مجلسِ امت کہا جاتا ہے کیونکہ حکام کے محاسبہ اور مشورے میں یہ امت کی نائب ہوتی ہے یا امت کی نیابت کرتی ہے۔

اس مجلس کے ارکان میں غیر مسلموں کی رکنیت جائز ہے تاکہ وہ اُن پر حکام کے ظلم کی یا اسلام کے اُن پر غلط نفاذ کی شکایت کر سکیں۔

شوریٰ کا حق:

تمام مسلمانوں کا یہ حق ہے کہ اُن کی رائے خلیفہ تک پہنچے۔مسلمانوں کا یہ حق ہے کہ خلیفہ مختلف امور میں اُن سے رجوع کر کے مشورہ کرے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ﴾

اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو، پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے، تو اللہ پر بھروسہ کرو،

(ترجمہ معانی قرآن کریم: سورہ آلِ عمران: ۱۵۹)

لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود لوگوں سے رائے لیا کرتے تھے، آپ ﷺ نے جنگ بدر کے دن مشورہ کیا کہ

جنگ کس مقام پر لڑی جائے، احد کی لڑائی کے وقت مشورہ فرمایا کہ آیا جنگ مدینہ میں رہ کر لڑی جائے یا شہر سے باہر جا کر۔ پہلی صورت میں یعنی جنگ بدر کے وقت حضرت الحباب بن المنذرؓ کی رائے آپ ﷺ نے پسند فرمائی جو کہ ایک فنی (Technical) رائے تھی جو ایک ماہر شخص نے دی تھی اور دوسری صورت میں یعنی موقع احد میں آپ ﷺ نے اکثریت کی رائے کو تسلیم فرمایا جبکہ وہ رائے آپ ﷺ کی اپنی رائے سے مختلف تھی۔

حضرت عمرؓ نے عراق کی فتح کے بعد وہاں کی زمین کے سلسلے میں لوگوں سے مشورہ کیا کہ کیا اُس زمین کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے یا اسے بیت المال کی ملکیت بنا کر اہل عراق ہی کے پاس رہنے دیا جائے اور وہ اُس زمین کا خراج ادا کرتے رہیں۔ پھر حضرت عمرؓ نے اپنے اجتہاد ہی کے بموجب عمل کیا اور زمین اُنہیں لوگوں کے پاس خراج کے عوض رہنے دی۔ اس پر تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے حضرت عمرؓ سے اتفاق کیا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کو شکایت ملنے کے سبب ولایت سے معزول کر دیا اور فرمایا کہ میں نے اُنہیں کسی خیانت یا کمزوری و نااہلی کے سبب معزول نہیں کیا ہے۔

مسلمانوں کا خلیفہ کو رائے دینے کے حق کے علاوہ حکام کے اعمال اور طرزِ عمل کا محاسبہ کرنا بھی واجب ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مسلمانوں کو سختی سے حکم دیا ہے کہ وہ حکام کا محاسبہ کریں، اگر حکام عوام کے حقوق غصب کریں تو اُن کا محاسبہ کرنا ضروری ہے، اگر حکام اپنے فرائض میں کوتاہی برتیں یا عوام کے معاملات کو فراموش کریں، اسلام کے کسی حکم کی خلاف ورزی کریں یا کسی ایسے قانون کو بنیاد بنا کر حکومت کریں جو اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ نہیں تو اُن کا محاسبہ کیا جائے۔ حضرت ام سلمہؓ سے مسلم شریف میں روایت نقل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ستكون أمراء فتعرفون وتنكرون،فمن عرف برئ،ومن أنكر سلم ولكن رضي وتابع،قالوا أفلا نقاتلهم؟ قال: لا، ما صلّوا.....))

ایسے امراء ہونگے جن کے بعض کاموں کو تم پہچانو گے اور بعض کے ماننے سے انکار کرو گے، سو جو پہچان جائیگا وہ گناہ سے بری ہوا اور جس نے (وہ برائی) ماننے سے انکار کیا وہ محفوظ ہو گیا، لیکن جو اُن کاموں سے راضی ہو گیا اور اطاعت کی (وہ محفوظ نہ رہا) صحابہ نے عرض کیا کہ کیا ہم اُن سے نہ لڑیں؟ فرمایا نہیں، جب تک کہ وہ نماز پڑھیں۔

بعض اوقات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں پر اعتراض بھی کیا۔ حضرت عمرؓ نے بڑی شدت سے صلح حدیبیہ کے وقت صلح میں لکھی اس عبارت پر احتجاج کیا:

((إنه من أتى محمداً من قريش بغير إذن وليّه رَدَّهُ عليه ومن جاء قريشاً ممن مع محمد لم يردوه عليه))

جو کوئی قریش میں سے بغیر اجازت لئے محمدؐ کے پاس آئے اُسے (محمدؐ) لوٹا دینگے اور جو کوئی قریش محمدؐ کے پاس سے

(قریش) کے پاس آئیگا، اسے واپس (محمدؐ کے پاس) لوٹایا نہیں جائیگا۔

اس روایت کو سیرت ابن ہشام نے الزہری سے نقل کیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب مرتدین سے لڑائی کا عزم کیا تو مسلمانوں نے اور خاص کر حضرت عمرؓ نے اس کی مخالفت کی۔ اسی طرح حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے اس وقت مخالفت کی جب اُنہیں پتہ چلا کہ حضرت ابوبکرؓ اپنے بعد حضرت عمرؓ کو نامزد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اسی طرح بلال ابن رباحؓ اور حضرت زبیرؓ وغیرہ نے حضرت عمرؓ کے اُس فیصلہ کی مخالفت کی جب حضرت عمرؓ نے عراق کی فتح کردہ زمین کو فوجیوں میں نہ بانٹنے کا ارادہ کیا۔ ایک عورت نے بھی حضرت عمرؓ کے ذریعہ مہر کی رقم کی حد مقرر کر کے چار سو درہم تک محدود کئے جانے کی یہ کہہ کر مخالفت کی کہ ''اے عمرؓ، یہ تمہارا حق نہیں، کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں سنا:

﴿وَ ءَاتَيْتُمْ إِحْدَئهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُواْ مِنْهُ شَيْـًٔا﴾

تو خواہ تم نے ان میں کسی کو ڈھیروں مال دے دیا ہو، اس میں سے کچھ مت لینا (ترجمہ معانی قرآن: سورۂ نساء آیت: ۲۰)

اِس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ عورت نے صحیح کہا اور عمرؓ سے غلطی ہوئی۔

اِن تمام حقائق کی روشنی میں مجلس امت کو یہ حق ہے کہ اُس سے مشورہ کیا جائے اور اُس پر یہ واجب ہے کہ وہ حکام وخلیفہ کا محاسبہ کرے۔

شوریٰ کا حکم:

شوریٰ مشْوَرہ اور مَشْوَرہ ہم معنے ہیں لغت لِسان العرب میں آیا ہے: یہ کہا جانا صحیح زبان ہے کہ فلاں مشْوُرہ اور مَشْوَرہ میں اچھا ہے۔ الفراء کہتے ہیں کہ مشْوُرہ اور مَشْوَرہ ایک ہیں اصل میں لفظ مشْوُرہ ہی ہے جو تلفظ میں سہولت کے سبب مَشْوَرہ کی شکل اختیار کر گیا۔ امام اللیث کا کہنا ہے کہ مَشْوَرہ 'اشارہ' کا ہی مَفْعَل کے وزن کا صیغہ ہے۔ لغت مختار الصحاح میں بھی یہی تفصیل ہے۔

شوریٰ کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا کہ وہ مومنین سے رائے لیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ شَاوِرْهُمْ فِى الأَمْرِ﴾

اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو (ترجمہ معانی قرآن کریم: سورۂ آلِ عمران: آیت: ۱۵۹)

یہاں اللہ تعالیٰ کا حکم محض طلب ہے، اب اس حکم کا واجب، مندوب یا مستحب ہونا قرائن پر منحصر ہے:

یہ طلب کسی ایسے قرینہ سے منسلک نہیں ہے جو اس کا واجب اور قطعی ہونے کی طرف اشارہ کریں، بلکہ یہ حکم ایسے قرائن سے منسلک ہے جن سے عدم وجوب قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے:

۱- اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ﴿فِى الأَمْرِ﴾ ہے، یعنی کسی بھی معاملہ میں خواہ اُس معاملہ کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ البتہ

شریعت کے فرائض یا واجبات و محرمات اور دیگر احکام جو نص شرع میں واضح اور قطعی شکل میں وارد ہوئے ہیں، اُن میں انسانی رائے کی قطعاً مجال نہیں ہے کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی اکیلا مُشرع ہے اور وہی حاکم ہے، حکم صرف اُسی کیلئے خاص ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنِ الحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ﴾

اختیار و اقتدار تو بس اللہ کا ہے (ترجمہ معانی قرآن: سورۂ یوسف: آیت: ۴۰)

اور فرمایا:

﴿اتَّبِعُواْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ﴾

جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تمہاری جانب نازل ہوا ہے اس کی پیروی کرو

(ترجمہ معانی قرآن کریم: سورۂ اعراف: آیت: ۳)

اور فرمایا:

﴿وَمَا ءَ تَكُمُ الرَّسُول فَخُذُوهُ وَمَا نَهَكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُواْ﴾

رسول جو کچھ تمہیں دے، اسے لے لو، اور جس چیز سے وہ تمہیں روک دے، اس سے رک جاؤ

(ترجمہ معانی قرآن کریم: سورۂ حشر: آیت: ۷)

وغیرہ آیات میں یہ واضح ہو گیا کہ اِن میں انسانی رائے کا کوئی دخل یا اُس کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس سے اشارہ ملتا ہے کہ یہ احکام الإمر کی عام نوعیت کو مخصوص کرتے ہیں، اور یہ کہ مشورہ اِن امور کے ماسوا مباح امور میں ہی ہو سکتا ہے۔ یہ قرینہ قطعی ہے جس سے شوریٰ کا واجب نا ہونا ثابت ہوتا ہے۔

۲- پھر اسی آیت میں اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿ فَإِذا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ﴾

پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے، تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ (ترجمہ معانی قرآن کریم: سورۂ آلِ عمران: ۱۵۹)

یہاں بتایا گیا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ہے، یعنی کہ فیصلہ کرنا، نہ کہ اُن کے مشیروں یا مشورہ دینے والوں کیلئے۔ یہ دوسرا قرینہ ہوا جس سے مشورہ کا عدم وجوب ثابت ہوتا ہے۔

۳- حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی اعمال و افعال انجام دئے اور کئی امور میں فیصلے کئے، مثلاً آپ ﷺ نے والیوں، قاضیوں اور مدراء کو متعین فرمایا، فوجی مہمات کیلئے فوج کے امراء متعین فرمائے، دوسرے ممالک کو اپنے پیغام رسانی کیلئے نمائندے اور وفود بھیجے، فوجی مہمات میں جنگ بندیاں طے فرمائیں، جو صحابۂ کرام سے مشورہ کے بغیر ہوا۔ یہ تیسرا قرینہ ہوا جس

سے اس طلب کا عدم وجوب وعدم قطعیت ثابت ہوتے ہیں، اگر یہ حکم قطعی یا عام ہوتا تو یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام کاموں میں صحابہ کرام سے مشورہ فرماتے۔

اب جب کہ مشورہ کا عدم وجوب قطعاً ثابت ہو گیا تو مشورہ صرف مندوب یا مستحب ہو سکتا ہے۔ اس کے ادلہ اور قرائن پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مشورہ اور شوریٰ مندوب ہے۔

۱- اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی تعریف ومدحت فرمائی کہ اُن کے امور اُن کے درمیان باہمی مشورے سے انجام پاتے ہیں:

﴿وَاَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ﴾

اُن کا معاملہ اُن کے آپس کے مشورے سے چلتا ہے (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: سورۂ شوریٰ: ۳۸)

۲- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کثرت سے بہت سارے معاملات میں صحابۂ کرام سے مشورہ کرنا، دراصل آپ ﷺ کے اس معاملہ میں اہتمام اور رغبت کی دلیل ہے اور اس سے مسلمانوں کو یہ تعلیم دینا مقصود تھا کہ وہ بھی یہی کریں، لہٰذا ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول روایت ہے:

(ما رأيت أحداً أكثر مشورة لأصحابه من رسول الله صلى الله عليه وسلم)

میں نے کسی کو اپنے ساتھیوں سے اتنا مشورہ کرتے نہیں دیکھا جتنا حضور ﷺ اپنے ساتھیوں سے مشورہ فرماتے تھے۔

۳- اللہ تعالیٰ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں سے مشورہ کرنے کا حکم دراصل اسی آیت میں اور اُسی موقع پر آیا جس میں اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کو مومنوں سے نرمی برتنے، درگزر اور ان کے حق میں مغفرت کی دعا کرنے کا حکم دیتا ہے، چنانچہ اِسی آیت کے شروع میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾

تو یہ اللہ کی رحمت ہے جو تم ان کیلئے نرم ہو؛ اگر کہیں تم ترش مزاج اور سخت دل ہوتے، تو یہ سب تمہارے پاس سے منتشر ہو جاتے۔ پس انہیں معاف کر دو، اور ان کیلئے مغفرت کی دعا مانگو اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: سورۂ آلِ عمران: ۱۵۹)

یہ وہ قرائن ہیں جن سے اشارہ ملتا ہے کہ شوریٰ مندوب ہے۔

شوریٰ کے مندوب ہونے کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ مباح اعمال ومعاملات ہی میں ہوتا ہے، البتہ وہ احکام جن کے بارے میں کتاب اللہ یا رسول اللہ ﷺ کی سنت میں کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا اور جن میں تحقیق وتفتیش کی ضرورت ہو، یا وہ تعاریف وفنی (Technical) امور یا فکری امور جن کو سمجھنے کی ضرورت ہو، یا کوئی جنگ سے متعلق معاملہ یا منصوبہ بندی سے متعلق

مسئلہ ہو تو وہ اہل علم اور اہل اختصاص (Specialists or Experts) سے رجوع کیا جائیگا، جن کی رائے میں اکثریت یا اقلیت غیر اہم اور رائے کا قبول کر لیا جانا شرط نہیں ہوتی۔ اس کا ماخذ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے، آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے غزوۂ بدر کے قیدیوں کے سلسلے میں رائے لی اور یہ طے فرمایا کہ قیدیوں کے بارے میں نازل کردہ احکامات میں جو کئی حل ممکن ہیں اُن میں سے ایک پر عمل کیا جائے۔ یہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عمل سے بھی ثابت ہے، جب اُن حضرات نے اپنی اپنی خلافت کے دوران جو کوئی معاملہ پیش آتا، جس کے بارے میں کتاب اللہ اور سنت رسولؐ میں کوئی حکم نہیں ہوتا یا کوئی ایسا واقعہ پیش آتا جس میں فیصلہ کی ضرورت ہو تو یہ حضرات علماء اور جلیل القدر صحابہ سے رجوع فرماتے۔ نیز یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس عمل سے بھی ماخوذ ہے جب آپ ﷺ نے جنگِ بدر کے موقع پر حضرت حباب بن منذرؓ کی رائے اختیار فرمائی کہ کس جگہ لڑائی لڑی جائے۔

شوریٰ کے مباح معاملات میں مندوب ہونے کے ساتھ ساتھ اُس میں خلیفہ کیلئے یہ جواز ہے کہ وہ تمام مباح معاملات میں یا بعض میں رائے کا پابند ہو۔ لہٰذا اگر وہ ایک معاملہ میں رائے کا پابند ہو جاتا ہے یا کئی معاملات میں رائے کا پابند ہو جاتا ہے تو اب اس پر لازم ہے کہ وہ اُن پر عمل کرے۔ یہ بات اس حقیقت سے ماخوذ ہے کہ جب حضرت عثمانؓ کو خلافت سونپی گئی تو آپؓ نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ کے طریقہ پر چلنے کو تسلیم کیا، جیسا کہ اُن سے کہا گیا تھا۔ یہ صحابہ کرام کے بڑے مجمع میں واقع ہوا اور کسی صحابیؓ نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔

جب خلیفہ مجلس امت سے مشورہ کرے تو اُس پر، عملی معاملات (Practical matters) میں یا اُن معاملات میں جن میں کسی تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہ ہو جو ریاست کے داخلی معاملات ہیں مثلاً تعلیم، صحت، تجارت، صنعت و زراعت وغیرہ، تو وہ اکثریت کی رائے کا پابند ہوگا۔ نیز جب خلیفہ کا ان اعمال پر محاسبہ کیا جائے تو بھی وہ اکثریت کی رائے کا پابند ہوگا۔ یہ قاعدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ماخوذ ہے کہ آپ ﷺ نے جب جنگِ احد کے وقت اکثریت کی رائے کو تسلیم کرتے ہوئے مدینہ کے باہر جنگ کرنے کا فیصلہ کیا جب کہ آپ ﷺ کی اپنی رائے اور اکابر صحابہ کی رائے اس کے برخلاف یہ تھی کہ مدینہ سے باہر نہ جا کر مدینہ ہی میں مقابلہ کیا جائے، اس موقع پر آپ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ سے فرمایا:

((لو اجتمعتا فی مشورة ما خالفتکما))

اگر تم لوگ مشورہ میں ایک رائے پر متفق ہوتے، تو میں اُس کے خلاف نہ کرتا۔ (مسند احمد: راوی ابن غنم الاشعري)

جب خلیفہ مجلس امت سے مشورہ کرے تو اُس پر، فنی معاملات (Technical matters) میں یا اُن معاملات میں جن میں کسی تحقیق و تفتیش کی ضرورت ہو، یا جنگ سے، یا منصوبہ بندی سے متعلق ہوں تو خلیفہ اکثریت کی رائے کا پابند نہیں ہوگا اور فیصلہ لینے کا اختیار اُسی کا ہوگا۔ یہ اس بات سے ماخوذ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معرکہ بدر کیلئے جگہ طے کرنے میں جو کہ

ایک فنی معاملہ تھا، صحابہ کی رائے پر غور نہ کرتے ہوئے، بلکہ اُن سے رائے لئے بغیر، حضرت حباب بن منذر کی رائے اختیار کی۔ اسی طرح حضرت ابوبکرؓ نے اپنی خلافت کی ابتداء میں تمام صحابہ کی رائے کو ٹھکرا کر مرتدین اور زکوٰۃ دینے سے منع کرنے والوں کے خلاف لڑائی کا فیصلہ کیا۔ اسی طرح جب مجلس امت خلیفہ کا اِن امور میں محاسبہ کرے تو خلیفہ اکثریت کی رائے کا پابند نہیں ہوگا۔

رہی بات اُن امور کی جن میں خلیفہ کسی حکم شرعی میں تبنی کرنا چاہتا ہو یا کوئی قانون وضع کرنا مطلوب ہو، تو اس کیلئے یہ جائز ہے کہ وہ انہیں مجلس امت کے سامنے پیش کرے تاکہ اُن کی رائے لے سکے، لیکن بہرحال خلیفہ اُس رائے کا پابند نہیں ہوتا، خواہ وہ رائے اکثریت کی ہو یا اقلیت کی، بلکہ خلیفہ خود ہی فیصلہ لینے کا اختیار رکھتا ہے، کیونکہ احکام شرعیہ کی تبنی خلیفہ کا ہی مخصوص اختیار ہوتا ہے۔ یہ بات صحابہ کرامؓ کے اجماع سے ماخوذ ہے جب حضرت عمرؓ نے عراق کی مفتوحہ زمین کے معاملہ میں صحابہ کی رائے لی، لیکن اپنی رائے پر عمل کیا اور اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

مجلس امت کے ارکان کا انتخاب:

مجلس امت کے ارکان بذریعہ انتخاب مجلس کے رکن ہوتے ہیں، اُن کا تعین نہیں کیا جاتا، کیونکہ وہ عوام کی رائے کی نمائندگی کرتے ہیں اور ایک مؤکل ہی اپنے وکیل یا نمائندہ کو منتخب کرتا ہے، یہ مطلقاً نہیں ہوتا کہ وکیل یا نمائندہ کسی پر تھوپ دیا جائے۔ مجلس امت کے ارکان امت کی انفرادی طور پر اور جماعتی یا گروہوں کی نمائندگی کرتے ہیں، اور جماعتوں یا غیر معروف اشخاص کی رائے معلوم نہیں کی جاسکتی تاوقتیکہ وہ افراد و جماعتیں اُنہیں منتخب نہ کریں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن لوگوں سے رائے مشورہ لینے کیلئے رجوع فرماتے تھے، اُنہیں اُن لوگوں کی ذاتی اہلیت، مہارت یا شخصیت کے سبب نہیں چنا تھا بلکہ ایسے لوگوں کو منتخب کرنے کیلئے دو پیمانے اختیار فرمائے تھے: اوّل یہ کہ وہ افراد اپنے اپنے قبائل یا جماعات کے سردار تھے، قطع نظر اس سے کہ اُن کی ذاتی صلاحیتوں یا مہارتوں کے۔ دوم یہ کہ یہ لوگ مہاجرین و انصار کی نمائندگی کرتے تھے۔ لہٰذا یہ واضح ہوا کہ وہ غرض جس کے سبب شوریٰ کا وجود ہے، وہ عوام کی نمائندگی ہے، اور یہی بات قبائل کے سرداروں کو شوریٰ کیلئے خاص کرنے کا سبب تھی، اور یہی سبب تھا کہ مہاجرین اور انصار کے نمائندے اس کام کیلئے مخصوص کئے گئے۔ غیر معروف افراد کی نمائندگی اُس وقت تک حقیقت نہیں بن سکتی جب تک کہ ارکان یا نمائندوں کا انتخاب نہ کیا جائے۔ لہٰذا مجلس امت کے ارکان کا انتخاب ہونا ضروری ہے۔ اب یہ دلیل کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شوریٰ کے لوگوں کو خود چنا تھا، تو وہ علاقہ جہاں مہاجرین و انصار مقیم تھے، یعنی مدینہ، تو وہ ایک چھوٹی سی جگہ تھی اور یہ کہ آپ ﷺ تمام مسلمانوں سے بذاتِ خود واقف تھے۔ اس کے برعکس دوسری بیعتِ عقبہ کے وقت مسلمانوں کی کثیر تعداد ہونے کے سبب حضور ﷺ تمام بیعت دینے والوں سے واقف نہیں تھے چنانچہ آپ ﷺ نے سرداروں کے انتخاب کا معاملہ لوگوں پر چھوڑ دیا اور لوگوں سے فرمایا:

((أخرجوا إليَّ منكم اثنى عشر نقيباً ليكونوا على قومهم بما فيهم))

اپنے میں سے بارہ سردار منتخب کرلو جو اپنے اور اپنی قوم (کی بات) کے ذمہ دار ہونگے۔

اس حدیث کو حضرت کعب ابن مالکؓ سے سیرت ابن ہشام میں نقل کیا ہے۔

اس طرح مجلس امت کے ارکان کا امت کی رائے دینے کیلئے نمائندہ ہونے میں، اور مجلس امت کا افراد و جماعات کی نمائندگی اور محاسبہ میں علت ہونے میں، اور اس علت کا اس وقت تک حقیقت نہ بن جانا جب تک کہ ارکان کا انتخاب نہ ہو، اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ مجلس امت کے ارکان کا منتخب ہونا ضروری ہے نہ کہ اُن کا متعین کیا جانا۔

مجلس امت کی رکنیت کی میعاد:

مجلس امت کی رکنیت محدود وقت کیلئے ہوتی ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کو رائے کیلئے مخصوص کیا تھا، حضرت ابوبکرؓ نے اُن پر اکتفاء نہیں کیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے بھی اُن لوگوں پر اکتفاء نہیں کیا جو حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں مشورے کیلئے خاص تھے۔ حضرت عمرؓ خود بھی جن لوگوں سے اپنے ابتدائی دور میں رجوع کیا کرتے تھے، اپنے عہدِ خلافت کے اواخر میں دوسرے لوگوں سے رجوع کیا کرتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مجلس امت کی رکنیت معین مدت کیلئے ہوتی ہے۔

مجلس امت کی رکنیت:

ہر وہ شخص جو ریاست کا شہری ہو، عاقل و بالغ ہو، اُسے مجلس امت کی رکنیت کا اور اس کیلئے انتخاب کا حق ہے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، مسلم ہو یا غیر مسلم، کیونکہ مجلس امت کو محض رائے دینے کا اختیار ہے نہ کہ حکومت و تشریع یا قانون سازی کا۔ چونکہ مجلس امت مشورہ میں امت کی نمائندگی کرتی ہے، چنانچہ عوام کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اُن لوگوں میں سے جو اِس کے قانوناً اہل ہیں، جسے چاہیں اپنا نمائندہ منتخب کریں۔ جس طرح مسلمانوں کو شوریٰ کا حق ہے اُسی طرح غیر مسلموں کو بھی اُن پر اسلام کی کسی غلط تطبیق پر یا حکام کے کسی ظلم پر اپنی رائے دینے کا اختیار ہے۔ چنانچہ لوگوں کو یہ حق ہے کہ وہ جسے چاہیں اپنا نمائندہ بنائیں اور نمائندہ بننے والے کو یہ حق ہے کہ وہ جس کا چاہے نمائندہ بنے۔ نہ تو نمائندہ کیلئے نہ اُسکے مؤکل کیلئے مسلم ہونا شرط ہوسکتا، بلکہ اس بات کا جواز ہے کہ نمائندہ اور اُس کا مؤکل مسلم اور مسلم دونوں ہوسکتے ہیں۔ اس بات سے غیر مسلم کا اپنے نمائندہ منتخب کرنے کا جواز ثابت ہوا جیسے ایک مسلم کو یہ حق ہے، خواہ یہ نمائندہ بھی مسلم ہو یا غیر مسلم بس یہ ضروری ہے کہ وہ ریاست کا شہری ہو۔

مزید یہ کہ اسلام ریاست کی رعایا کو جن پر وہ حکومت کرتا ہے، محض انسان ہونے کی حیثیت سے دیکھتا ہے، نہ کہ اُن کے کسی گروہ، نسل یا مَرد و عورت ہونے کے اعتبار سے، لہٰذا اُن پر حکومت کی پالیسی بھی اُن کے محض انسان ہونے پر مبنی و قائم ہے، تاکہ حکومت کرنے کی غرض یہ ہو کہ اُنہیں ظلمتوں یعنی اندھیروں سے نکال کر نور یا روشنی کی طرف لایا جائے۔ چنانچہ رعایا اپنے انسان ہونے کے اعتبار سے اپنے حقوق و فرائض میں یکساں ہوتی ہیں، احکام شریعت اُن پر یکساں نافذ کئے جاتے ہیں۔ ایک

قاضی لوگوں کے مابین کسی تنازعہ پر فیصلہ دیتے وقت، یا ایک حاکم حکومت کرنے میں رعایا کہ درمیان فرق نہیں کرتا بلکہ اُن سے ریاست کے شہری ہونے کے لحاظ سے نہ کہ کسی اور اعتبار سے، برابری کا سلوک کرتا ہے۔ لہٰذا ہر ایک شخص کو اُس کے ریاست کا شہری ہونے کے اعتبار سے اپنی رائے دینے کا، اور اپنی رائے پیش کرنے کیلئے اپنا نمائندہ چننے کا، نیز اپنے مؤکل کی رائے پیش کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اسلام سے مخاطب کیا تو محض اُن کے انسان ہونے کی صفت کے لحاظ سے کیا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَآ أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَ أَنْزَلْنَآ إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِيْنًا﴾

اے لوگو، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے کھلی دلیل پہنچ چکی ہے؛ اور ہم نے تمہاری طرف ایک واضح روشنی نازل کی ہے (ترجمہ معانی قرآن کریم: سورۂ نساء: آیت ۱۷۵)

اور فرمایا:

﴿يَآ أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾

اے لوگو میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں (ترجمہ معانی قرآن کریم: سورۂ الاعراف: آیت: ۱۵۸)

اس بات تمام علماء کا عام طور پر اور علماء اصول کا خاص طور پر اتفاق ہے کہ احکام کا مخاطب ہر وہ شخص ہے جو عاقل ہو اور اس خطاب کو سمجھتا ہو، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، مرد ہو یا عورت۔

یہ غیر مسلموں کے تعلق سے ہوا، اب رہی بات عورتوں کے متعلق، تو کیونکہ مجلس امت کو حکومت کا اختیار نہیں ہوتا، نا ہی عورتوں کا مجلس امت میں ہونا اُس حدیث سے ٹکراتا ہے جو عورتوں کی ولایت کے متعلق ہے، یعنی:

((لن يفلح قوم ولَّوْا أمرهم امرأة))

وہ قوم جو اپنے امور پر عورت کو والی بنالے، ہرگز کامیاب نہیں ہوگی۔

پھر حضرت عمرؓ سے یہ ثابت ہے کہ جب آپؓ کو کوئی مسئلہ پیش آتا جس میں رائے لینا مقصود ہو، خواہ وہ مسئلہ احکام شرعیہ (تشریع) سے متعلق ہو، حکومت سے متعلق ہو یا ریاست کے کسی معاملہ کا ہو، تو آپؓ مسلمانوں کو مسجد میں طلب کرتے، مَردوں کو بھی اور عورتوں کو بھی اور اُن سب کی رائے معلوم کرتے۔ ایسے ہی ایک وقت آپؓ نے اپنی تجویز چھوڑ کر ایک عورت کی رائے کو قبول کیا جو اُس نے مہر کی رقم کو محدود کئے جانے کے معاملہ میں رکھی تھی۔ مزید یہ کہ نبوت کے تیرھویں سال یعنی ہجرت والے سال میں آپ ﷺ کے پاس پچہتر (۷۵) مسلمان حاضر ہوئے جن میں ۷۳ مَرد اور دو عورتیں تھیں، اِن حضرات نے آپ ﷺ سے عقبہ ثانیہ والی بیعت کی جو جنگ اور قتال کی بیعت تھی یعنی ایک سیاسی بیعت تھی۔ جب یہ لوگ بیعت سے فارغ ہو گئے تو آپ ﷺ نے اُن سب کو مخاطب کر کے فرمایا:

((أخرجوا إليَّ منكم اثنى عشر نقيباً ليكونوا على قومهم بما فيهم))

اپنے میں سے بارہ سردار منتخب کرلو جو اپنے اور اپنی قوم (کی بات) کے ذمہ دار ہونگے۔

یہ حکم سب کیلئے تھا، اس میں مَردوں کی تخصیص نہیں کی گئی تھی اور نہ ہی عورتوں کو مستثنیٰ کیا گیا تھا، نہ بحیثیت اپنا نمائندہ منتخب کرنے کے اور نہ ہی خود دوسروں کا نمائندہ بننے سے۔ اب یہ مطلق خطاب، عام معنوں ہی میں لیا جائیگا جب تک کہ اس کی تخصیص کی کوئی دلیل نہ ہو۔ یہاں کلام عام اور مطلق ہے اس کی کوئی تخصیص اور قید نہیں ہے، لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دلیل دی کہ عورتیں اپنا نمائندہ منتخب کریں اور عورتوں کیلئے یہ حق رکھا کہ وہ خود دوسروں کی نمائندہ منتخب ہوں۔

ایک بار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور لوگ آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے، ساتھ میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی بیٹھے تھے۔ آپ ﷺ نے مردوں اور عورتوں سے بیعت لی، یہ بیعت صرف حکومت کی بیعت تھی نہ کہ دینِ اسلام کی بیعت، کیونکہ یہ عورتیں (اور مَرد) پہلے سے ہی مسلمان تھے۔ اسی طرح حدیبیہ میں بیعتِ رضوان کے بعد عورتوں نے بھی آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا النَّبِىُّ إِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنَـٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰٓ أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْـًٔا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَـٰدَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَـٰنٍ يَفْتَرِينَهُۥ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِى مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾

اے نبی، جب مومن عورتیں تمہارے پاس آکر تم سے اس پر بیعت کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کریں گی، اور نہ چوری کریں گی، نہ زنا کریں گی نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی، اور نہ اپنے ہاتھوں اور اپنے پیروں کے درمیان کوئی بہتان گھڑ لائیں گی، اور نہ کسی امرِ معروف میں تمہاری نافرمانی کریں گی، تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے لئے اللہ سے دعائے مغفرت کرو؛ یقیناً اللہ بہت مغفرت فرمانے والا، نہایت رحم والا ہے۔

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: سورۂ ممتحنہ: آیت:۱۲)

یہ بیعت بھی حکومت کی بیعت تھی کیونکہ قرآن کریم نے خود یہ صاف کر دیا کہ وہ عورتیں مومنات ہیں۔ یہ بیعت اس بات کی تھی کہ وہ عورتیں آپ ﷺ کی اطاعت کرینگی اور حکم عدولی نہیں کرینگی (وَلَا يَعْصِينَكَ فِى مَعْرُوف)۔

اس طرح عورت کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی رائے پیش کرنے کے لئے کسی اور کو اپنا نمائندہ مقرر کرے یا خود کسی کی رائے پیش کرنے کیلئے اُن کا نمائندہ بنے، کیونکہ اسے اپنی رائے دینے کا حق ہے چنانچہ رائے دینے کیلئے کسی کو نمائندہ بنانے کا بھی اختیار ہوا۔ پھر یہ کہ نمائندگی میں مَرد ہونے کی شرط نہیں ہوتی، لہٰذا وہ دوسروں کو منتخب کر سکتی ہے۔

البتہ اس سب کے باوجود غیر مسلمانوں کو یہ حق نہیں کہ وہ تشریع یعنی قانون سازی کے امور میں اپنی رائے دیں، کیونکہ

اسلامی قانون سازی اسلامی عقیدہ پر مبنی ہوتی ہے، یہ وہ احکام شرعیہ ہوتے ہیں جو ادلہ تفصیلیہ سے مستنبط ہوتے ہیں، جو انسانی مسائل کا ایک مخصوص نقطہ نظر کے حوالے سے حل پیش کرتا ہے، ایسا نقطۂ نظر جو اسلامی عقیدہ پر مبنی ہے، جبکہ غیر مسلم کا عقیدہ اسلامی عقیدہ سے متناقض ہوتا ہے۔ زندگی کے بارے میں غیر مسلم کا نقطۂ نظر اسلامی نقطۂ نظر سے ٹکراتا ہے لہٰذا قانون سازی میں اُس کی رائے نہیں لی جاتی۔

اسی طرح غیر مسلم کو خلیفہ کے انتخاب میں شامل ہونے کا حق نہیں ہوتا اور نہ ہی خلافت کیلئے امیدواروں کی نامزدگی میں اُس کا دخل ہوتا ہے، کیونکہ اُسے حکومت میں حق نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ مجلس امت کے باقی اختیارات میں اور رائے پیش کرنے میں غیر مسلم کی حیثیت بالکل ایک مسلم کی طرح ہوتی ہے۔

مجلس امت کے اختیارات:

مجلس امت کے اختیارات حسبِ ذیل ہوتے ہیں:

۱-الف) ایسے عملی معاملات میں جن میں تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہ ہو مثلاً حکومت کے تعلیم، صحت، اقتصاد و تجارت، صنعت، زراعت وغیرہ سے متعلق امور میں خلیفہ کو مجلس امت سے رائے لینا ہوتا ہے اور مجلس امت کا یہ حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی رائے پیش کرے۔ خلیفہ ایسے معاملات میں پیش کردہ رائے کا پابند ہوتا ہے۔

ب) فکری امور جن میں تحقیق (Research) اور تفتیش (Scrutiny) مطلوب ہو، نیز فنی معاملات (Technical matters)، مالیاتی امور (Financial matters)، فوجی امور (Military affairs)، اور خارجہ پالیسی (Foreign policy) سے متعلق امور میں خلیفہ کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ مشورہ کیلئے مجلس امت سے رجوع کرے اور اُن کی رائے معلوم کرے، البتہ خلیفہ اِن امور میں مجلس امت کے مشورہ کا پابند نہیں ہوتا۔

۲-خلیفہ کو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ جو احکام یا قوانین تبنی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، اُنہیں مجلس امت کے سامنے پیش کرے، اور مجلس کے مسلم اراکین اُن پر بحث کریں اور ان کے متعلق اپنی رائے، اُن احکام و قوانین میں اچھائی یا غلطی کے اعتبار سے دیں۔ البتہ خلیفہ اس رائے کا پابند نہیں۔

۳-مجلس کو ریاست میں ہونے والے تمام کاموں میں، خواہ وہ ریاست کے داخلی معاملات ہوں یا خارجی امور، مالیات سے متعلق ہوں یا فوج سے یا کوئی اور، اِن سب میں خلیفہ کا محاسبہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ اگر یہ وہ معاملات ہیں جن میں خلیفہ اکثریت کی رائے کا پابند ہے تو مجلس امت کی رائے کا پابند ہوگا، اور اگر یہ وہ معاملات ہیں جن میں خلیفہ اکثریت کی رائے کا پابند نہیں، تو پھر خلیفہ ایسے محاسبہ میں مجلس امت کی رائے کا پابند نہیں ہوگا۔

اگر مجلس امت خلیفہ سے کسی ایسے کام کے شرعی یا خلافِ شرع ہونے میں اختلاف کرے جو انجام پا چکا ہو، تو یہ

معاملہ محکمۂ مظالم سے رجوع کیا جائیگا اور محکمۂ مظالم کی رائے قابل التزام ہوگی۔

۴۔مجلس امت کو یہ حق ہے کہ وہ معاونین، والیان اور عمال سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرے اور ان معاملات میں مجلس کی رائے قابل التزام ہوگی، اور خلیفہ اُنہیں معزول کرنے کا پابند ہوگا۔

۵۔مجلس امت کے مسلمان اراکین کو خلافت کیلئے امیدوار طے کرنے کا حق ہے اور اُن کی رائے قابل التزام ہے، بلکہ صرف وہی خلافت کے امیدوار ہو سکتے ہیں جنہیں مجلس امت بحیثیت امیدوار نامزد کرے۔

یہ مجلس امت کے اختیارات ہوئے۔

اس میں پہلی دفعہ دو حصوں پر مشتمل ہے: پہلے حصہ کیلئے اللہ تعالیٰ کا یہ قول دلیل ہے:

﴿وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾

اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن: سورۂ آلِ عمران: آیت:۱۵۹)

اور

﴿وَاَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ﴾

اُن کا معاملہ اُن کے آپس کے مشورے سے چلتا ہے (ترجمہ معانیٔ قرآن: سورۂ شوریٰ: ۳۸)

اس طرح شوریٰ کو ہر معاملہ میں ﴿فِي الْأَمْرِ﴾ کہہ کر عام کر دیا، جہاں 'الأمر' اسم ہے جس پر 'ا' اور 'ل' ہے، پھر اللہ تعالیٰ کا قول 'وَاَمْـرُهُـم' جنس مضاف ہے، دونوں کلمات میں 'امـر' مشترک اور عام ہے حالانکہ احکام شرعیہ کے باہر یہ عام مخصوص ہو جاتا ہے، کیونکہ احکام شرعیہ بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ ہیں اور ان میں انسانی رائے کا مطلق دخل نہیں ہو سکتا کہ صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی اکیلا حاکم اور صاحب شرع ہے۔

عملی معاملات میں اور اُن امور میں جن میں تحقیق وتفتیش لازمی نہ ہو، اُن میں مجلس امت کی رائے کا قابل التزام ہونا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس فعل سے ماخوذ ہے کہ آپ ﷺ نے باوجود اپنی اور کبار صحابہ کی رائے مدینہ کے اندر رہ کر مقابلہ کرنے کی تھی، آپ ﷺ نے اکثریت کی رائے کو قبول فرمایا اور جنگ احد کیلئے شہر سے باہر جا کر مقابلہ آرائی کی۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو یہ فرمانا کہ:

((لو اجتمعتا فی مشورة ما خالفتكما))

اگر تم لوگ مشورہ میں ایک رائے پر متفق ہوتے، تو میں اُس کے خلاف نہ کرتا۔ (مسند احمد: راوی ابن غنم الاشعري)

یہ قول بھی اُن معاملات میں مجلس امت کی رائے کے قابل التزام ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

پہلی دفعہ کے دوسرے حصہ کی دلیل یہ ہے کہ جنگ بدر کے موقع پر آپ ﷺ نے صحابہ کی رائے لے کر اُس کو قبول نہ

کرنا تو درکنار، حضرت حباب ابن منذر کی رائے کو دیگر صحابہ کی رائے لئے بغیر تسلیم کرلیا۔ لہٰذا فکری امور یا فنی معاملات، مالیات سے متعلق امور فوجی معاملات اور خارجہ پالیسی میں اصحابِ اختصاص (Experts/Specialists) سے رجوع کیا جائیگا اور اُس میں اکثریت یا اقلیت کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔

شوریٰ کا مباحات میں ہونا قرینہ سے مندوب ثابت ہوتا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد معاملات اور کئی بار صحابہ کرامؓ سے اُن کا مشورہ لینے کیلئے رجوع فرمایا، مسند احمد میں حضرت انسؓ سے روایت نقل ہے:

(أم رسول الله صلى الله عليه وسلم شاورَ حين بلغه أبي سفيان)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان (کے قافلہ) کے آنے کی خبر ملنے پر مشورہ کیا۔

مسند احمد میں ہی حضرت انسؓ سے اُن کا قول نقل ہے:

(استشار النبى صلى الله عليه وسلم مخرجه إلى بدر فأشار عليه ابو بكرؓ ثم استشار عمرؓ فأشار عليه عمرؓ، ثم استشارهم، فقلال بعض الأنصار: إياكم يريد نبي الله صلى الله عليه وسلم يا معشر الأنصار، فقال قائل الأنصار: تستشيرنا يا نبى اللهؐ؟ إنا لا نقول كما قالت بنو إسرائيل لموسى عليه السلام: اذهب أنت و ربك فقاتلا إنا ههنا قاعدون، ولكن والذى بعثك بالحق لو ضربت أكبادها إلى برك الغماد لاتبعناك)

غزوۂ بدر کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کیا حضرت ابو بکرؓ نے اپنی رائے دی، پھر حضرت عمرؓ سے پوچھا، اُنہوں نے اپنی رائے دی، پھر (صحابہ کرام سے) پوچھا تو بعض انصار نے کہا: اے اہل انصار نبی کریم ﷺ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں، تو انصار نے کہا: اے اللہ کے نبی ﷺ آپ ہم سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں؟ ہم وہ نہیں کہیں گے جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ تم اور تمہارا ربّ جائے اور قتال کرے ہم تو یہاں بیٹھے ہیں، بلکہ اُس کی قسم جس نے آپ ﷺ کو نبی بنا کر مبعوث فرمایا ہے، اگر آپ ﷺ ہمیں (مثلاً) سمندر میں یا آگ میں کود جانے) کا بھی حکم دیں گے تو ہم تعمیل کریں گے۔

مسند احمد میں ہی حضرت عمرؓ سے حدیث بدر کے قیدیوں سے متعلق روایت کی ہے، اس میں ہے:

((فأستشار رسول اللهؐ أبا بكرؓ و علياًؓ و عمرؓ.....))

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ سے مشورہ لیا.....۔

ابن اسحٰق نے الزہری سے نقل کیا ہے:

(فلما اشتد على الناس البلاء بعث رسول اللهؐ إلى عُيَيْنة بن حصن والحارث بن

عوف المرّي وهما قائدا غطفان، فأعطاهما ثلث ثمار المدينة على أن يرجعا بمن معها عنه وعن أصحابه،فجرى بينه و بينهما الصلح،حتى كتبوا الكتاب،ولم تقع الشهادة،ولا عزيمة الصلح إلا المراوضة في ذلك،فلما أراد رسول اللهؐ أن يفعل،بعث إلى سعد بن معاذ و سعد بن عبادة،فذكر ذلك لهما واستشارهما.....)

جب لوگوں پر مشکلات سخت ہوگئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عیینۃ ابن حصن اور الحارث ابن عوف کو جو قبیلہ غطفان کے تھے، (پیغام) بھیجا جس میں تجویز تھی کہ مدینہ کی پھلوں کی پیداوار کا ایک تہائی حصہ غطفان کو دے دیں، اس شرط پر کہ وہ حضورؐ اور صحابہؓ سے لڑائی ترک کردیں، دونوں میں صلح ہوگئی اور صلح نامہ لکھا گیا جس میں کوئی گواہ نہیں تھے، اور نہ صلح کا ارادہ، صرف اس کی رضا تھی، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ارادہ فرمایا تو حضرت سعد ابن معاذؓ اور حضرت سعد ابن عبادہؓ کو طلب فرمایا اور اُنہیں (معاملہ کی تفصیل) بتائی اور اُن سے اُن کی رائے پوچھی.....۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معرکہ احد کی جگہ طے کرنے کیلئے صحابہؓ سے مشورہ فرمایا کہ آیا مدینہ میں رہ کر لڑائی کی جائے یا شہر سے باہر جا کر مقابلہ کیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ بھی مہاجرین اور انصار کے سرداروں اور علماء سے مشورہ کیلئے رجوع کرتے تھے، اُن سے مرتدین اور زکوٰۃ سے انکار کرنے والوں اور رومیوں سے جنگ کرنے وغیرہ کے بارے میں رائے لی۔ اسی طرح حضرت عمرؓ اور اُن کے بعد اور خلفاء بھی لوگوں سے مشورہ کیلئے رجوع کیا کرتے تھے۔

بعض وقت لوگ خود ہی پہل کر کے خلیفہ کو کسی معاملہ میں اپنی رائے سے آگاہ کیا کرتے تھے جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ کے خلافت سنبھالتے وقت ہوا جب حضرت ابوبکرؓ نے مرتدین سے مقابلہ کیلئے حضرت اسامہؓ کو بھیجنے کا ارادہ کیا، جب کہ عرب کی اکثریت مرتد ہوگئی تھی۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ اور حضرت سعید ابن زیدؓ حضرت ابو بکرؓ کے پاس گئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیا کہ وہ حضرت اسامہؓ کو نہ بھیجیں، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اُن کی رائے ردّ کردی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ واقعات اور اُن کے بعد خلفاء راشدین کے، جو تمام صحابہ کرام کی آنکھوں کے سامنے پیش آئے، اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ لوگوں سے مشورہ کیلئے رجوع کرنا اور اُن کی رائے معلوم کرنا مندوب ہے، لہٰذا یہ خلیفہ کیلئے مندوب ہے کہ وہ مختلف معاملات میں مشورہ کرنے اور اُن کی رائے لینے کیلئے مجلس امت سے رجوع کرے۔

جب خلیفہ عملی امور و افعال میں مجلس امت سے اُن کی رائے لینے کیلئے رجوع کرے تو اُس پر یہ واجب ہے کہ وہ اکثریت کی رائے کو تسلیم کرے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود اپنی اور دیگر اکابر صحابہ کی رائے اُس کے برخلاف ہونے کے، اکثریت کی رائے کو تسلیم کرتے ہوئے احد کی لڑائی کیلئے شہر سے باہر جانے کا فیصلہ فرمایا۔ اس سے ثابت ہوا کہ ایسے اعمال جن میں کسی تحقیق کی ضرورت نہ ہو، اُن میں مسلمانوں کی اکثریت کی رائے قبول کی جائے۔ یہ اس بات سے بھی ثابت ہوتا ہے

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے فرمایا:

لو اجتمعتا فی مشورة ما خالفتکما))

اگر تم لوگ مشورہ میں ایک رائے پر متفق ہوتے، تو میں اُس کے خلاف نہ کرتا۔ (مسند احمد: راوی ابن غنم الاشعري)

اس حدیث میں مشورہ دراصل کسی بھی معاملہ اور عملی امور میں شوریٰ ہی ہے۔

یہ معاملہ تو ہوا مجلس امت کے اختیارات میں پہلی دفعہ کے پہلے حصہ کا، رہی بات دوسرے حصہ، یعنی (ب) کی، تو اگر خلیفہ اُن افعال میں مجلس امت سے مشورہ کیلئے رجوع کرتا ہے تو وہ مجلس کی رائے کا بہرحال پابند نہیں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی ایسی بات پیش آئے تو خلیفہ، علماء، ماہرین اور اصحابِ اختصاص (Experts) سے رجوع کرتا ہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حباب ابن منذرؓ کی رائے لے کر وہ جگہ طے کی جہاں جنگِ بدر لڑی گئی۔ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ:

(إنه عليه السلام حين نزل عند أدنى ماء من بدر لم يرض الحباب بن المنذر بهذا المنزل، و قال للرسولؐ: يا رسول اللهؐ أرأيت هذه المنزل أمنزلاً أنزلكه الله ليس لنا أن نتقدمه ولا نتأخر عنه، أم هو الرأي والحرب والمكيدة؟ قال: بل هو الرأي والحرب والمكيدة، فقال: يا رسول اللهؐ فإن هذا ليس بمنزل، فانهض بالناس حتى نأتي أدنى ماء من القوم فنزله، ثم نغوّر ما وراء ه من القُلُب، ثم نبني عليه حوضاً فنملؤه ماء، ثم نقاتل القوم فنشرب ولا يشربون، فقال رسول اللهؐ: لقد أشرت بالرأي، فنهض رسول اللهؐ ومن معه من الناس، فسار حتى إذا أتى أدنى ماء من القوم نزل عليه، ثم أمر بالقُلُب فغوّرت، وبنى حوضاً على القليب الذي نزل عليه، فملئ ماء ثم قذفوا فيه الآنية)

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے موقع پر اپنا پڑاؤ (Camp) پانی کے قریب ڈالا تو الحباب بن منذر اس سے خوش نہیں تھے، اُنہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ، جنگ کیلئے جگہ جو آپ ﷺ نے چنی ہے کیا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے کہ ہم اس سے نہ آگے بڑھیں اور نہ اس سے پیچھے ہٹیں، یا پھر یہ ایک رائے ہے، یا جنگی حکمتِ عملی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ ایک رائے اور جنگی تدبیر ہے۔ پھر حباب ابن منذرؓ نے کہا: یہ صحیح جگہ نہیں ہے، لوگوں کو یہاں سے اُٹھا کر اُس مقام پر لے چلیں جہاں سے پانی دشمن کی فوجوں کے قریب ہے اور وہاں پڑاؤ ڈالیں۔ پھر ہم ایک گڈھا بنا کر پیچھے سے پانی کو اس طرف موڑ لینگے اور (اُس گڈھے کے اطراف) حوض بنا لینگے جس میں پانی بھر جائیگا، پھر ہم دشمن سے لڑینگے اور پانی ہمیں میسر ہوگا جب کہ دشمن نہیں پی پائیگا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: تم نے صحیح رائے دی۔ پھر آپ ﷺ اور تمام ساتھی اُٹھے اور اُس جگہ چلے گئے جس کی نشاندہی حضرت حبابؓ نے کی تھی۔ پھر آپ ﷺ نے حکم دیا کہ پانی کو اس طرف موڑ دیا جائے، چنانچہ یہ کیا گیا اور اُس پر حوض بنایا گیا اور اُس میں پانی بھرا، پھر لوگ اپنے برتن اُس میں ڈبو کر پانی بھرتے۔

یعنی حضور صلی علیہ وسلم نے حضرت حبابؓ کے مشورے کو سنا اور اُن کی رائے کو اختیار فرمایا۔

لہٰذا ایسے معاملات میں جو رائے، جنگی حکمتِ عملی اور تدبیر سے متعلق ہوں، اُن کے بارے میں فیصلہ کیلئے عام لوگوں کی رائے کی کوئی قیمت یا گنجائش نہیں، یہاں ایک ماہر کی رائے درکار ہوتی ہے۔ اسی طرح فکری یا فنی امور جن میں تحقیق و تفتیش درکار ہو، یا تعریفی و تصریحی امور ہوں، تو اِن معاملات میں اصحابِ اختصاص (Experts/Specialists) اور ماہرین سے رجوع کیا جائیگا نہ کہ عوام کی رائے سے، جس کی ایسے امور میں کوئی قیمت نہیں ہوتی، بلکہ وقعت تو اہل اختصاص اور ماہرین کی رائے کی ہوتی ہے۔

مالیاتی امور بھی اسی ذیل میں آتے ہیں کیونکہ شریعت نے یہ طے کر دیا ہے کہ اموال کن مَدوں میں وصول کئے جائیں اور یہ بھی طے کر دیا ہے کہ کن چیزوں پر خرچ کئے جائیں، نیز یہ بھی طے کر دیا ہے کہ ٹیکس کب عائد کیا جا سکتے ہیں، چنانچہ عوام کی رائے کا اموال کی آمد و صرف میں کوئی دخل نہیں رہا۔ اسی طرح فوجی امور بھی، کہ شریعت نے فوجی امور کی تدبیر و تصرف خلیفہ کا حق رکھا ہے۔ جہاد کے احکام متعین کر دئے گئے ہیں اور اِن میں لوگوں کی رائے اثر انداز نہیں ہوتی جب کہ شریعت نے اپنا فیصلہ دے دیا ہو۔ امورِ خارجہ بھی اسی ذیل میں آتے ہیں کہ کس ملک سے اسلامی ریاست کا کیا رشتہ ہو، کیونکہ یہ وہ معاملات ہیں جن میں تحقیق و تفتیش مطلوب ہوتی ہے اور ان کا تعلق جہاد سے ہوتا ہے جو کہ ایک جنگی تدبیر اور حکمتِ عملی پر مبنی رائے کا موضوع ہے، چنانچہ اس میں لوگوں کی رائے کی کثرت یا قلت موضوع نہیں ہوتی، اس میں خلیفہ کیلئے جواز ہے کہ وہ یہ معاملہ مجلسِ امت کے روبرو پیش کرے اور اُن کی رائے معلوم کرے، کیونکہ یہ مباحات میں داخل ہے، لیکن بہرحال مجلس کی رائے جیسا کہ جنگِ بدر کے واقعہ میں دیکھا، خلیفہ کو پابند نہیں کرتی۔

مجلس امت کے اختیارات کے ذیل میں دوسری دفعہ احکام اور قوانین سے متعلق ہے جو کہ خلیفہ کا اختیار ہے اور اُن میں گو کہ مجلس امت کی رائے کا خلیفہ پابند نہیں، لیکن وہ ایسے احکام و قوانین کو مجلس امت کے سامنے پیش کر سکتا ہے تاکہ اُن کی رائے سے آگاہ ہو جیسا کہ حضرت عمرؓ نے کیا کہ مسلمانوں سے احکام شرع کی تبنی کے معاملہ میں رجوع کیا اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اُس پر اعتراض نہیں کیا۔ اس کی مثال عراق کی مفتوحہ اراضی والے معاملہ میں آئی جس میں مسلمانوں نے آپؓ سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اُس زمین کو اُن سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے جو عراق فتح کرنے والی فوج میں شامل تھے۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے پوچھا لیکن اپنی رائے پر قائم رہے اور اُس زمین کو اُس کے مالکان کے پاس ہی رہنے دیا اس شرط پر کہ وہ اُس زمین کا ایک مقررہ خراج ادا کرینگے اور ساتھ میں اپنی جانوں کا جزیہ بھی دینگے۔ لہٰذا حضرت عمرؓ کا اور اُن سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کا

لوگوں سے پوچھنا اور اُن کا مشورہ لینا اور اس پر تمام صحابہؓ کا انکار نہ کرنا، اجماع صحابہ ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ اس بات پر متفق تھے کہ خلیفہ مسلمانوں سے اُن کے احکام شرع جو کتاب وسنت میں منصوص نہیں ہوں یا جن میں اُسے دقّت پیش آ رہی ہو جب وہ اُن کو تبنی کرنا چاہے تو وہ مسلمانوں سے رجوع کر سکتا ہے لیکن بہر حال اُن کی رائے قابل التزام نہیں ہوتی۔

مجلس امت کے غیر مسلم اراکین کو ایسے احکام وقوانین جو خلیفہ تبنی کرنا چاہتا ہو، اس میں رائے دینے کا اختیار نہیں ہوتا، کیونکہ اُن کا اسلام پر ایمان نہیں۔ اُن کا رائے دینے کا حق حکام کے ذریعہ کئے گئے کسی ممکنہ ظلم تک محدود ہے نہ کہ احکام شرع و قوانین کے تبنی کئے جانے کے بارے میں رائے دینے کا گو کہ بہر حال مجلس امت کی رائے اِن معاملات میں قابل التزام نہیں۔

دفعہ نمبر ۳ کی دلیل عمومی نوعیت کی ہے جو حکام کے محاسبہ کے بارے میں آئی ہے، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے مسند احمد میں روایت نقل کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((سيكون عليكم أمراء يأمرونكم بما لا يفعلون،فمن صدقهم بكذبهم و أعانهم على ظلمهم،فليس مني وليست منه،ولن يرد عليّ الحوض))

تمہارے اوپر ایسے امرا ہونگے جو تمہیں ایسی باتوں کا حکم دینگے جس پر وہ خود عمل پیرا نہیں ہونگے، تو جو کوئی اُن کے جھوٹ کو سچا کہے گا وہ مجھ میں سے نہیں اور میں اُس میں نہیں اور وہ میرے ساتھ حوض (کوثر) پر نہیں ہوگا۔

مسند احمد ہی میں ایک اور روایت حضرت ابی سعید الخدریؓ سے نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((..... أفضل الجهاد كلمة الحق عند سلطان جائر))

ظالم سلطان کے سامنے حق بات کہنا بہترین جہاد ہے۔

حاکم نے حضرت جابرؓ سے حدیث نقل کی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((سيد الشهداء حمزة بن عبد المطلب،ورجل قام إلى إمام جائر فأمره و نهاه فقتله))

شہداء کے سردار (حضرت) حمزہ بن عبدالمطلبؓ اور وہ شخص ہے جو ایک ظالم بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو اور اُسے اچھائی کا حکم دے اور برائی سے روکے اور پھر وہ قتل کر دیا جائے۔

مسلم شریف میں عوف بن مالک الاشجعی سے نقل کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((.....ألا من ولي عليه والٍ فرآه يأتي شيئاً من معصية الله، فليكره ما يأتي من معصية الله ولا ينزعنّ يداً من طاعة))

خبردار! جس پر کوئی والی ہو اور وہ اُس والی کو اللہ تعالیٰ کی معصیت کرتا دیکھے، تو اُسے چاہئے کہ وہ والی کی معصیت

سے کراہت کرے، لیکن اُس کی اطاعت سے اپنا ہاتھ نہ کھینچ لے۔

مسلم شریف ہی میں حضرت ام سلمہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ستكون أمراء فتعرفون وتنكرون،فمن عرف برئ،ومن أنكر سلم ولكن رضي وتابع.....،))

ایسے امراء ہونگے (جن کے بعض قابلِ اعتراض کاموں کو تم پہچانو گے) اور بعض (کے ماننے) سے انکار کروگے، سو جو پہچان جائیگا وہ گناہ سے بری ہوا اور جس نے (وہ برائی) ماننے سے انکار کیا وہ محفوظ ہوگیا، لیکن جو اُن کاموں سے راضی ہوگیا اور اتباع کیا (وہ محفوظ نہ رہا).....۔

ان تمام نصوص سے ثابت ہوتا ہے کہ محاسبہ کسی بھی عمل کا کیا جاسکتا ہے، اور صحابہ کرامؓ نے جب صلح حدیبیہ کے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا اعتراض جتایا جو کہ بہت شدید اعتراض تھا، تو بھی آپ ﷺ نے اُن کا اعتراض سخت ہونے کے باوجود، اُنہیں تنبیہ یا اُن کی سرزنش نہیں فرمائی بلکہ اُن کی رائے قبول نہیں فرمائی اور اُنہیں شرائط پر صلح کر لی کیونکہ آپ ﷺ نے جو عمل کیا وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے وحی تھا جس میں لوگوں کی آراء کا دخل نہیں ہوسکتا۔ آپ ﷺ نے جو صحابہ کی سرزنش فرمائی وہ اس بات پر تھی کہ اُنہوں نے قربانی کے جانور ذبح کرنے، اپنے بال اتروانے اور احرام کی حالت سے باہر آنے کے حکم کی اطاعت نہیں کی تھی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے حضرت حباب بن منذرؓ کی بھی تنبیہ نہیں کی تھی جب اُنہوں نے جنگِ بدر کے وقت پڑاؤ ڈالنے کی جگہ طے کئے جانے پر اعتراض کیا تھا، بلکہ آپ ﷺ نے اُن کی رائے قبول فرمائی تھی۔ لہٰذا مجلس امت کسی بھی کام میں، خواہ وہ احکام شرع کی خلاف ورزی سے متعلق ہو، کوئی غلطی ہو، مسلمانوں کیلئے باعثِ ضرر ہو، رعایا پر ظلم سے متعلق ہو یا عوام کی خبر گیری میں کوئی کوتاہی ہو، خلیفہ، معاونین، والیوں اور عمال کا محاسبہ کرسکتی ہے۔ اِس پر خلیفہ کیلئے واجب ہے کہ وہ اُن کاموں یا اُن امور کے متعلق یا اپنے طرزِ عمل کے متعلق اپنا نقطۂ نظر پیش کرے اور جو کام محاسبہ کے لحاظ سے زیر بحث ہوں اُن کے دلائل مجلسِ امت کے سامنے رکھے تاکہ مجلس کو خلیفہ کے تعلق سے اس کی بہتر کارکردگی اور اسکی راست بازی سے اطمنان ہوجائے۔ اس صورت میں جب مجلسِ امت خلیفہ کے زاویہ نظر کو یا اُس کے دلائل کو قبول نہیں کرتی، تو اگر یہ وہ معاملات ہیں جن میں اکثریت کی رائے قابلِ التزام ہے تو خلیفہ مجلس کی اس رائے کا پابند ہوگا اور اس کے برخلاف اگر یہ وہ امور ہیں جن میں اکثریت کی رائے قابلِ التزام نہیں تو اُن معاملات میں مجلس کی رائے کا خلیفہ پابند نہیں ہوگا۔

یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ جب خلیفہ محاسبہ کا پابند نہیں تو پھر اس کی افادیت کیا ہے؟ اسلئے کہ محاسبہ ایک حکم شرعی ہے جس کا ہونا لازمی ہے اور یہ فرضِ کفایہ ہے۔ پھر یہ کے محاسبہ سے آراء کا اظہار ہوتا ہے اور وضاحتیں سامنے آتی ہیں۔ اس سے رائے عامہ کو شعور مہیا ہوتا ہے، اور رائے عامہ کی طاقت فوجوں کی طاقت سے زیادہ ہوتی ہے جس سے ہر جگہ حکام محتاط رہتے ہیں۔ اس

نظریہ سے محاسبہ کی عظیم افادیت ہے۔

مزید یہ کہ اگر محاسبہ کرنے والے کسی معاملہ میں حکام سے اُس کے شرعی ہونے کے اعتبار سے اختلاف کرتے ہیں تو پھر یہ معاملہ مجلس امت کے ذریعہ محکمۂ مظالم سے رجوع کیا جائیگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الذِينَ آمَنُوا أَطِيْعُوا اللهَ وَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ وَ أُوْلِي الأَمْرِ مِنْكُمْ فإن تَنَازَعْتُمْ فِي شئٍ فَرُدُّوهُ إلى اللهِ والرَّسُولِ﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اُن کی جو تم میں صاحبِ امر ہیں۔ پھر اگر کسی چیز میں تمہارا تنازعہ ہو جائے تو، اُسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: نساء:۵۹)

یعنی اگر مسلمانوں اور حکام کے درمیان کوئی تنازعہ ہوتا ہے تو اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف لوٹا دو یا اُن سے رجوع کرو، یعنی اُس تنازعہ میں اللہ اور اُس کے رسول کے حکم کو ثالث بنا لو، بالفاظ دیگر اُس میں قضاء سے رجوع کرو۔ لہٰذا یہ معاملہ محکمۂ مظالم سے رجوع کیا جائیگا جس کی رائے قابل التزام ہوگی۔

مجلس امت کے اختیارات کے ضمن میں چوتھی دفعہ کی دلیل یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے العلاء بن الحضرمیؓ کو معزول فرمایا تھا جو بحرین کے عامل تھے، کیونکہ عبد قیس کے وفد نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تھی۔ ابن سعد محمد بن عمر کی روایت نقل کرتے ہیں:

(أن رسول اللہؐ قد كتب إلى العلاء بن الحضرمى أن يقدم عليه بعشرين رجلاً من عبد قيس،فقدم عليه بعشرين رجلاً رأسهم عبدالله بن عوف الأشجّ،واستخلف العلاء على البحرين المنذر بن ساوى،فشكا الوفد العلاء بن الحضمرى،فعزله رسول اللہؐ وولّى أبان بن سعيد بن العاص،وقال له استوص بعبد القيس خيراً أأكرم سراتهم)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے العلاء بن الحضرمی کو لکھا کہ وہ عبد قیس کے بیس افراد کے ساتھ آئیں، العلاء اپنے پیچھے منذر بن ساوی کو اپنا نائب مقرر کر کے اور بیس آدمیوں کو عبداللہ بن عوف الاشج کی قیادت میں لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضر ہوئے۔ وفد نے العلاء کی شکایت کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنہیں معزول کر دیا اور ابان ابن سعید بن العاص کو اُن کی جگہ بحرین کا والی مقرر کیا اور اُنہیں عبد قیس سے اچھا برتاؤ کرنے اور اُس کے سرداروں کا احترام کرنے کی نصیحت فرمائی۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے بھی حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کو ولایت سے محض شکایت کی بنیاد پر معزول فرمایا اور کہا: أنى لم أعزله عن عجز ولا عن خيانة، ''میں نے اُنہیں اُن کی کسی کمزوری یا خیانت کے سبب معزول نہیں کیا ہے''۔ یہ اس

بات کی دلیل ہے کہ ولایت کے عوام کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے امراء یا والیوں سے کسی بات پر ناراض ہوں اور اپنی ناراضی کا اظہار کریں اور خلیفہ اس بات کا پابند ہے کہ اُنہیں معزول کر دے۔ اسی طرح مجلس امت جو کہ تمام ولایات میں مسلمانوں کی نمائندہ ہوتی ہے اُسے یہ حق ہے کہ وہ والیوں اور عمال سے اپنی ناراضی کا اظہار کرے اور خلیفہ اُنہیں فوراً برخواست کر دے۔

پانچویں دفعہ کی دلیل یہ ہے کہ یہ ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ جب زخمی ہوئے تھے اور اُن کے بچنے کی کوئی توقع نہیں تھی تو مسلمانوں نے آپؓ سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ کسی کو خلیفہ نامزد کریں جسے حضرت عمرؓ نے پہلے تو ٹھکرا دیا تھا، لوگوں کے دوبارہ مطالبہ پر آپؓ نے چھ افراد کو نامزد فرمایا اور اس پر صحابہ کرام کا اجماع سکوتی ہوا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مجلس امت کے مسلم اراکین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خلافت کیلئے امیدوار طے کریں اور اس معاملہ میں اُن کی رائے قابل التزام ہوگی، جیسا کہ حضرت عمرؓ سے ثابت ہے کہ آپؓ نے پچاس آدمیوں کو اس بات پر مقرر کیا کہ وہ اُن چھ امیدواروں پر نگاہ رکھیں اور اُنہیں حکم دیا کہ وہ اُن چھ میں سے جو شخص طے شدہ امر کی مخالفت کرے اسے قتل کر دیں۔ اس کام کیلئے آپؓ نے اُن چھ امیدواروں کو تین دن کی مہلت دی اور یہ قابل التزام ہے۔ رہی بات غیر مسلموں کے اس نامزدگی امیدواری میں حق نہ ہونے کی تو وہ اسلئے ہے کہ بیعت مسلمانوں کیلئے مخصوص ہے۔

اظہارِ رائے اور گفتار کا حق:

مجلس امت کے ہر رکن کو اپنی بات کرنے اور اپنی رائے کے، بغیر کسی رکاوٹ کے اُن حدود میں جو شرع نے حلال رکھی ہیں، اظہار کا حق ہوتا ہے۔ ایک رکن مسلمانوں کی رائے پیش کرنے اور محاسبہ کرنے میں اُن کا نمائندہ ہوتا ہے۔ خلیفہ یا ریاست کا کوئی بھی حاکم یا ریاست کے کسی بھی ادارے کے ملازم کے کاموں پر باریکی سے نگاہ رکھنا اور اُن کا محاسبہ کرنا اور انہیں صحیح مشورہ دینا، تجاویز رکھنا اور اُن پر گفت و شنید کرنا، حکومت کے وہ کام جو غلط ہوں اُن پر اعتراضات کرنا مجلس امت کے رکن کے واجبات میں داخل ہے۔ رکن کا یہ عمل مسلمانوں کی نیابت میں ہوتا ہے، جنہیں یہ حکم ہے کہ وہ اچھائی کا حکم دیں، برائی سے روکیں، حکام کا محاسبہ کریں اور اپنی رائے اور تجاویز اُنہیں دیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾

تم ایک بہترین امت ہو جو لوگوں کے سامنے لائی گئی، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

(ترجمہ معانی قرآن کریم: سورۂ آلِ عمران: آیت: ۱۱۰)

اور فرمایا:

﴿الَّذِينَ إِنْ مَّكَّنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَءَاتَوُا الزَّكٰوةَ وَ أَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر زمین میں ہم انہیں اقتدار عطا کریں، تو وہ نماز قائم کریں گے، اور زکوٰۃ دیں گے اور معروف کا حکم کریں گے اور منکر سے روکیں گے؛ (ترجمہ معانیٔ قرآن: سورۂ حج آیت: ۴۱)

اور فرمایا:

﴿وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الخَيرِ وَ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾

اور تم میں ایک ایسی جماعت ضرور ہونا چاہئے جو خیر کی طرف بلائے اور نیکی کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے ؛ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: سورۂ آلِ عمران: آیت: ۱۰۴)

نیز متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف دلالت کرتی ہیں، مثلاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول جسے مسند احمد میں حذیفہؓ سے نقل کیا ہے:

((والذي نفسي بيده لتامرنَّ بالمعروف ولتنهون عن المنكر أو ليوشكنَّ الله أن يبعث عليكم عقاباً من عنده، ثم لتدعنه فلا يستجيب لكم))

قسم اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تمہیں اچھائی کا حکم دینا ہے اور برائی سے روکنا ہے، یا اللہ تم پر ایسا عذاب نازل کریگا کہ تم اس سے دعا مانگو گے اور وہ سنی نہیں جائیگی۔

اور یہ قول جسے مسلم شریف میں حضرت ابی سعیدؓ سے نقل کیا ہے:

((من رأى منكم منكراً فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه و ذلك أضعف الإيمان))

تم میں سے جو کوئی منکر دیکھے، وہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے، اور اگر ہاتھ سے نہ بدل سکے تو زبان سے بدل دے اور اگر زبان سے بھی نہ بدل سکے تو دل سے، اور یہ ایمان کا سب سے کم درجہ ہے۔

ان آیات اور احادیث میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ معروف کا حکم دیں اور منکر سے روک دیں، بلکہ حکام کے محاسبہ کیلئے خاص طور سے احادیث وارد ہوئی ہیں جن میں حاکم کا محاسبہ، حاکم کو معروف کا حکم دینا اور برائی سے روکنے کی اہمیت ہے۔ ام عطیہ سے حضرت ابی سعید الخدریؓ کی روایت نقل ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أفضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر))

ظالم سلطان کے سامنے حق بات کہنا بہترین جہاد ہے۔

یہ نص حکام کے محاسبہ اور اُن کے سامنے حق بات کہنے کی اہمیت کے بارے میں ہے، اسے جہاد سے، بلکہ بہترین جہاد ہونے سے متصف کیا ہے۔ پھر اس کی طرف یہ کہہ کر ترغیب دلائی ہے، بلکہ جھنجھوڑا ہے کہ خواہ قتل کر دئے جاؤ، جیسا کہ حضور

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث میں مروی ہے:

((سید الشهداء حمزة بن عبد المطلب،ورجل قام إلى إمام جائر فأمره و نهاه فقتله))

شہداء کے سردار (حضرت) حمزہ بن عبدالمطلبؓ اور وہ شخص ہے جو ایک ظالم بادشاہ کے سامنے کھڑا ہوا اور اُسے (اچھائی کا) حکم دے اور (برائی سے) روکے اور پھر وہ قتل کر دیا جائے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے اعتراض کا اظہار کیا اور پھر اُن ﷺ کے بعد خلفائے راشدینؓ کا محاسبہ کیا، اُنہیں نہ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے اس بات پر تنبیہ کی اور نہ کوئی سرزنش۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ بدر کے موقع پر حضرت حباب بن منذرؓ کی تجویز قبول فرمائی، جنگِ احد کے وقت اکثریت کی رائے کو قبول کرتے ہوئے مدینہ کے باہر جا کر قریش کا مقابلہ کیا جبکہ آپ ﷺ کی اپنی رائے اس کے برخلاف تھی، پھر حدیبیہ کے موقع پر مسلمانوں نے اور خاص طور پر حضرت عمرؓ نے سخت اعتراض کیا، جنگ حنین کے وقت انصار صحابہؓ اس بات پر غصہ میں تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مال کو تالیف قلوب کیلئے تقسیم فرما دیا اور انصار کا کوئی حصہ نہ رکھا۔

صحابہؓ نے حضرت عمرؓ جب منبر پر کھڑے تھے اور یمن سے آئے ہوئے ملبوسات تقسیم فرما رہے تھے، تو اُن کا محاسبہ کیا، حضرت عمرؓ پر ایک عورت نے مہر کی رقم طے کرنے کے معاملہ میں اعتراض کیا، شام اور عراق کی زمین تقسیم نہ کرنے کے سلسلہ میں صحابہ نے اُن پر اعتراض بھی کیا اور اُن کا محاسبہ بھی کیا جن میں سب سے شدید حضرت بلالؓ اور حضرت زبیرؓ تھے۔ حضرت عمرؓ اُن سے گفتگو کرتے اور صحابہ سے مشورہ کرتے تاکہ وہ لوگ مطمئن ہو جائیں۔

لہٰذا مجلس امت کے ہر رکن کو مسلمانوں کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے یہ حق ہے کہ وہ مجلس میں جیسے چاہے اپنی بات رکھے، بغیر کسی کے روکے، بغیر کسی قسم کے دباؤ کے، اور اسے یہ حق ہے کہ وہ خلیفہ، معاونین والیوں اور ریاست کے کسی بھی ملازم کا محاسبہ کرے اور اُن لوگوں پر یہ لازم ہے کہ وہ اُس کا جواب دیں جب تک کہ وہ رکن اپنی رائے رکھنے اور اُن کے محاسبہ کرنے میں احکام شرع کا پابند ہے۔

اسلام کی تنفیذ بیکوقت ہوگی، اس میں تدرّج حرام ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن حکیم کا نزول حالات و واقعات کے اعتبار سے تھوڑا تھوڑا اور بتدریج ہوتا رہا، جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی، فوراً اُس کو مسلمانوں تک پہنچا دیا جاتا، اگر اُس آیت میں کوئی حکم ہوتا تو فوراً اس کا نفاذ کیا جاتا، اور اگر اُس میں کوئی نہی ہوتی تو فوراً لوگ اُس سے رک جاتے اور اجتناب کرنے لگتے۔ یعنی کسی آیت کے نازل ہوتے ہی بغیر کسی تاخیر کے اُس کے احکام کی تنفیذ ہو جاتی۔ کوئی بھی حکم نازل ہوتے ہی قابل نفاذ بن جاتا، خواہ اُس میں حکم کسی بھی نوعیت کا ہو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے دین کو مکمل فرما دیا اور یہ آیت نازل ہوئی:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا﴾

آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور میں نے تمہارے لئے بحیثیتِ دین اسلام کو پسند کیا۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: سورۂ المائدہ: آیت: ۳)

اس آیت کے نازل ہوتے ہی مسلمان اس بات کے پابند ہو گئے کہ اسلام کے تمام احکامات کو مکمل طور سے نافذ و جاری کر دیں، خواہ اُن کا تعلق عقائد سے ہو، عبادات سے متعلق ہوں، اخلاق کے ضمن میں ہوں یا معاملات کے زمرہ میں اور خواہ اِن معاملات کا تعلق مسلمانوں کا ایک دوسرے سے ہو، یا مسلمانوں کا تعلق حکام سے ہو یا مسلمانوں کا تعلق دوسرے ممالک اور دیگر قوموں سے ہو۔ یہ احکام خواہ حکومت سے متعلق ہوں، اقتصاد سے، معاشرتی نظام سے یا امن کے دوران خارجہ پالیسی سے متعلق ہوں یا حالاتِ جنگ میں خارجہ پالیسی سے متعلق ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَآ ءَ تَكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوه وَمَا نَهَكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُواْ وَاتَّقُواْ اللهَ إِنَّ اللهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾

رسول جو کچھ تمہیں دے اسے لے لو؛ اور جس چیز سے وہ تمہیں روک دے، اس سے رُک جاؤ اور اللہ کا ڈر رکھو، یقیناً اللہ عذاب میں بہت سخت ہے۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: سورۂ الحشر: آیت: ۷)

یعنی، جو کچھ رسول ﷺ تمہیں دیں، وہ سب کچھ لے لو اور جس کسی چیز سے منع فرما دیں، اس سب سے دور ہو جاؤ۔ کیونکہ اس آیت میں (مَـا) یعنی 'جو کچھ' آیا ہے جو عمومی نوعیت کا ہوتا ہے، اس میں ہر اُس کام کے کرنے کو واجب بتایا ہے جو کہا جائے اور ہر اس کام سے رک جانے کا حکم ہے جس سے روکا جائے۔ یہاں عمل اور اجتناب عن العمل کے سلسلہ میں جو حکم ہے وہ طلب جازم ہے جو کہ واجب ہوتا ہے، اس کا قرینہ یہ ہے کہ آیت کے آخر میں تقوے کا حکم ہے اور اُن کیلئے شدید عذاب کی وعید ہے جو اُن تمام چیزوں کو تسلیم نہیں کرتے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے اور اُن تمام اشیاء سے رُک نہیں جاتے جن سے منع کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَاَنِ احکُم بینھم بمآ انزل اللہُ وَلا تتبع اھواءَ ھم وَاحذرھم اَن یفتِنُوکَ عن بعضِ ما انزل اللہُ الیک﴾

اور یہ کہ تم اُن کے درمیان وہی فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے، اور اُن کی خواہشات کی پیروی نا کرنا، اور اُن سے بچتے رہو کہ مبادہ تمہیں فریب میں ڈال کر اس کے کسی حصے سے منحرف کر دیں جو خدا نے تمہاری طرف نازل کیا ہے۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: مائدہ:۴۹)

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قطعی حکم دیا ہے اور بعد میں آنے والے تمام حکام پر یہ فرض قرار دیا ہے کہ وہ اُنہیں احکام کا حکم دیں جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے ہیں، چاہے وہ صیغہ اُمر کے ہوں یا نہی سے متعلق، کیونکہ لفظ (ما) یعنی جو کچھ، صیغۂ عموم ہے اور اُس میں تمام نازل کردہ احکامات شامل ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ ﷺ کے بعد آنے والے تمام مسلم حکام کو اس بات سے منع فرمایا ہے کہ وہ لوگوں کی خواہشات کی پیروی کریں:

﴿وَلاَ تَتَّبِعْ أَھْوَآ ءَ ھُمْ﴾

اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرنا (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: سورۂ مائدہ: آیت:۴۹)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ ﷺ کے بعد آنے والے حکام کو خبردار کیا کہ وہ لوگوں کے فتنہ میں پڑ کر اللہ کے نازل کردہ کسی حکم کی تنفیذ سے غافل نہ ہو جائیں، بلکہ اُن پر یہ لازم ہے کہ وہ اسلام کے تمام احکام جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے ہیں، خواہ وہ اوامر ہوں یا نواہی، اُنہیں بغیر اس بات سے متاثر ہوئے کہ لوگ کیا چاہتے ہیں، نافذ و جاری کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاحذرھم اَن یفتِنُوکَ عن بعضِ ما انزل اللہُ الیک﴾

اور ان سے بچتے رہو کہ مبادا تمہیں فریب میں ڈال کر اس کے کسی حصے سے منحرف کر دیں جو خدا نے تمہاری طرف نازل کیا ہے۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: مائدہ:۴۹)

اور فرمایا:

﴿وَ مَن لَمْ یَّحْکُمْ بِمَآ انزلَ اللہُ فأُولٰئکَ ھُم الکَافِرُون﴾

اور جو شخص اللہ تعالےٰ کے نازل کئے ہوئے کے موافق حکم نہ دے تو ایسے لوگ کافر ہیں۔

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: مائدہ:۴۴)

اس کے بعد اگلی آیت میں فرمایا:

﴿وَ مَن لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ انزلَ اللهُ فأُولٰئكَ هُم الظَّالِمُونَ﴾

اور جو شخص اللہ تعالےٰ کے نازل کئے ہوئے کے موافق حکم نا کرے تو ایسے لوگ ظالم ہیں۔

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: مائدہ: ۴۵)

اس کے بعد تیسری آیت میں فرمایا:

﴿وَ مَن لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ انزلَ اللهُ فأُولٰئكَ هُم الفَاسِقُونَ﴾

اور جو شخص اللہ تعالےٰ کے نازل کئے ہوئے کے موافق حکم نا کرے تو ایسے لوگ فاسق ہیں۔

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: مائدہ: ۴۷)

اِن تینوں آیات میں اللہ تعالیٰ نے اُن حاکموں کو جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ تمام احکامات سے، خواہ وہ اوامر ہوں یا نواہی، نافذ و جاری نہیں کرتے، اُنہیں کافر، ظالم اور فاسق بتایا ہے کیونکہ اِن تینوں آیات میں بھی جو (مـــا) وارد ہوا ہے وہ صیغۂ عموم سے ہے یعنی اُس کے ضمن میں تمام احکامات آجاتے ہیں اوامر بھی اور نواہی بھی۔

اِن سب سے یہ بات صاف اور قطعی ہو جاتی ہے جس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں کہ مسلمانوں پر بحیثیتِ فرد، بلحاظِ جماعت اور بطورِ ریاست یہ واجب ہو گیا کہ وہ اسلام کے احکامات کی مکمل تنفیذ کریں جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا مطالبہ ہے، اور یہ نفاذ بغیر کسی تاخیر کے فوراً ہو اور پوری طرح ہو نہ کہ قسطوں میں، اور یہ کہ کسی فرد، جماعت یا ریاست کیلئے ایسا نہ کرنے کا کوئی عذر نہیں ہے۔

یہ لازم ہے کہ نفاذ مکمل اور جامع ہو ایک بار میں ہو نہ کہ بتدریج۔ اسلام کے احکام کا بتدریج نفاذ خود ہی اسلام کے احکامات سے متناقض ہے۔ جو اسلام کے بعض احکامات کو نافذ کرے اور بعض کو نہ کرے، وہ فرد، جماعت یا ریاست اللہ تعالیٰ کے نزدیک گنہگار ہے۔

لہٰذا واجب ہر حال میں واجب ہی رہیگا اور اسے قائم کرنا ہی ہے، اسی طرح حرام بہرحال حرام ہی رہیگا اور اُس سے بچنا ہی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے، جب اُن کے پاس ثقیف کا وفد آیا اور یہ مطالبہ رکھا کہ اُن کے الٰہ، یعنی لات کو تین سال تک اُن کے پاس رہنے دیا جائے اور اُنہیں نماز سے معاف رکھا جائے تاکہ وہ اسلام میں داخل ہو سکیں، مکمل طور سے ردّ کر دیا اور آپ ﷺ نے حکم دیا کہ لات کو فوراً منہدم کیا جائے اور نماز فوراً قائم کی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے ایسے حاکم کو جو، یا تو اسلام کے تمام احکامات کو نافذ نہیں کرتا، یا بعض کو نافذ کرتا ہے اور بعض چھوڑ دیتا ہے، کافر بتایا ہے، بشرطیکہ وہ اسلام کو معقول، بجا اور قابلِ عمل نہیں سمجھتا ہو۔ وہ حاکم جو ان احکامات کو معقول، بجا اور قابلِ عمل تو سمجھتا ہے لیکن اُنہیں پوار کا پورا یا اُن میں سے کچھ، نافذ نہیں کرتا، ایسے حاکم کو ظالم اور فاسق بتایا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے حاکم سے قتال، اور اس سے بزورِ طاقت مقابلہ کرنا واجب قرار دیا ہے جس کا کفر کھلا ہوا یعنی واضح ہو اور جس کے بارے میں ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی کھلی ہوئی نشانی ہو۔ بالفاظِ دیگر اگر ایک حاکم اللہ تعالیٰ کے احکامات کے سوا کفر کے احکام نافذ کرتا ہے جس کے بارے میں کوئی شبہ نہ ہو، خواہ ایسے احکام تھوڑے ہوں یا کئی۔ حضرت عبادہ ابن صانتؓ سے حدیث نقل ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((وَأن لا ننازع الأمر اهله۔ قال: إلا أن تروا كفراً بواحاً عندكم من الله فيه برهان))

اور اولی الامر (خلیفہ) سے جدال نہ کرو جب تک کہ تم (اُن کے عمل میں) کھلا ہوا کفر نہ دیکھو جس کے بارے میں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے کوئی دلیل ہو۔

لہٰذا شریعت کے احکامات کے نفاذ میں نہ تساہل برتا جا سکتا ہے اور نہ اسلام کے احکام کی تنفیذ میں تدریج سے کام کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ایک واجب اور دوسرے واجب میں فرق نہیں ہے جس طرح ایک حرام اور دوسرے حرام میں فرق نہیں ہوتا، اور نہ ایک حکم اور دوسرے حکم میں کوئی فرق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات برابر ہیں، لازم ہے کہ اُن کی فوراً بلا تاخیر اور یک بارگی تنفیذ کی جائے، اگر ہم یہ نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہمارے اوپر صادق آتا ہے، فرمایا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے:

﴿أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ﴾

تو کیا تم کتاب کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک کو نہیں مانتے؟ پھر تم میں جو ایسا کرے، اس کا صلہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ دنیا کی زندگی میں بھی رسوائی ہو اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو سخت سے سخت عذاب کی طرف پھیر دیا جائیگا۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: سورۂ بقر: ۸۵)

لہٰذا دنیا کی کسی بھی ریاست کیلئے جو عالم اسلام میں قائم ہے، اسلام کو یہ کہہ کر نافذ نہ کرنے کا کہ اُن کے پاس ایسا کرنے کی طاقت نہیں ہے، کوئی عذر نہیں رہ جاتا۔ یا یہ حیلہ کرنا کہ ابھی حالات سازگار نہیں ہیں، یا دنیا کی رائے عامہ موافق نہیں ہے یا پھر یہ بہانہ کہ دنیا کی عظیم قوتیں ہمیں ایسا نہیں کرنے دیتیں وغیرہ، ایسے تمام حیلے اور حجتیں کمزور ہیں جن کی کوئی وقعت نہیں، بلکہ جو کوئی اِن حیلوں کا سہارا لے تو اللہ تعالیٰ اسے ہرگز قبول نہیں کریگا۔

جبری حکومت اسلام میں حرام ہے

اسلام میں حکومت واقتدار (Authority) شرعی احکامات کے ذریعہ رعایا کی خبر گیری ہے، جو کہ قوت سے جدا شئے ہے۔ ریاست اسلام میں قوت، رعایا کے معاملات کی خبر گیری نہیں اور نہ ہی اُن کا اہتمام ہے، یعنی قوت (Military Strength) اقتدار نہیں ہوتا، گو کہ اس کا ہونا، اور اس کا بنایا جانا، اُس کی استعداد بغیر اقتدار کے نہیں ہوتی۔ قوت ایک مادّی وجود ہے جو افواج اور پولیس سے عیاں ہوتی ہے، اُس کے ذریعہ احکام کا نفاذ ہوتا ہے، مجرم اور فاسق اُس سے خوف زدہ ہوتے ہیں، بیرونی حملہ آور اُس سے ڈرتے ہیں اور دشمن اُس سے بھاگتے ہیں، قوت سے اقتدار، ریاست کے افکار وعقائد کی حفاظت کی جاتی ہے اور ریاست کے باہر اُنہیں پھیلایا جاتا ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ قوت اور اقتدار جدا جدا چیزیں ہیں گو کہ قوت کے بغیر اقتدار کا وجود نہیں اور اقتدار کے بغیر قوت حاصل نہیں کی جاسکتی۔

لہٰذا اقتدار کیلئے یہ صحیح نہیں کہ وہ قوت بن جائے کیونکہ اگر ایسا ہوتا ہے تو رعایا کی خبر گیری میں افساد آجائیگا۔ اقتدار کے قوت بن جانے سے ریاست کے افکار وعقائد قہر بربادی اور غصب کے افکار وعقائد بن جاتے ہیں نہ کہ رعایا کی بھلائی کے۔ ریاست ایک پولیس ریاست بن جاتی ہے جس میں دہشت، تسلط، ظلم، زبردستی اور خوں ریزی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

جس طرح اقتدار کیلئے یہ صحیح نہیں کہ وہ قوت بن جائے، اسی طرح یہ بھی غلط ہوگا کہ قوت ہی اقتدار بن جائے، کیونکہ پھر یہ رعایا پر قوت کے ذریعہ حکومت کریگی، لوگوں کے معاملات عسکری یا فوجی قوانین سے رواں کریگی جن میں ظلم اور زبردستی ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ محض بربادی پر منتج ہوگی اور خوف، رعب اور دہشت کا سبب بنیگی۔ یہ امت کو بربادی کے گہرے گڈھے میں لے جائیگی اور سخت نقصان پہنچائیگی۔

عرب اور اسلامی ممالک میں فوجی حکومتیں اس کی بہترین مثال ہیں۔

اسلام مسلمانوں کی ایذاء رسانی اور اُن کی جاسوسی کو حرام قرار دیتا ہے:

اسلام نے حاکم پر مسلمانوں کو ایذاء اور ضرر پہنچانے کو حرام قرار دیا ہے، مسلم شریف میں ہشام بن حکیم کی روایت نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إن الله يعذب الذين يعذبون الناس فى الدنيا))

بے شک اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو عذاب میں ڈالیگا جو دنیا میں لوگوں کو عذاب میں ڈالا کرتے ہیں۔

مسلم شریف ہی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نقل ہے، فرمایا:

((صنفان من اهل النارلم أرهما،قوم معهم سياط كأذناب البقر يضربون بها الناس.....))

اہل جہنم میں دو قسم کے لوگ ہیں جنہیں میں نے ابھی دیکھا نہیں ہے، ایک وہ لوگ جن کے پاس گائے کی دم جیسے کوڑے ہیں جن سے وہ لوگوں کو مارتے ہیں.....

اسی طرح اسلام نے مسلمانوں کے تقدس اور اُن کی عزت پر حملہ، اُن کے اموال، اُن سے مقابلہ آرائی اور اُن کے گھروں کی عزت پر حملہ کرنے کو حرام قرار دیا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((كل المسلم على المسلم حرام،دمه وماله وعرضه))

ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی جان (خون)، اُس کا مال اور اُس کی عزت حرام ہیں۔

ابن ماجہ نے عبید اللہ بن عمروؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کا طواف کرتے ہوئے فرمایا:

((ما أطيبك،وأطيب ريحك،ماأعظمك وأعظم حرمتك،والذي نفس محمد بيده لحرمةُ المؤمن أعظم عند الله حرمةً منك مالهِ و دمهِ،أن لانظُنَّ به إلَّا خيراً))

تو کتنا اچھا (لگتا) ہے، تیری خوشبو کتنی بھلی ہے، تو کتنا عظیم ہے اور تیرا تقدس کتنا بلند و بالا ہے، قسم اُس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مؤمن کا تقدس تیرے تقدس سے بھی عظیم ہے، یعنی اُس کا خون، اُس کا مال اور یہ کہ اُس کے بارے میں صرف حسن ظن ہی رکھنا۔

اور بخاری و مسلم شریف میں حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ سے حدیث روایت ہے فرمایا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے:

((سباب المسلم فسوق،و قتاله كفر))

مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اُس سے لڑنا کفر۔

گھروں کے تقدس کے بارے میں حدیث مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل ہے فرمایا حضور ﷺ نے:

((لو أنَّ رجلًا اطلع عليك بغير إذن،فحذفته بحصاة،ففأت عينه ما كان عليك من جناح))

اگر ایک شخص تمہارے گھر میں بغیر اجازت جھانکے، اور تم اُسے پتھر سے ایسے (بھی) مار دو کہ اس کی آنکھ ہی باہر نکل جائے، تو بھی تم پر کوئی الزام نہیں۔

ایک اور حدیث حضرت سہل بن سعد الساعدیؓ سے مروی ہے، فرمایا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے:

((اطلع رجلٌ من جحرٍ في حُجْرٌ النبي ﷺ ومع النبي ﷺ مِدرى يحك به رأسه، عقال: لو أعلم

أنك تنظر لطعنت بها في عينك،إنما جعل الاستئذان من أجل البصر))
ایک آدمی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حجروں میں سے ایک حجرے کے اندر جھانکا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک میں اُس وقت کوئی چیز تھی جس سے آپ ﷺ اپنا سر کھجا رہے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تو اندر جھانک رہا ہے میں تیری آنکھ میں مارتا۔ اجازت لینے کا حکم اسی دیکھنے کی وجہ سے دیا گیا ہے۔

مسندِ احمد میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَن اطلع على قوم في بيتهم بغير إذنهم فقد حل لهم أن يفقأوا عينه))
جو کوئی کسی کے گھر میں بغیر اجازت جھانکے، تو اُس نے (اُن گھر والوں) کیلئے حلال کر دیا کہ وہ اُس کی آنکھ نکال پھینکیں۔

اسی طرح اسلام نے مسلمانوں کی جاسوسی کرانا، اُن کا پیچھا کرنا یا تعاقب کرنا، اُن کے ذاتی اور رازداری کے احوال کُریدنا حرام قرار دیا ہے، نیز یہ حرام کیا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمانوں کی جاسوسی کرے، اللہ تعالیٰ کا ارشادِ پاک ہے:

﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُواْ اجْتَنِبُواْ كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُواْ﴾
اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بہت سے گمانوں سے بچو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ اور نہ ٹوہ میں لگو، (ترجمہ معانیٔ قرآنِ کریم: سورہ حجرات: ۱۲)

اور بخاری و مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہؓ سے نقل ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((إياكم والظن،فإن الظن أكذب الحديث،ولا تحسسوا،ولا تجسسوا، ولا تحاسدوا ،ولا تدابروا،ولا تباغضوا،وكونوا عباد الله إخواناً))
تم بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے اور دوسروں کے عیب تلاش نہ کرو، نہ کسی کی جاسوسی کرو، نہ کسی سے حسد کرو اور نہ کسی سے بغض و کینہ رکھو اور اے اللہ تعالیٰ کے بندو! بھائیوں کی طرح ہو جاؤ۔

مسند احمد میں ابی برزہ اسلمیؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((يا معشر مَن آمن بلسانه،ولم يدخل الإيمان قلبه لا تغتابوا المسلمين، ولا تتبعوا عوراتهم، فإنه مَن يتَّبع عوراتهم يتبع الله عورته ومن يتبع الله عورته يفضحه في بيته))
اے لوگوں جو اپنی زبان سے ایمان لائے ہو! ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل بھی نہیں ہوا۔ مسلمانوں کی غیبت نہ کرو، اُن کی کمزوریاں نہ تلاش کرتے پھرو۔ جو کسی مسلمان کی کمزوری ڈھونڈیگا اور پیچھے پڑیگا، اللہ اُس کی کمزوری کے پیچھے پڑ جائیگا اور اُسے اُسی کے گھر میں بے پردہ کر دیگا۔

لہٰذا یہ آیت اور مندرجہ بالا احادیث حرام قرار دیتی ہیں کہ مسلمانوں کی جاسوسی کی جائے اور اُن کی کمزوریوں کے پیچھے پڑا جائے۔ آخری حدیث خبردار کرتی ہے کہ جو کوئی کسی مسلمان کے عیوب تلاش کریگا، اللہ تعالیٰ اُس کے عیوب اُس کے گھر میں بے پردہ کردیگا۔ اسی طرح احادیث وارد ہوئی ہیں جن میں مسلمانوں کیلئے جاسوسی اداروں یعنی مخابرات میں کام کرنا حرام بتایا گیا ہے، سنن ابوداؤد اور مسند احمد میں المسْور سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((من أكل برجل مسلم أكلة، فإن الله يطعمه مثلها من جهنم، ومن كسا ثوباً برجل مُسلم فإن الله يكسوه مثله في جهنم.....))

جس کسی نے ایک مسلمان کو نقصان پہنچا کر کمائی کی تو اللہ تعالیٰ اُسے جہنم میں وہی کھلائیگا، اور جو کوئی کسی مسلمان کو ضرر پہنچا کر اپنا لباس بنائیگا تو اللہ تعالیٰ اُسے جہنم میں اسی جیسا لباس پہنائیگا.....

جس طرح مسلمانوں کی جاسوسی کو حرام قرار دیا ہے، اُسی طرح رعایا کے غیر مسلموں کی جاسوسی بھی حرام ہے کیونکہ انصاف کئے جانے کے اعتبار سے اُن کے حقوق اور واجبات مسلمانوں ہی کی طرح ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے بھلائی کے سلوک کی نصیحت فرمائی ہے اور اُنہیں ایذاء پہنچانے سے روکا ہے۔ یحییٰ بن آدم نے کتاب الخراج میں روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((من ظلم معاهداً، أو كلفه فوق طاقته فأنا جحيجه إلى يوم القيامة))

جس کسی نے کسی ذمی پر ظلم کیا یا اس پر اس کی استطاعت سے بڑھ کر بوجھ ڈالا تو میں خود قیامت میں اُس کا وکیل بنونگا۔

حضرت عمر بن الخطاب سے یحیی بن آدم نے نقل کیا، وہ فرماتے ہیں:

(أوصي الخليفة من بعدي بذمة رسول اللهؐ خيراً أن يوفي لهم بعدهم، وأن يقاتل من ورائهم، وأن لا يكلفوا فوق طاقتهم)

میں اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمیوں کے ساتھ خیر کا سلوک کرے اور اُن سے اُن کا عہد پورا کرے، اُن کی حفاظت کیلئے لڑے اور اُن پر اُن کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔

گو کہ یہ آیت اور احادیث جاسوسی کی حرمت میں عمومی نوعیت کی ہیں لیکن بہرحال ایسے کفار جو دشمن ہیں، خواہ وہ حقیقی اور کھلے ہوئے دشمن ہوں یا اُن سے دشمنی کا امکان ہو، اِن نصوص سے مستثنیٰ ہیں۔ مزید یہ کہ دیگر احادیث نبوی سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسے کفار کی جاسوسی حرام نہیں ہے بلکہ ضروری ہے اور اسلامی ریاست پر واجب ہے کہ وہ ایسا کرے، کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت عبداللہ ابن جحشؓ کی قیادت میں مقام نخلہ جو طائف اور مکہ کے مابین واقع ہے، مہاجرین کی آٹھ

ٹکڑیاں بھیجی تھیں کہ وہ کفار کی حرکات واحوال پر نظر رکھیں، اور خبر دیں۔ دشمن کفار کی جاسوسی ایک ایسا معاملہ ہے جسے اسلامی فوج اور اسلامی ریاست نظر انداز نہیں کر سکتی۔

جس طرح ریاستِ اسلامی پر دشمن کفار کی جاسوسی واجب ہے اسی طرح یہ بھی لازمی ہے کہ اُس کے پاس ایسا ادارہ ہو جو دشمن ممالک کی طرف سے کی جارہی جاسوسی (Counter Espionage) کی روک تھام کرے۔ بخاری شریف میں سلمہ ابن اکوع سے روایت نقل ہے:

((أتى النبي ﷺ عَينٌ من المشركين وهو في سفر، فجلس عند أصحابه يتحدث ثم انفتل، فقال النبيّ اطلبوه واقتلوه. فقتله، فنفله سلبهُ))

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے جب ایک جاسوس ملا جو صحابہؓ کے ساتھ بیٹھا تھا جب وہ گفتگو کر رہے تھے، پھر وہ غائب ہو گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کا پیچھا کرو اور اُسے قتل کر دو، تو میں نے اُس کے پیچھے جا کر اُسے قتل کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اُس کا مالِ غنیمت دیدیا۔

مسند احمد میں فرات ابن حیان سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کے قتل کا حکم دیا، وہ شخص ابو سفیان کا ساتھی تھا اور انصار کے حلقہ میں آیا تھا اور یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ مسلم ہے۔ انصار صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے رسول اللہ ﷺ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ مسلم ہے تو حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إن منكم رجالاً نكلهم إلى ايمانهم منهم فرات بن حيان))

تم میں ایسے لوگ ہیں جن کے ایمان پر ہمیں اعتبار ہے، فرات ابن حیان اُنہیں لوگوں میں سے ہیں۔

بخاری شریف میں حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے روایت ہے:

(بعثنى رسول الله ﷺ أنا والزبير ﷺ و مقداد ابن الأسود ﷺ قال: انطلقوا حتى تأتوا روضة خاخ، فإن بها ظعينة ومعها كتاب، فخذوه منها فانطلقنا تتعادى بنا خيلنا حتى انتهينا إلى الروضة، فإذا نحن باظعينة، فقلنا: أخرجي الكتاب، فقالت: ما معي من كتاب، فقلنا: لتُخرجنَّ الكتاب أو لنلقينّ الثياب، فأخرجته من عقاصها فأتينا به رسول الله ﷺ.....)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے، حضرت زبیرؓ اور حضرت مقداد بن اسودؓ کو بھیجا اور فرمایا کہ خاخ کے باغ تک جاؤ وہاں تمہیں اونٹ پر بیٹھی ایک عورت ملیگی جس کے پاس ایک تحریر ہوگی وہ اُس سے لے لو۔ لہٰذا ہم لوگ نکلے اور تیزی سے اُس باغ تک پہنچے، جہاں وہ عورت تھی۔ ہم نے اُس سے کہا کہ وہ تحریر دو، اُس نے کہا کہ میرے پاس کوئی تحریر نہیں ہے، ہم نے

کہا کہ تحریر دے دو ورنہ کپڑے اُتار کر بھی تلاش کر لینگے، تو اُس عورت نے اپنی چوٹی میں سے وہ تحریر نکال کر دی جسے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے۔

لہٰذا اِن تمام تفاصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ اسلام میں حکومت پولیس کی حکومت نہیں ہے اور نہ یہ جائز ہے کہ ایسا ہو کیونکہ ایسی حکومت مسلمانوں کیلئے سخت نقصان کا باعث، شرعی احکام سے متناقض اور (لا ضرر ولا ضرار) کے شرعی قاعدہ کے مخالف ہوگی۔

اسی طرح یہ بھی واضح ہوا کہ ریاست اسلامی کیلئے یہ حرام ہے کہ وہ اپنی رعایا، مسلم یا غیر مسلم کی جاسوسی کا ادارہ بنائے اور اُنہیں ایذائیں پہنچائے۔

مزید یہ کہ دشمن کفار کی جاسوسی کیلئے، اُن کے احوال کی خبر رکھنے کیلئے اور اُن کے ذریعہ کئے جانے والی جاسوسی کے خلاف ریاستِ اسلامی کا اپنا ادارہ ہونا واجب ہے۔

اسلام کے مطابق حکومت کرنے والے مسلم حاکم کی اطاعت فرض ہے

ایسا مسلم حاکم کی جو اپنی حکومت میں اسلامی احکامات نافذ کر رہا ہو، خواہ وہ ظلم کرے یا حقوق دبائے جب تک کہ وہ معصیت کا حکم نہیں دیتا یا کھلے ہوئے کفر کا ارتکاب نہیں کرتا، اُس کی مسلمانوں پر اطاعت فرض ہے۔

متعدد آیات اور احادیث سے اس کا استدلال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَاايُّهَا الذِينَ آمَنُواأَطِيْعُواْ اللهَ وَ أَطِيعُواْ الرَّسُولَ وَ أُوْلِي الأَمْرِ مِنْكُمْ﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اُن کی جو تم میں صاحبِ امر ہیں۔

(ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: نساء:۵۹)

بخاری شریف میں ابی سلمہ بن عبدالرحمٰن کی حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((من أطاعني فقد أطاع الله،ومن عصاني فقد عصى الله،ومن أطاع أميري فقد أطاعني،ومن عصى أميرى فقدعصاني))

جس کسی نے میری اطاعت کی تو اُس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور جس کسی نے میری نافرمانی کی، اُس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، اور جس کسی نے میرے امیر کی اطاعت کی، اُس نے میری اطاعت کی، اور جس کسی نے میرے امیر کی نافرمانی کی اُس نے میری نافرمانی کی۔

بخاری شریف ہی میں ایک اور روایت میں یہ الفاظ مروی ہیں:

((ومن يطع الأمير فقد أطاعني.....))

اور جس نے امیر کی اطاعت کی تو اُس نے میری اطاعت کی.....

بخاری شریف میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((اسمعوا و أطيعوا، و إن استعمل عليكم عبدٌ حَبَشِيٌ،كان رأسهُ زبيبة۔))

سنو اور اطاعت کرو، خواہ تمہارے اوپر ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ مقرر کر دیا جائے جس کا سر منقہ کی طرح ہو۔

مسلم شریف میں عمرو بن العاصؓ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل ہے، فرمایا:

((و مَن بايع إماماً فأعطاه صفقة يده،و ثمرة قلبه فليطعه إن استطاع۔فإن جاء آخر ينازعه،فاضربوه عنق الآخر))

جو کوئی ایک امام کے ہاتھ پر، دل سے بیعت دے، پھر وہ اسکی اطاعت حتی الامکان کرے، اور اگر کوئی دوسرا آکر خلیفہ سے تنازعہ کرے، تو اسکی گردن اُڑا دو۔

اطاعت کی فرضیت میں یہ تمام دلائل صریح ہیں کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اولی الامر کی، امیر کی اور امام کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور قرینہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ قطعی اور حتمی حکم ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر کی معصیت اور نافرمانی کو خود اپنی نافرمانی اور معصیت قرار دیا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی معصیت کے مترادف ہے۔ پھر اطاعت پر یہ فرما کر مزید متاکد بنا دیا کہ چاہے وہ امیر ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ یہ قرآئن اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اطاعت کا حکم قطعی ہے اور یہ فرض ہے۔

حاکم کی اطاعت کا حکم مطلق ہے کسی مخصوص حاکم کیلئے نہیں اور نہ ہی بعض امور میں محدود ہے۔ لہٰذا کسی بھی مسلم حاکم کی اطاعت فرض ہوگی، خواہ وہ ظالم ہو، فاسق ہو اور چاہے لوگوں کے مال ناجائز کھا رہا ہو، اُس کی اطاعت فرض ہوگی کیونکہ اس کی فرضیت کے دلائل مطلق ہیں اور رہیں گے۔

بعض احادیث ظالم و فاجر مسلم حاکم کی اطاعت کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ بخاری شریف میں حضرت عبداللہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إنكم سترون بعدي أثرة و أموراً تنكرونها۔ قالوا:فما تأمرنا يا رسول الله ﷺ؟ قال: أدوا إليهم حقهم،وسلوا الله حقكم))

میرے بعد تم ایسے امور دیکھو گے جو خود غرضی پر مبنی ہونگے اور تم ناپسند کرو گے۔ صحابہؓ نے دریافت کیا کہ پھر ہمارے لئے آپ ﷺ کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا: اُنہیں اُن کا حق ادا کرنا اور اپنا حق اللہ تعالیٰ سے مانگنا۔

حضرت ابی رجاءؒ سے بخاری شریف میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ رَأى مِنْ أميرِهِ شيئاً يَكْرَهه فليصبر عليه، فَإنّهُ مَن فَارَقَ الجماعةَ شِبْرَاً فماتَ إلّا ماتَ ميتة جاهيلية۔))

جو اپنے امیر میں کوئی ایسی بات دیکھے جو اسے ناگوار ہو تو اُسے چاہئے کہ وہ اُس پر صبر کرے، پس جو کوئی جماعت سے بالشت بھر دور گیا اور (اس حالت میں) مرا، تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

لہٰذا، خواہ کوئی بھی معاملہ ہو، حاکم کی اطاعت کے حوالہ سے یہ احادیث صریح اور واضح ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تاکید نہایت شدت سے فرمائی ہے، چنانچہ مسلم شریف میں نافع سے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی روایت کردہ حدیث نقل ہے:

((مَنْ خَلَعَ يَدَاً مِنْ طَاعَةٍ لَقِي اللهَ يَومَ القِيَامَة لا حُجَّةَ لَهُ، وَ مَنْ مَّاتَ وَ لَيْسَ فِي عُنُقِهٖ

بَيْعَة' مَاتَ مِيْتَةٌ جَاهِلِيَّة۔))

جو کوئی اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے دستبردار ہوا، تو وہ اللہ تعالیٰ سے قیامت کے دن یوں ملیگا کہ اس کیلئے کوئی حجت نہیں ہوگی اور جو کوئی اس حال میں مرا کہ اس کی گردن پر خلیفہ کی بیعت کا طوق نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔ (روایت مسلم شریف)

لہٰذا خلیفہ یا حاکم کے عمل کے قطع نظر اُس کی معصیت جائز نہیں ہے، نیز اُس سے بغاوت کرنا، اُس سے لڑنا خواہ کچھ بھی ہوا ہو، حرام ہے۔ بخاری شریف میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((من حمل علينا السلاح فليس مِنَّا))

جو ہمارے خلاف ہتھیار اُٹھائے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

حاکم سے اُس کے اقتدار میں تنازعہ نہیں کیا جاسکتا چاہے کوئی بھی معاملہ ہو، الا یہ کہ اُس کی شرعی نص ہو، یعنی وہ کفر بواح کا مرتکب ہو۔

حاکم کے منکر کا مرتکب ہونے کے باوجود اُن سے لڑائی نہ کرنے کا حکم صریح آیا ہے۔ مسلم شریف میں حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ستكون أمراء فتعرفون وتنكرون، فمن عرف برئ، ومن أنكر سلم ولكن رضي وتابع، قالوا أفلا نقاتلهم؟ قال: لا، ما صلّوا.....))

ایسے امراء ہونگے (جن کے بعض کاموں کو تم پہچانو گے) اور بعض (کے ماننے) سے انکار کرو گے، سو جو پہچان جائیگا وہ گناہ سے بری ہوا اور جس نے (وہ برائی) ماننے سے انکار کیا وہ محفوظ ہوگیا، لیکن جو اُن کاموں سے راضی ہوگیا اور اطاعت کی (وہ محفوظ نہ رہا) صحابہ نے عرض کیا کہ کیا ہم اُن سے نہ لڑیں؟ فرمایا نہیں، جب تک کہ وہ نماز پڑھیں۔

مسلم شریف میں حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی حدیث میں ہے:

((وَأن لا ننازع الأمر اهله۔ قال: إلا أن تروا كفراً بواحاً عندكم من الله فيه برهان))

اور اولی الامر (خلیفہ) سے جدال نہ کرو جب تک کہ تم (اُن کے عمل میں) کھلا ہوا کفر نہ دیکھو جس کے بارے میں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے کوئی دلیل ہو۔

ان تمام احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ حاکم سے بغاوت، اُس سے قتال یا اُس کے اقتدار میں تنازعہ سے منع کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ دیگر احادیث اُس کی اطاعت کو واجب قرار دیتیں ہیں خواہ وہ ظالم ہو یا منکرات کا ارتکاب کیا ہو۔ اس کے علاوہ وہ آیات اور احادیث جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم ہے اور ہاتھ کے زور سے اُن کے ازالہ کا حکم ہے، اُن

سے حاکم مستثنیٰ ہے لہٰذا مسلمانوں پر حاکم کی اطاعت بغیر کسی قید کے سوائے اس کے جو مذکور ہوا، واجب ہے۔

معصیت میں اطاعت نہیں ہے:

حاکم کی اطاعت کے واجب ہونے سے ایک ہی چیز مستثنیٰ کرتی ہے اور وہ معصیت کا حکم ہے۔ لہٰذا جب حاکم معصیت کا حکم دے تو اُس کی اطاعت نہیں کی جائیگی کیونکہ یہ استثناء نص شرعی میں وارد ہوا ہے۔ مسلم شریف میں نافعؒ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((على المرء المسلم السمع والطاعة فيما أحبَّ و كره،إلا أن يؤمَر بمعصية،فإن أُمِرَبمعصية فلا سمع ولا طاعة))

مسلم پر لازم ہے کہ وہ (حاکم کی بات) سنے اور اس کی اطاعت کرے خواہ اسے پسند ہو یا نہ ہو، سوائے اس کے کہ اُسے معصیت کا حکم دیا جائے، پس جب معصیت کا حکم دیا جائے تو وہ نہ سنے اور نہ اطاعت کرے۔

یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ اگر معصیت کا حکم دیا جائے، یہ نہیں کہ اگر وہ معصیت کر رہا ہو۔ بلکہ اگر وہ تمہارے سامنے بھی برائی کر رہا ہو اور تمہیں اُس برائی کا حکم نہ دے، تو بھی اطاعت واجب ہے۔ حضرت عوف ابن مالک الاشجعیؓ سے مسلم شریف میں حدیث نقل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((خيار أيمتكم الذين تحبونهم و يحبونكم،و تصلّون عليهم و يصلون عليكم،و شرار أيمتكم الذين تبغضونهم و يبغضونكم،و تلعنونهم و يلعنونكم،قيل يا رسول الله أفلانبذهم باسيف فقال:لا،ما أقاموا فيكم الصلاة ،ألا من ولِيَ عليه والٍ،فرآه يأتي شيئاً معصية الله، فليكره ما يأتي مِن معصية الله،ولا ينزعن يداً من طاعة))

تمہارے بہترین امام وہ ہیں جو تم سے محبت کریں اور تم اُن سے محبت کرو، تم اُن کیلئے دعا کرو وہ تمہارے لئے دعا کریں، اور سب سے شر اور برے امام وہ ہیں جو تم سے نفرت کریں اور تم اُن سے نفرت کرو، اور وہ تمہارے لئے بددعا کریں اور تم اُن کیلئے، (آپ ﷺ سے) پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ کیا ہم اُن سے جنگ نہ کریں؟ فرمایا: نہیں، جب تک کہ وہ تم میں صلاۃ قائم کرتے رہیں۔ خبردار جس پر کوئی والی ہو اور وہ اُس والی میں کوئی چیز معصیت کی دیکھے تو اُس چیز سے نفرت کرے لیکن اطاعت سے اپنا ہاتھ نہ کھینچے۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں مراد برائی یا معصیت کے حکم سے ہے نہ کہ حاکم کے برے فعل سے، محض معصیت کے امر سے ہے۔ اگر کوئی حاکم کو معصیت کرتا ہوا دیکھے تو بھی اُس سے اطاعت کا حکم ساقط نہیں ہوتا، لیکن اگر حاکم برائی کا حکم دے تو اُس کی اطاعت نہیں کی جاسکتی کیونکہ کسی بھی مخلوق پر خالق کی معصیت میں اطاعت نہیں ہے۔

اطاعت سے استثناء کی یہی ایک حالت ہے یعنی معصیت کا حکم دئے جانے پر۔لیکن یہ لحاظ رہے کہ ایسے کسی حکم کے بارے میں یہ قطعی ہونا چاہئے کہ وہ دراصل معصیت ہی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے، مثلاً سود کا حکم۔اس کے برعکس اگر کوئی حکم ایسا ہو کہ تم اُس کو حرام سمجھو جب کہ وہ اسے حلال سمجھتا ہو تو اطاعت لازمی ہے اور یہ معصیت کا حکم تصور نہیں کیا جائیگا بلکہ حلال کا ہی حکم سمجھا جائیگا۔مثلاً تم اگر فوٹوگرافی سے تصویر کشی کو حرام سمجھتے ہو اور حاکم اُسے حلال مانتا ہو اور وہ حکومتی کام کیلئے تصویر (فوٹو) کھینچنے کا حکم دے تو اس کی اطاعت واجب ہے نافرمانی جائز نہیں، کیونکہ وہ تصویر کشی کے ممنوعہ ہونے سے مراد حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت اُس حدیث سے لے رہا ہو جس میں ہاتھ سے بنائی ہوئی تصویر کی بات ہے اور فوٹوگرافی کی تصویر پر اُس کے ممنوعہ ہونے کا انطباق نہیں ہوتا۔لہٰذا یہ اُس کیلئے دلیل یا شبهة دلیل ہوگی۔چنانچہ اس کا کسی حکومتی کام کیلئے تصویر لگانے کا حکم معصیت سے تعبیر نہیں ہوگا اور اس کی اطاعت واجب ہوگی، اس حکم میں اس کی نافرمانی کا جواز نہیں۔

حکام کا محاسبہ مسلمانوں پر فرض ہے

مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ وہ حاکم کا محاسبہ کریں۔ اُن کے ظلم اور مال ناجائز کھانے کے باوجود اطاعت کرنے کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اِس سب پر سکوت اختیار کیا جائے، بلکہ یہ کہ جس طرح اطاعت واجب ہے اُسی طرح اُن کے اعمال اور اُن کے طرزِ عمل پر اُن کا محاسبہ بھی واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اُن کے حکام کا محاسبہ فرض قرار دیا ہے، اور یہ حکم دیا ہے کہ اگر حکام رعایا کے حقوق کی پامالی کریں، رعایا کے تعلق سے اپنے فرائض میں کوتاہی برتیں، رعایا کے معاملات میں غفلت برتیں، اسلام کے احکام کی مخالفت کریں یا اسلام کے علاوہ کسی اور کا حکم نافذ کریں تو اُن کو چیلینج کیا جائے۔ مسلم شریف میں حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ستكون أمراء فتعرفون وتنكرون،فمن عرف برئ،ومن أنكر سلم ولكن رضي وتابع،قالوا أفلا نقاتلهم؟ قال: لا، ما صلّوا.....))

ایسے امراء ہونگے (جن کے بعض کاموں کو تم پہچانو گے) اور بعض (کے ماننے) سے انکار کرو گے، سو جو پہچان جائیگا وہ گناہ سے بری ہوا اور جس نے (وہ برائی) ماننے سے انکار کیا وہ محفوظ ہوگیا، لیکن جو اُن کاموں سے راضی ہوگیا اور اطاعت کی (وہ محفوظ نہ رہا) صحابہ نے عرض کیا کہ کیا ہم اُن سے نہ لڑیں؟ فرمایا نہیں، جب تک کہ وہ نماز پڑھیں۔

مسلم شریف ہی کی دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

((فمن كره فقد برئ،ومَن أنكر فقد سلم،ولكن مَن رضي وتابع))

جس نے (اُن افعال کی) مذمت کی وہ (گناہ سے) بری ہوا اور جس نے اُنہیں برا مانا، وہ محفوظ رہا، لیکن جو اُن (افعال سے) راضی رہا اور اُن پر عمل کیا (وہ نہ بری ہوا اور نہ محفوظ رہا)۔

یہ روایت اس سے پہلی والی روایت کی تفسیر کی طرح ہے۔ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس حاکم سے ناپسندیدگی کے اظہار کا حکم دیا ہے، خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو لیکن اُس سے قتال نہ کیا جائے یا ہتھیار نہ اُٹھائے جائیں تاوقتیکہ حاکم کھلے ہوئے کفر کا (کفرٌ بواح) کا ارتکاب نہ کرے، اور ایسی ناپسندیدگی صرف زبان سے ہو، یا اگر اس کی استطاعت نہیں ہے تو پھر دل سے ہو۔ پھر یہ کہ جو زبان سے یا دل سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی نہ کرے تو اسے حاکم کے اُس گناہ میں شریک ہونے کے مترادف تعبیر کیا گیا ہے اور بتایا کہ جو اُن افعال سے راضی ہوا اور اُن کاموں میں حکام کا اتباع کیا وہ نہ گناہ سے بچ پائیگا اور نہ بری ہوگا۔

مزید یہ کہ جن دلائل سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا استدلال ہوتا ہے اُنہیں سے حاکم کے محاسبہ کا بھی

استدلال ہوتا ہے کیونکہ وہ عام ہیں جن کے ضمن میں حاکم بھی آتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا قطعی حکم دیا ہے فرمایا:

﴿وَلْتَكُن مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الخَيرِ وَ يأْمُرُونَ بِالمَعْروفِ وَ يَنْهَونَ عَنِ المُنْكَرِ﴾

اور تم میں ایک ایسی جماعت ضرور ہونا چاہئے جو خیر کی طرف بلائے اور نیکی کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: آل عمران: آیت ۱۰۴)

اور فرمایا:

﴿كُنتُمْ خَيرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالمَعْرُوفِ وَ تَنْهَونَ عَنِ المُنْكَرِ﴾

تم ایک بہترین امت ہو جو لوگوں کو کے سامنے لائی گئی، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو، اور برائی سے روکتے ہو۔ (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: آل عمران: آیت ۱۱۰)

اور فرمایا:

﴿الذينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيّ الأُمِّي الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَورَئةِ وَالإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالمَعْرُوفِ وَيَنْهَهُمْ عَنِ المُنْكَرِ﴾

پس آج اس رحمت کے حق دار وہ لوگ ہیں جو اس رسول امی نبی ﷺ کی پیروی کرتے ہیں جسے وہ اپنے یہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں، اور جو انہیں بھلائی کا حکم دیتا، اور برائی سے روکتا ہے، (ترجمہ معانیٔ قرآن کریم: اعراف: آیت ۱۵۷)

اور فرمایا:

﴿التَائِبونَ العٰبِدُونَ الحٰمِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ الآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهونَ عَنِ المُنْكَرِ وَالحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللهِ وَبَشِّرِ المُؤمِنِينَ﴾

وہ ایسے ہیں جو توبہ کرتے ہیں، بندگی کرتے ہیں، حمد کرتے ہیں، ریاض کرتے ہیں، جھکتے ہیں، سجدہ کرتے ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں، اور برائی سے روکتے ہیں، اور اللہ کی حدود کی نگرانی رکھتے ہیں.....اور ان مومنوں کو خوشخبری دے دو۔ (ترجمہ معانی قرآن کریم: توبہ: آیت ۱۱۲)

اور فرمایا:

﴿الَّذِينَ إِن مَّكَّنّٰهُم فِي الأَرْضِ أَقَامُواْ الصَّلوٰةَ وَءَاتَوُاْ الزَّكَوٰةَ وَأَمَرُواْ بِالمَعْرُوفِ وَنَهَوْاْ عَنِ المُنْكَرِ﴾

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں زمین میں ہم اقتدار عطا کریں، تو وہ نماز قائم کریں گے، اور زکوٰۃ دیں گے، اور معروف کا

حکم دیں گے، اور منکر سے روکیں گے (ترجمہ معانی قرآن کریم: حج: آیت ۴۱)

اِن تمام آیات میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے امر بامعروف اور نہی عن المنکر کا مطالبہ کیا ہے، قرینہ کے اعتبار سے اس مطالبہ پر قطعیت کا اطلاق ہوتا ہے، مزید یہ کہ اس پر پابند لوگوں کی تعریف کی ہے فرمایا:

﴿وَ أُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ یہی فلاح پانے والے ہیں۔

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ﴾ تم ایک بہترین امت ہو۔

﴿وَبَشِّرِ الَّذِينَ﴾ ان لوگوں کو خوشخبری دے دو۔

اسی قسم سے اور بھی حق تعالیٰ شانہ کے اقوال ان کی تعریف میں آئے ہیں۔ اِن تمام سے اس کے قطعی ہونے کا قرینہ ثابت ہوتا ہے جس کے معنی ہوئے کہ یہ فرض ہے۔ لہٰذا حاکم کا محاسبہ کیا جانا امر بالمعروف اور نہی عن منکر کا جزو ہونے کے اعتبار سے فرض ہوا۔

پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد احادیث امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ضمن میں وارد ہوئی ہیں۔ مسند احمد و ترمذی شریف میں حضرت حذیفہ بن الیمانؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((والذي نفسي بيده لتامرنَّ بالمعروف ولتنهون عن المنكر أو ليوشكنَّ الله أن يبعث عليكم عقاباً من عنده، ثم لتدعنه فلا يستجيب لكم))

قسم اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تمہیں اچھائی کا حکم دینا ہے اور برائی سے روکنا ہے، ورنہ اللہ تم پر ایسا عذاب نازل کریگا کہ تم اس سے دعا مانگو گے اور وہ سنی نہیں جائیگی۔

مسلم شریف میں حضرت ابی سعید الخدریؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((من رأى منكم منكراً فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه و ذلك أضعف الإيمان))

تم میں سے جو کوئی منکر دیکھے، وہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے، اور اگر ہاتھ سے نہ بدل سکے تو اپنی زبان سے اسے غلط کہے اور اگر زبان سے بھی نہ کہہ سکے تو دل میں ہی اسے منکر سمجھے، اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔

مسند احمد میں عدی ابن عدی بن عمیرہ الکندیؓ سے روایت ہے:

((إن الله عز وجلّ لا يعذب العامة بعمل الخاصة، حتى يروا المنكر بين ظهرانيهم وهم قادرون علي أن ينكروا فل ينكرونه، فإذا فعلوا ذلك عذب الله الخاصة والعامة))

بے شک اللہ تعالیٰ کچھ خاص لوگوں کے عمل کی وجہ سے عام لوگوں کو عذاب نہیں دیگا جب تک وہ عام لوگ اُن لوگوں میں منکر دیکھیں اور استطاعت کے باوجود اُسے نہ روکیں، تو اللہ تعالیٰ عام اور اُن خاص دونوں کو عذاب دیگا۔

یہ تمام احادیث امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہیں، یہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ حاکم کو اچھائی کا حکم دیا جائے اور اسے برائی سے روکا جائے، کوئی شک نہیں کہ یہ حاکم کے اعمال کا محاسبہ ہی ہوا۔ اس کے علاوہ بعض احادیث خاص حاکم ہی کیلئے ہیں کہ اُسے اچھائی کا حکم دیا جائے اور برائی سے روکا جائے۔ مسند احمد میں حضرت ابی سعید الخدریؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((..... أفضل الجهاد كلمة الحق عند سلطان جائر))

ظالم سلطان کے سامنے حق بات کہنا بہترین جہاد ہے۔

اسی طرح مسند احمد اور ابن ماجہ میں ابی امامہ سے روایت ہے:

((عرض رسول الله ﷺ رجل عند الجمرة الأولى فقال: يا رسول الله ﷺ أيُّ الجهاد أفضل؟ فسكت عنه،فلما رمى الجمرة الثانية سأله،فسكت عنه فلما رمي جمرة العقبة، و وضع رجله في الغرز ليركب قال: أين السائل؟ قال أنا يا رسول الله ﷺ،قال: كلمة حق عند ذي سلطان جائر))

حضور ﷺ کے جمرۃ اولیٰ کو پتھر مارتے وقت ایک شخص نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ ﷺ بہترین جہاد کون سا ہے؟ آپ ﷺ خاموش رہے، پھر دوسرے جمرۃ پر اُس نے سوال دہرایا، آپ ﷺ نے پھر سکوت فرمایا، پھر جب جمرۃ عقبہ کو پتھر مارا تو پھر سوال کیا آپ ﷺ پھر خاموش رہے، پھر جب آپ ﷺ گھوڑے پر بیٹھنے کیلئے چڑھے تو پوچھا کہ سوال پوچھنے والا شخص کہاں ہے، اُس شخص نے جواب دیا کہ میں ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: ظالم حاکم کے سامنے حق بات کہنا (افضل جہاد ہے)۔

یہ نصوص حاکم اور حاکم کے سامنے حق بات کہنے کے فرض ہونے پر قطعی ہیں یعنی اس کا محاسبہ کرنے پر۔ اس میں عوام کے حقوق دبا جانے والے حکام کا احتساب، یا اُن حکام سے جو اپنی ذمہ داریوں میں کوتاہی کریں یا رعایا کے معاملات کو نظر انداز کریں، اُن کا محاسبہ فرض ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے اور اسے جہاد کے مترادف بتایا ہے اور بہترین جہاد سے تعبیر کیا ہے۔ بالفاظِ دیگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین جہاد ظالم حکام سے جدوجہد کرنا ہے۔ حکام کے محاسبہ کے فرض ہونے کیلئے یہ دلائل کافی ہیں۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ظالم حکام سے حق بات کہنے پر بہت تاکید فرمائی ہے خواہ اُس سے تکلیف ہو یا ایسا کرنے میں قتل کر دیا جائے۔ حدیث کی کتاب الحاکم میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((سيد الشهداء حمزة بن عبد المطلب،ورجل قام إلى إمام جائر فأمره و نهاه فقتله))
شہداء کے سردار (حضرت) حمزہ بن عبدالمطلبؓ اور وہ شخص ہے جو ایک ظالم بادشاہ کے سامنے کھڑا ہوا اور اُسے (اچھائی کا) حکم دے اور (برائی سے) روکے اور پھر وہ قتل کر دیا جائے۔

یہ ظالم حکام کے محاسبہ میں حق بات کہنے اور اُس کے راستہ میں آنے والی اذیتوں کو جھیلنے کی فضیلت کی نہایت فصیح تعبیر ہے۔

اگر حاکم کھلے ہوئے کفر کا مرتکب ہو تو اُس سے قتال واجب ہے:

جس طرح صرف ایک ہی حالت میں آدمی حاکم کی اطاعت سے مستثنیٰ ہوتا ہے اُسی طرح وہ صرف ایک ہی صورت میں حاکم سے بغاوت کی تحریم سے اور اس کے خلاف ہتھیار اُٹھانے سے مستثنیٰ ہوتا ہے اور وہ حالت کفر بواح کا اظہار ہے۔ جب کھلا کفر ظاہر ہو جائے تو قتال واجب ہو جاتا ہے۔ اس مخصوص صورتِ حال کیلئے نصوص موجود ہیں جن میں یہ مذکور ہے، مسلم شریف میں حضرت عوف ابن مالک الاشجعیؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((خيار أيمتكم الذين تحبونهم و يحبونكم،و تصلّون عليهم و يصلون عليكم،و شرار أيمتكم الذين تبغضونهم و يبغضونكم،و تلعنونهم و يلعنونكم،قيل يا رسول الله أفلاننابذهم باسيف فقال:لا،ما أقاموا فيكم الصلاة))

تمہارے بہترین امام وہ ہیں جو تم سے محبت کریں اور تم اُن سے محبت کرو، تم اُن کیلئے دعا کرو وہ تمہارے لئے دعا کریں، اور سب سے شر اور برے امام وہ ہیں جو تم سے نفرت کریں اور تم اُن سے نفرت کرو، اور وہ تمہارے لئے بددعا کریں اور تم اُن کیلئے، (آپ ﷺ سے) پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ کیا ہم اُن سے جنگ نہ کریں؟ فرمایا: نہیں، جب تک کہ وہ تم میں صلاۃ قائم کرتے رہیں۔

یہاں صلاۃ کے قائم کرنے سے اسلامی احکام نافذ کرنا مراد ہے یعنی شریعت نافذ کرنا۔ اس طرح اسلام کے ایک جزو کا نام لے کر پورے اسلام کا مقصود ہونا (تسمية الكل باسم الجزء) کہلاتا ہے، اس کی اور بھی مثالیں قرآن حکیم میں ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ﴾

تو ایک مومن کو غلامی سے آزاد کرنا ہوگا (ترجمہ معانی قرآن کریم: نساء: آیت ۹۲)

یہاں رَقبۃ بمعنی غلام کے ہیں جبکہ لغوی معنی گردن کے ہیں، اس آیت میں حکم گردن کو آزاد کرنے کے نہیں بلکہ غلام کو آزاد کرنے کے ہیں۔ اسی طرح اس حدیث میں (ما أقاموا فيكم الصلاة) کے معنی اور اُس سے مقصود مکمل شریعتِ اسلام کو

نافذ کرنا ہے۔ یہ خطاب کا مجازی سلوک ہے کہ ایک حصہ کا نام لے کر پوری چیز کو موضوع بنایا جائے۔ مسلم شریف میں حضرت ام سلمہؓ سے روایت نقل ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ستكون أمراء فتعرفون وتنكرون،فمن عرف برئ،ومن أنكر سلم ولكن رضي وتابع،قالوا أفلا نقاتلهم؟ قال: لا، ما صلّوا.....))

ایسے امراء ہونگے (جن کے بعض کاموں کو تم پہچانو گے) اور بعض (کے ماننے) سے انکار کرو گے، سو جو پہچان جائیگا وہ گناہ سے بری ہوا اور جس نے (وہ برائی) ماننے سے انکار کیا وہ محفوظ ہو گیا، لیکن جو اُن کاموں سے راضی ہو گیا اور اطاعت کی (وہ محفوظ نہ رہا) صحابہ نے عرض کیا کہ کیا ہم اُن سے نہ لڑیں؟ فرمایا نہیں، جب تک کہ وہ نماز پڑھیں۔

یعنی جب تک وہ اسلام کے احکام، جن میں نماز بھی شامل ہے، نافذ و جاری کرتے رہیں۔ اسی طرح مسلم شریف میں عبادہ ابن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

دعانا النبي ﷺ فبايعناه،فقال:فيما أخذ علينا أن بايعنا على السمع و الطاعة في منشطنا ومكرهنا،و عسرنا و يسرنا،و أثرة علينا،و أن لا ننازع الأمر أهله،قال:إلا أن تروا كفراً بواحاً عندكم من الله فيه برهان۔))

رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بلایا اور ہم نے، اپنی خوشحالی میں اور سخت حالت میں، اپنی مشکلات میں اور اپنی آسودہ حالی میں، اور اپنے (مفاد کے) برخلاف بات اور صاحب اقتدار سے اس کے امر میں سننے اور اطاعت کرنے کی بیعت کی، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ "جب تک کہ تم کوئی واضح کفر نہ دیکھ لو جس کے بارے میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی دلیل ہو۔

یہ تینوں احادیث یعنی حدیث عوف ابن مالکؓ، حدیث ام سلمہؓ اور حدیث عبادہ بن صامتؓ، کا موضوع امام سے بغاوت کا ہے اور اس کی قطعاً ممانعت آئی ہے۔ (أفلا ننابذهم باسيف فقال:لا) یعنی، کیا ہم اُن سے جنگ نہ کریں؟ اور (و أن لا ننازع الأمر أهله) یعنی، اور یہ کہ اولی امر کے معاملہ میں اُن سے تنازعہ نہ کیا جائے۔ یہ تمام دلائل حاکم سے بغاوت کی قطعی نہی کرتے ہیں۔ اس نہی کو جب بغاوت کی مذمت والی حدیث کے ساتھ دیکھیں، جیسے حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی النسائی کی حدیث:

((من خرج من الطاعة، و فارق الجماعة فمات،مات ميتة جاهلية))

جو شخص اطاعت سے پیچھے ہٹا اور جماعت سے دور گیا اور اس حالت میں مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

البتہ جو ایک استثناء اِن تینوں مذکورہ احادیث میں بیان کیا گیا، اسے پہلی دو احادیث میں نماز نہ پڑھنے اور نماز نہ قائم

کرنے سے تعبیر کیا اور تیسری حدیث میں کھلے ہوئے کفر سے تعبیر کیا ہے۔ صلاۃ قائم نہ کرنے سے مراد اُن احکامات کو قائم نہ کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے یعنی کفر کے احکام قائم کرنا اور ظاہر ہے کہ یہ کفر ہی ہوا۔ کفراً بواحاً کے کلمات جو حدیث شریف میں وارد ہوئے ہیں، اِن کا اطلاق ہر اُس چیز پر ہوگا جو کھلا ہوا کفر مانا جائے، لہٰذا جب ایسا کفر واضح ہو جائے جس کے بارے میں ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھلی ہوئی دلیل موجود ہو تو بغاوت واجب ہو جاتی ہے، خواہ حکومت ایسے کھلے ہوئے کفر کے احکام نافذ کرے جو اللہ نے نازل نہ کئے ہوں، یا کفر کے احکامات نافذ نہ کرتے ہوئے ایسا فعل کرے جو صریحاً غیر اسلامی ہو، مثلاً مرتدین کے معاملہ میں سکوت اختیار کر لے اور مرتدین کو کھلی چھوٹ دے دے کہ وہ کھلے طور پر ظاہر ہوں یا اس جیسے افعال سرزد ہونے لگیں۔ یہ سب کھلے ہوئے کفر ہی کے مصداق ہیں۔ یہی وہ حالتِ استثناء ہے جس میں حاکم سے بغاوت کی تحریم ختم ہو جاتی ہے، جب ایسا ہو جائے تو بغاوت واجب ہو جاتی ہے۔

اُن احادیث میں حاکم سے صرف اسی استثناء کی حالت میں بغاوت کرنا اس بات سے واضح ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکام سے لڑائی، جنگ چھیڑنے اور اُن کے اقتدار میں تنازعہ کرنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ ایسی حالت نہ ہو جائے جو مستثنیٰ ہے، اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اس کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ یہ احادیث دلالت کرتی ہیں کہ کفر بواح کی حالت میں اُن سے بغاوت کی جائے، لڑا جائے اور ان کے اقتدار سے تنازعہ کیا جائے۔ یہاں مفہوم کی دلالت اور منطوق کی دلالت متساوی ہیں، لہٰذا شارع کا حکم یہ ہوا کہ کفر بواح کی حالت میں حکام سے محاسبہ کیا جائے، جنگ چھیڑی جائے اور ان کے اقتدار کی مخالفت کی جائے۔

اس حکم کو باعتبار قرینہ دیکھیں تو یہ حکم قطعی ہے کیونکہ اس کا موضوع شریعت میں تاکید سے آیا ہے۔ یہ مندوب یا مستحب نہیں ہے کہ ہماری پسند یا آسائش پر موقوف ہو، بلکہ شارع نے اسے فرض قرار دیا ہے کہ اسلام کے احکام ہی نافذ کئے جائیں، اور کفر بواح کو حرام قرار دیا ہے نہ کہ مکروہ۔ لہٰذا جب حاکم سے کھلا ہوا کفر سرزد ہوا اور اُس سے بغاوت کی جائے تو اس مستثنیٰ حالت میں اس سے بغاوت نہ صرف جائز ہوگی بلکہ فرض ہوگی۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ کفر بواح سے کیا مراد ہے جس کے ظاہر ہونے کی قطعی دلیل ہو کہ وہ کفر ہے۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر اکتفاء نہیں کیا کہ جب کفر بواح ظاہر ہو جائے بلکہ اس کے بعد فرمایا (عند کم من الله فيه برهان) یعنی، جس کے بارے میں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے برہان ہو۔ لفظ برہان کا اطلاق صرف دلیل قطعی ہی پر ہو سکتا ہے، لہٰذا اِس دلیل کا ہونا کہ یہ کفر بواح ہی ہے، بغاوت کیلئے قطعی شرط ہوئی۔ اگر اس میں کہیں شبہ ہو کہ یہ واقعی کفر ہے یا نہیں، یا اس کے کفر ہونے کی دلیل قطعی نہ ہو کر محض ظنی دلیل ہو چاہے وہ صحیح بھی ہو، پھر بھی بغاوت جائز نہیں ہوگی، تاوقیکہ قطعی دلیل ہو کہ یہ واقعی کفر بواح ہی ہے۔

لہٰذا کفر بواح سے مراد وہ کفر ہے جس کے کفر ہونے میں کسی قسم کا شبہ بھی نہ ہو کہ وہ دراصل کفر ہی ہے اور قطعی دلیل ہو کہ یہ کفر ہی ہے۔ اگر حاکم کے کسی حکم میں یہ شبہ ہو کہ یہ کفر ہے یا نہیں تو اس سے بغاوت نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً حاکم حکم دے کہ یونیورسٹی میں علم کلام یا منطق پڑھائی جائے یا کفر کے عقائد پڑھائے جائیں اور آپ اسے پڑھانے کو کفر پڑھانے کے مترادف تصور کریں، تو بھی اس کی اطاعت واجب ہے اور اس کا حکم تسلیم کیا جائیگا۔ اس بنیاد پر اس سے بغاوت نہیں کہ جا سکتی کہ یہ کھلا ہوا کفر ہے کیونکہ حاکم کے پاس دلیل ہے کہ کفر کے عقائد جاننا ضروری ہے کیونکہ قرآن میں اُن کا ذکر ہے اور اللہ ﷻ نے اُن کا ذکر کر کے واضح کر دیا ہے۔

اگر حاکم ایسے کسی عمل کا حکم دیتا ہے تو وہ منجملہ احکام کفر تسلیم نہیں کیا جائیگا جس میں دلیل ہو یا دلیل کا شائبہ ہو کہ یہ عمل یا یہ حکم کفر نہیں ہے؛ یا دلیل ہو، یا دلیل کا شبہ ہو کہ یہ حکم اسلامی ہے، یہ کفر بواح کا اظہار نہیں مانا جائیگا اور ایسی حالت میں اُس استثناء میں داخل نہیں ہوگا، لہٰذا ایسے حکم کے سبب حاکم سے بغاوت جائز نہیں ہوگی بلکہ اس کی اطاعت ہی واجب رہیگی۔

سیاسی جماعتوں کی تشکیل فرض کفایہ ہے

حکام کے محاسبہ پر اللہ تعالیٰ کے حکم کا اطلاق افراد پر بحیثیت انفرادی اور جماعتوں پر باعتبارِ جماعت ہوتا ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جس طرح مسلمانوں کو دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور حکام کے محاسبہ کا حکم دیا، اُسی طرح اُنہیں سیاسی گروہ بنانے کا بھی حکم دیا ہے جن کی حیثیت جماعتوں کی ہو جو دعوت الی الخیر یعنی اسلام کی دعوت کا کام کریں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں اور حکام سے محاسبہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الخَيرِ وَ يَأمُرُونَ بِالمَعْرُوفِ وَ يَنْهَونَ عَنِ المُنْكَرِ﴾

اور تم میں ایک ایسی جماعت ضرور ہونا چاہئے جو خیر کی طرف بلائے اور نیکی کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے،

(ترجمہ معانی قرآن کریم: آل عمران: آیت ۱۰۴)

یعنی مسلمانوں میں ایسا گروہ ہو جس میں جماعت کے اوصاف ہوں اور وہ دو کام انجام دے: پہلا، اسلام کی دعوت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔

جماعتوں کے قیام کی یہ طلب قطعی ہے، کیونکہ جس کام کیلئے اِن جماعتوں کی تشکیل کا حکم ہے وہ مسلمانوں پر فرض ہے جیسا کہ اس آیت اور متعدد احادیث سے ثابت ہے۔ یہ اس بات پر قرینہ ہوا کہ جماعتوں کی تشکیل کا حکم حتمی وقطعی ہے۔ اس طرح یہ کام جو اِن جماعتوں کی تشکیل کا مقصد ہیں وہ بھی فرض ہیں، یہ فرض عین نہیں بلکہ فرض کفایہ ہے، کہ بقدرِ کافی لوگ اس کام میں لگے ہوں تو یہ فرض باقی مسلمانوں سے ساقط ہو جاتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حکم یہ دیا ہے کہ مسلمانوں میں ایسی جماعت ہو جو دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرے، مسلمانوں سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ سب کے سب اس کام کو انجام دیں۔ اس آیت کا موضوع محض اِن دو کاموں کے کرنے کا نہیں بلکہ اس کا موضوع اِن کاموں کیلئے جماعت کی تشکیل دینے کا ہے۔

یہ دونوں مذکورہ افعال اُس جماعت کے اوصاف ہیں جس کا بنایا جانا مقصود ہے۔

اس جماعت کیلئے اپنی ذمہ داری کو ادا کر پانے اور کرتے رہنے کیلئے یہ ناگزیر ہے کہ اس جماعت کی مخصوص نوعیت ہو۔ کسی بھی جماعت کیلئے یہ ضروری ہے کہ اس کے اراکین کے مابین ایک ربط ہو جس سے یہ ایک جسم کے مانند ہو سکے یعنی ایک حزب بن سکے۔ اس رابطہ کے بغیر یہ گروہ مطلوبہ جماعت کی شکل اختیار نہیں کر سکتا، یعنی ایک گروہ نہیں بن سکتا جس میں جماعت کی صفات ہوں۔ وہ چیز جو اس گروہ کو بحیثیت جماعت قائم رکھتی ہے وہ ایک امیر کا وجود ہے جس کی اطاعت واجب ہو کیونکہ شریعت نے ہر جماعت سے جس میں تین یا زیادہ لوگ ہوں ایک امیر مقرر کرنے کا حکم دیا ہے، مسند احمد میں عبداللہ ابن عمروؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((لا يحلّ لِثلاثة نفر يكونون بأرض فلاة إلا أمروا عليهم أحدهم))

یہ جائز نہیں کہ تین لوگ کھلی زمین پر ہوں سوائے اس کے کہ وہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں۔

یہ دو صفات یعنی جماعت کے اراکین کے درمیان رابطہ اور ایک امیر کا وجود جس کی اطاعت لازمی ہو، اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ﴾ (تم میں ایسی جماعت ہو) سے مستدلل ہے۔ یہی وہ جماعت، کتلہ، حزب یا جمعیت یا اور کوئی نام ہو جس کا اطلاق اس جماعت پر ہو سکے، جس میں وہ صفات ہوں جو اسے جماعت کی شکل دیں اور قائم رکھیں۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حکم ایسی جماعات، احزاب، کتلہ یا تنظیمات بنانے کا ہے۔

اِس آیت میں جماعت قائم کرنے کا جو حکم آیا ہے وہ سیاسی جماعتوں کی تشکیل کا ہے، کیونکہ اس میں ان جماعتوں کا جو کام متعین کیا ہے وہ اسلام کی دعوت دینے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام کی نوعیت عمومی بتائی ہے یعنی یہ کام حکام کے ساتھ بھی کیا جائے کہ اُنہیں اچھائی کا حکم دیا جائے اور برائی سے روکا جائے یعنی اُن کا محاسبہ کیا جائے۔ حکام کا محاسبہ ایک سیاسی عمل ہے جسے سیاسی جماعتیں انجام دیتی ہیں، اور یہ سیاسی جماعتوں کے اہم ترین کاموں میں سے ہے۔

لہٰذا یہ آیت اس بات کی دلیل ہوئی کہ سیاسی جماعتیں قائم کی جائیں جو اسلام کی دعوت دیں، اچھائی کا حکم دیں برے کاموں سے روکیں اور حکام کے اعمال اور اُن کے طرزِ عمل کا محاسبہ کریں۔

اس آیت سے یہ دلیل بھی ملتی ہے کہ ایسی جماعتیں یا احزاب اسلامی جماعتیں ہوں جو اسلامی عقیدہ کی بنیاد پر قائم کی جائیں۔ اِن جماعتوں کیلئے اس بات کا جواز نہیں کہ وہ کمیونسٹ، اشتراکی (Socialist)، سرمایہ داری (Capitalist)، قومی (Nationalist)، یا آپسی منفعت کیلئے خفیہ تنظیم (Free mason) ہوں یا وہ جمہوریت (Democracy)، سیکیولرزم (Secularism) کی دعوت دیتی ہوں یا کسی اور غیر اسلامی بنیاد پر قائم ہوں، یا غیر اسلامی احکام اختیار (تبنی) کر رکھے ہوں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مذکورہ آیت میں اِن جماعتوں کے کام اور صفات متعین کر دئے گئے ہیں اور یہ کام اسلام کی دعوت دینا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا ہے۔ ظاہر ہے جو جماعت ان کاموں پر مامور ہو اس کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ اسلامی بنیاد پر ہو اور اسلام کی دعوت دیتی ہو۔ اب جو جماعت، کمیونسٹ، اشتراکی، سرمایہ دار یا قومی ہو یا وہ جمہوریت یا سیکیولرزم کی دعوت دیتی ہو، ناممکن ہے کہ وہ اسلامی بنیاد پر قائم ہوئی ہو اور اسلام کی دعوت دے سکے۔ ایسی جماعت کفر کے عقیدے اور تصورات پر ہی مبنی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا مسلمانوں پر یہ حرام ہے کہ کمیونسٹ، اشتراکی، سرمایہ دار یا قومی جماعتیں بنائیں یا وہ جمہوریت، سیکیولرزم یا آپسی منفعت کیلئے خفیہ تنظیم (Freemason) کی بنیاد پر یا کسی اور غیر اسلامی بنیاد پر جماعت سازی کریں۔

اسی طرح یہ بھی لازمی ہے کہ یہ جماعتیں یا احزاب خفیہ نہ ہوں کیونکہ دعوت الی الخیر، امر بالمعروف، نہی عن المنکر،

حکام کا محاسبہ اور امت کے ذریعہ اقتدار حاصل کرنے کا عمل علی الاعلان اور صریح ہو نہ کہ خفیہ اور ڈھکا چھپا تاکہ اُس سے مطلوبہ مقاصد حاصل ہوں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ اِن جماعتوں کا کام غیر مادّی وسائل سے ہو کیونکہ ان کا کام قول کے ذریعہ اسلام کی دعوت، اچھائی کا حکم اور برائی سے روکنا ہے، لہٰذا یہ لازم ہے کہ اِن جماعتوں کے وسائل پر امن ہوں اور ہتھیاروں کا استعمال نہ ہو اور نہ ہی یہ جماعتیں تشدّد کے طریقے اختیار کریں۔ کیونکہ حاکم کے سامنے ہتھیار اُٹھانا جائز نہیں جیسا کہ احادیث سے واضح ہوا۔ چنانچہ امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور حکام کا محاسبہ ہتھیار اُٹھائے بغیر کیا جانا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ اِن جماعتوں کے وسائل پر امن ہوں اور یہ جائز نہیں کہ اِن میں مادی وسائل استعمال کئے جائیں۔ حکام کے خلاف ہتھیار اُٹھانا سوائے ایک حالت کے حرام ہے اور وہ ایک صورت یہی ہے کہ ایسا کھلا ہوا کفر ظاہر ہو جس کی ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے قطعی دلیل ہو جیسا کہ حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت حدیث میں وارد ہوا، فرمایا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے:

((وَأن لا ننازع الأمر اهله۔ قال: إلا أن تروا كفراً بواحاً عندكم من الله فيه برهان))

اور اولی الامر (خلیفہ) سے جدال نہ کرو جب تک کہ تم (اُن کے عمل میں) کھلا ہوا کفر نا دیکھو جس کے بارے میں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے کوئی دلیل ہو۔

اسلام کے نفاذ کی ضمانت

اسلام کے نفاذ، اس کی دعوت کا پہنچانا، اسلام کے نفاذ میں تسلسل اور ان سب چیزوں میں احسان یعنی، بدرجہ اَتم (Excellent/Perfect) ہونے کی ضمانت، حاکم میں اعلیٰ تقوے کا ہونا ہے۔ اس لئے کہ اسی تقوے کے ہونے سے حاکم اسلام کو اپنی جان سے زیادہ عزیز اور اپنی حاجات وضروریات سے اعلیٰ اور مقدم رکھتا ہے۔ اسی تقوے کے سبب حاکم میں وہ ادراک واحساس پیدا ہوتا ہے جس سے وہ ہر عمل کے انجام دینے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو پیش نظر رکھتا ہے اور اپنے ہر طرزِ عمل اور تصرفات کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ اگر حاکم میں تقویٰ نہ رہے تو اسلام کے نفاذ کی یہ قدرتی ضمانت بھی باقی نہیں رہتی اور نہ ہی اسلام کے نفاذ میں احسان باقی رہتا ہے، پھر اسلام کا نفاذ تسلسل سے نہیں ہو پاتا اور نہ ہی اس کی دعوت پہنچائی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اس بات کا امکان ہے کہ حاکم میں تقویٰ کا فقدان ہو، لہٰذا یہ ناگزیر ہوگا کہ ایسے کارگر مادی وسائل موجود ہوں جن سے یا تو حاکم کو اسلام نافذ کرنے پر مجبور کیا جاسکے یا اُسے برطرف کیا جاسکے اور اُس کی جگہ نئے حاکم کا تقرر کیا سکے جو اسلام کے احکام نافذ کرے اور اسلام کی دعوت کو پھیلائے۔ یہ عملی وسیلہ دراصل امت ہی ہوتی ہے۔ اس لئے امتِ مسلمہ پر یہ واجب ہے کہ جب وہ حاکم کو اللہ کی حرمت وتقدس کو پامال کرتا دیکھے، سنتِ رسول ﷺ کی مخالفت کا مرتکب پائے، اللہ کے بندوں سے گناہ اور دشمنی کا سلوک کرتا ہو، تو ایسی صورتِ حال میں امت اپنے قول اور فعل سے حاکم کی اصلاح کی کوشش کرے یا پھر حاکم کو ہی بدل دے۔ امت کو ایسا کر پانے کیلئے یہ ناگزیر ہے کہ

خود امت میں تقوے کی صفات ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ ہی اُسے اسلام سے رغبت اور اُس کے نفاذ کی طرف راغب کرتا ہے۔ یہ چیز امت کو حاکم کے طرزِ عمل پر اُس کے محاسبہ کیلئے مجبور کرتی ہے، اور امت پھر جب حاکم میں کوئی کوتاہی یا تقصیر دیکھتی ہے یا احکامِ اسلام سے انحراف یا اُن کے نفاذ میں غلطیاں پاتی ہے تو اُس سے مباحثہ ومحاسبہ کرتی ہے اور اس طرح اسلام کی تنفیذ بھی علیٰ وجہ الاحسان قائم رہتی ہے۔

حالانکہ امتِ مسلمہ دنیا میں اسلام کے نفاذ کو قائم رکھنے کا عملی وسیلہ ہے، لیکن بہرحال اُس میں ایسی صحیح اور مناسب جماعتوں کی ضرورت ہے جو اسلام کی بنیاد پر قائم ہوں، اِن جماعتوں میں اللہ تعالیٰ کی گہری فکر وفہم ہو اور اُس سے شدید خوف ہو، کیونکہ وہ ایک ہی بنیاد پر قائم ہیں اور وہ بنیاد اسلامی عقیدہ ہے اور یہ جماعتیں لوگوں کی مستحکم اسلامی تربیت کرتی ہیں جو عقل کو وسیع اور ادراک وشعور کو مستحکم کرتی ہیں نفس کو پاکیزہ بناتی ہیں اور جذبات کو فکر سے جوڑتی ہیں جس سے انسان کے افکار اور رجحانات میں ہم آہنگی کی نشوونما ہوتی ہے۔ اسی سے ایک مسلمان میں مطلوبہ اسلامی شخصیت پنپتی ہے۔ جب ایک بار ایسی جماعت تشکیل ہو جائے تو پھر یہ امتِ مسلمہ کو صحیح نہج پر ڈھالنے کا وسیلہ بن جائیگی، کیونکہ یہ افکار کو خالص بناتی ہے اور امت کو ایک فکر میں ڈھالتی ہے جو اپنے مقرر کردہ مقصد کی جانب رواں کرتا ہے، یعنی اسلام کی طرف، جس کیلئے امت زندہ ہے اور جس کی یہ دعوت دیتی ہے، پھر یہ امت ہمیشہ اپنے مبداء کے تئیں باشعور اور چوکس رہیگی۔ جو چیز امت کو چوکس اور باشعور رکھتی ہے وہ یہ جماعت ہی ہے جس کا وجود اپنے مبداء کی خاطر اور اس مبداء کی دعوت اور اس کے مسلسل نفاذ ہی کی خاطر ہے۔

یہی وہ ڈھانچہ ہے جو ایک مبداء پر مبنی جماعت ہے جو امت میں سے ابھری ہے۔ بالفاظ دیگر، یہی وہ جماعت ہے جو اپنی فکری قیادت کے اعتبار سے اسلامی عقیدہ پر مبنی ہے، اور اسی عقیدہ کو یہ جماعت امت میں عام کرتی ہے تاکہ امت کا اسلامی شعور جاگے، اور یہی مبداء یہ جماعت لے کر اُٹھتی ہے تاکہ لوگ اس عقیدۂ اسلام کے پیروکار بن جائیں۔ لہٰذا یہ جماعت دعوت کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں کرتی، کیونکہ دیگر کام ریاستِ اسلامی کے ذمہ ہوتے ہیں نہ کہ ایسی جماعت کے ذمہ۔

جب ایک بار ایسی جماعت یا حزب وجود میں آجائے اور امت کی قیادت کرے تو وہ ریاست پر نگراں کا مقام حاصل کر لیتی ہے کیونکہ ریاست ہی امت یا امت کی نمائندہ ہوتی ہے اور یہی حزب پھر امت کی قیادت کرتی ہے تاکہ امت اپنے فرائض یعنی ریاست اور حاکم سے مباحثہ اور اُس کا محاسبہ کر سکے، اور اسے اپنے قول وعمل سے بدل سکے اور اگر وہ اسلام سے انحراف کرے تو ایسے حاکم کو ہی تبدیل کر دے۔

امت کیلئے بغیر ایسی جماعت کے، جو اس کی قیادت کرتی ہو، ریاست سے مباحثہ اور اُس کا محاسبہ کرنا بہت دشوار ہوگا، امت اِن دشواریوں پر اُس وقت تک غلبہ نہیں پا سکتی جب تک کہ اس میں ایک ایسی قیادت کا وجود نہ ہو جو ایک جماعت کی شکل میں ہو، نہ کہ محض ایک فرد کی یا کچھ افراد کی قیادت میں۔ اس طرح امت میں ایک سیاسی اور نظریاتی جماعت اور حزب کا وجود

لازمی ہوتا ہے جو اسلام کی دعوت پیش کرے جو واحد سیاسی طریقہ ہے۔ لہٰذا ایسے حزب اور ایسی جماعت کا وجود ناگزیر ہے کیونکہ یہی ایک عملی وسیلہ ہے جو امت کی قیادت کرتا ہے اور اس قیادت سے ریاست کی بہتر کارکردگی کی ضمانت ملتی ہے، اسلام کی تنفیذ ہوتی ہے اور اسلام کا نفاذ متواتر ہوتا رہتا ہے۔

مسلمانوں کی اس طرح جماعت سازی جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی وہ دارِ ارقم میں نمایاں تھی جس میں تمام صحابہ کرامؓ شامل رہے۔ یہ وہ جماعت تھی جو مسلمانوں میں اُبھری اور پھر عملی طور پر اسلام کی دعوت لے کر اُٹھی حالانکہ اسلام کی ذمہ داری عمومی طور سے تمام مسلمانوں پر تھی۔ روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساٹھ ہزار صحابہ کرامؓ اپنے پیچھے چھوڑے۔ یہی وہ جماعت تھی جس نے اسلام کی ذمہ داری عملی طور پر سنبھالی تھی، ورنہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات کے وقت مسلمانوں کی تعداد ساٹھ ہزار سے کئی گنہ زیادہ تھی۔ پھر جب صحابہ کرامؓ تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ علیہم کا دور ختم ہوا تو یہ حزب یا جماعت بھی ختم ہوگئی۔ اب حکام میں ضعف پھیلتا چلا گیا کیونکہ اب کوئی ایسی جماعت نہیں رہ گئی تھی جو امت کی حکام پر نظر رکھنے میں، اُن سے مباحثہ اور محاسبہ میں قیادت کرتی۔ اس وجہ سے اسلام کے نفاذ میں غلطیاں سرزد ہونے لگیں۔ لہٰذا اب اسلام کے نفاذ، دعوت اسلام کی تبلیغ اور اسلام کے اس نفاذ میں احسان (Excellence/Perfection) کی ضمانت ایک سیاسی اسلامی حزب کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔

بحمد اللہ تعالیٰ

خلافت: اسلام کا نظامِ حکومت

